

سرگرمیوں کی دنیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کلاسیک

پاکستان

دانش گاہ

April

2015

دانش گاہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ نامور مصنفہ رفعت سراج کا نیا شاہکار ناول "دوام دل" اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

اس کے علاوہ مرغ چوہدری، شمع حفیظ، ام مریم، عقیلہ حق، فوزیہ احسان رانا و دیگر مصنفات کی جگہ جگہ تحریریں



- 07 اپنا احتساب آپ کاشی چوہان
08 زادراہ منورہ نوری خلیق
11 محفل رضوانہ پرنس

باتیں ملاقاتیں

- 26 بہار بہار... آراے
30 شہزاد شیخ سے ذیشان فراز
33 منی اسکرین ممشخ

ناول

- 35 دام دل رفعت سراج
210 تیرے عشق نچایا مینا عالیہ

مکمل ناول

- 74 رحمن، رحیم، سید اسائیں ام مریم
166 لا ابالی حبیبہ طارق

ناولٹ

- 134 لمحوں نے خطا کی تھی فوزیہ احسان رانا
106 بیس ہاری شمع حفیظ



پارل بیلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دو شیراز اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر پلا رانا، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی ہمارے جو کی کا حق رکھتا ہے۔

افسانے

- 96 مہکواپنے آنگن میں نادیہ جہانگیر خان
128 بند ہونٹوں کی دعا شاہانہ احمد
158 وقت کے اس کھیل میں آصفہ ضیاء احمد

انتخاب خاص

- 227 گز بھر کا کفن شکیلہ اختر

رنگ کائنات

- 243 ہٹ لسٹ ظفر عمر زبیری

دوشیزہ میگزین

- 234 دوشیزہ گلستاں اسماء اعوان
338 نئے لہجے، نئی آوازیں قارئین
240 یہ ہوئی تاباں زین العابدین
246 لولی وڈ، بولی وڈ ڈی خان
250 نفسیاتی اُلجھنیں مختار بانو طاہرہ
252 کچن کارنر نادیہ طارق
255 حکیم جی! محمد رضوان حکیم
257 بیوٹی گائیڈ ڈاکٹر خرم مشیر



افسانے

- ایک پل کی سوچ رخ چوہدری 54
لکیر عقیدہ حق 67

زیر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ).....890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ.....5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا.....6000 روپے

پبلشر: منورہ سہام نے نئی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی 7-OB، تالپور روڈ، کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com



اپنا احتساب آپ!

بے درد لہجوں میں، آنکھ سے آنکھ بھائی نہ دے۔ درد سے
 درد رہائی نہ دے، کالے تار کول سے چمکتی ناگن کی طرح بل کھاتی
 سڑکیں سراب دکھائیں۔ اُس سے سوچیے! اندھیرے کی سیاہ
 چادر کتنی سفاک ہوتی ہے۔ ہر شے کو اپنی عفریت میں لے لیتی
 ہے۔ جس طرح ہر بھیا نک منظر کے بعد، ایک بہت روشن، بہت
 خوشگوار نظارہ سامنے آ جاتا ہے، اسی طرح ہر بحران کے بعد
 خوشحالی اور ترقی کے امکانات بھی بہت روشن ہو جاتے ہیں۔ ہمارا
 ملک ایک زرعی ملک ہے اور ہم خوش نصیب ہیں کہ خدا کی قدرت
 ہماری دھرتی ماں کی کوکھ سے آج بھی خزانے اُگل رہی ہے۔
 ساتھیو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ہمیں اپنی اپنی جگہ،
 اپنا احتساب کرتے ہوئے، وطن عزیز کی سالمیت پر حرف نہیں
 آنے دینا ہے۔ ہمیں موجودہ حالات میں بھی وطن کے مستقبل کو
 روشن رکھنا ہی نہیں، دیکھنا بھی ہے۔ ہمارا آنے والا کل، انشاء اللہ
 بہت روشن ہوگا۔
 کاشی چوہان

ایک زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ بذمہ دہی اپنے نبی ﷺ کو ایسے لوگوں کے لیے مطلع فرمادیا کرتا تھا کہ فلاں منافق ہے فلاں مرتد اور فلاں متذیب۔ اس وقت بھی ماننے والے موجود تھے جو اسلام کے برحق ہونے کو تسلیم کر کے اسے ثابت کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے تھے اس وقت بھی.....

زندگی کو آسان با عمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

اللہ تعالیٰ نے نیکی کی توفیق سب کر لی ہے کہ برائی کو برائی جان لینے کے بعد بھی ہم اس سے بچ نہیں سکتے؟ غور کیا جائے تو ہر عمل کے کچھ نہ کچھ نتائج ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا اجر دنیا میں بھی اور دین میں بھی ضرور ملتا ہے اور ان کا نتیجہ انسان زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی ضرور دیکھتا ہے جزا بھی اور سزا بھی پاتا ہے جس کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں جن پر ہم غور نہیں کرتے۔ عمل کے لازمی نتیجہ میں مزید عمل کا راستہ کھل جاتا ہے اور ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا عمل جاری ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی لازمی ہے کہ عمل کا بدل عمل کے ساتھ ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ ہر عمل دوسرے عمل کو کھینچ کر لاتا ہے اور خیر کے امر پر خیر اور شر کے عمل پر شر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں ہر عمل کی جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اسی طرح سے ہر برائی کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ خیر کی سب سے بڑی جزا یہ ہے کہ خیر شروع ہو

ہم لوگ اسلام کو برحق سمجھتے ہیں اسے دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں اس کا رجا بھی کرتے ہیں اور اعلان بھی لیکن کسی بھی قسم کی عملی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہم اپنے مفاد کی قربانی نہیں دے سکتے۔ برائی کو ترک کر دینے یا اپنے نفس کو برائی سے روکنے کی قربانی نہیں دے سکتے۔ دین کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھا سکتے۔ ہم اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اسلام نے جن جن برائیوں سے روکا ہے انہیں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ گویا کہ آج کے دور میں تیسری قسم کے لوگوں میں سب سے زیادہ مسلمان شامل ہیں جن کا دین کچھ اور ہے اور طور طریق کچھ اور۔ جدھر سے فائدہ کی توقع ہو ادھر ہی جھک جاتے ہیں اور خود کو دونوں طرف کے خطرات سے بچا لیتے ہیں اور ہم کبھی بھی یہ غور نہیں کرتے کہ زندگی گزارنے کا یہ انداز سب سے بڑا فساد ہے سب سے بڑی خرابی ہے جس میں نقصان دوسروں سے زیادہ ہمارا اپنا ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ دانش مندی ہے۔ منافقت ہے یا

(البقرہ۔ ۵)

دوسری قسم کے لوگ نہ ماننے والے ہیں جو نہیں مانتے انکار کرتے ہیں اور کھلم کھلا انکار کرتے ہیں اور قول و عمل سے خود کو مخالف ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں جو بھی کرنا پڑتا ہے وہ کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اور خوزیز جنگیں اسی بات پر ہوتی ہیں کہ ہم نہیں مانتے ہم تسلیم نہیں کرتے جو کرنا ہے کر لو۔ دین کے خلاف انہوں نے ہر حربہ استعمال کیا اور خود کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں بڑے بڑے نام ہیں۔ قرآن پاک نے ان ہی کو منکرین قرار دیا ہے۔

یہی کافی ہیں جو اپنے کفر میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کو ہدایت دینا اور نہ دینا برابر ہوتا ہے۔ ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔“ (البقرہ۔ ۷)

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ کی ذات اقدس تک دشمنان حق ان ہی لوگوں میں سے ہوئے ہیں ان کے خیالات نظریات ارادے فیصلے عمل اور اعمال کے نتائج سب حق کو جھٹلانے والے رہے ہیں اور تمام زندگی حق کو جھٹلانے اور انکار کرنے میں گزر جاتی ہے اور آخرت کو بھول کر وہ اپنی زندگی کا مقصد اسی کو بنائے رکھتے ہیں۔

تیسری قسم بین بین رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ انہیں منافق بھی کہا جاتا ہے اور سازشی بھی۔ دنیا بھر کی تمام سازشیں چالاکیاں دھوکے اور فریب ان ہی کی بدولت عمل میں آتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ان کی خصوصیات ایک ہی رہی ہیں۔ نبی ﷺ کے زمانہ مبارک سے اب تک ان کی صفات وہی ہیں کہ یہ لوگ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں شامل رہنا چاہتے ہیں تاکہ دونوں طرف سے فیض پا سکیں۔ ان ہی کے لیے ارشاد ہوا۔

جاتا ہے اور برائی کی دنیاوی سزا یہی ہے کہ برائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور شاید یہ بدترین سزا ہے کہ برائی کرتے کرتے نیکی کرنے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور اس کے بعد انسان برائی کو پورے شعور اور عقل کے ساتھ محسوس کر کے بھی اسے چھوڑ نہیں پاتا مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ بھلائی اور خیر کے کام کر رہا ہے۔

ہر دور میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ماننے والے نہ ماننے والے اور بین بین یا منافق۔ ایمان کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی۔ یہ تینوں قسمیں ہر دور میں اور ہر قوم میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی صفات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ماننے والے وہ ہیں جو دل و جان سے مانتے ہیں یقین کرتے ہیں اور ثبوت دینے میں سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔ یقین اور ایمان کے ساتھ ظاہری فرماں برداری ان کا شعار ہوتی ہے۔ ان کا ایمان قلب سے شروع ہو کر تمام ظاہری اعمال تک پختہ اور پائیدار ہوتا ہے جو انہیں ناقابلِ تسخیر بنا دیتا ہے۔ ان کے نظریات خیالات ارادے فیصلے اور عمل سب ان کی فکر کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیاں اطاعتِ الہی میں گزرتی ہیں۔ دنیا کے تمام تعمیری کام اور خیر کے امور ایسے ہی لوگوں سے انجام پاتے ہیں۔ تمام انبیاء کے ساتھی ان ہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے لمحہ لمحہ ساتھ دیا اور جنہیں اہل ایمان کہا گیا ہے۔

”جو غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہی لوگ اپنی رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں۔“

”وہ دھوکا دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو جبکہ اصل میں وہ دھوکہ دیتے ہیں اپنے آپ کو مگر سمجھتے نہیں۔ ان کے دلوں میں مرض ہے، سو اللہ نے اس کو بڑھا دیا ہے۔“

یہ لوگ دین کے معاملے میں جھوٹ بولتے ہیں اور دین میں داخل ہو کر دین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں قسم کے لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں کیونکہ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں قسم کے لوگ صاف پہچانے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو پہچانا نہیں جاسکتا بلکہ شاید یہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتے جیسے کہ آج ہم خود کو نہیں پہچان پارہے کہ ہم کیا ہیں؟ مانتے بھی ہیں اور نہیں بھی مانتے۔ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ خرابی سے روکتے بھی ہیں اور خرابی کا سبب بھی ہیں۔

فرمایا۔ ”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں مگر سن رکھو بے شک وہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتے۔“ (سورۃ البقرہ۔ ۱۱)

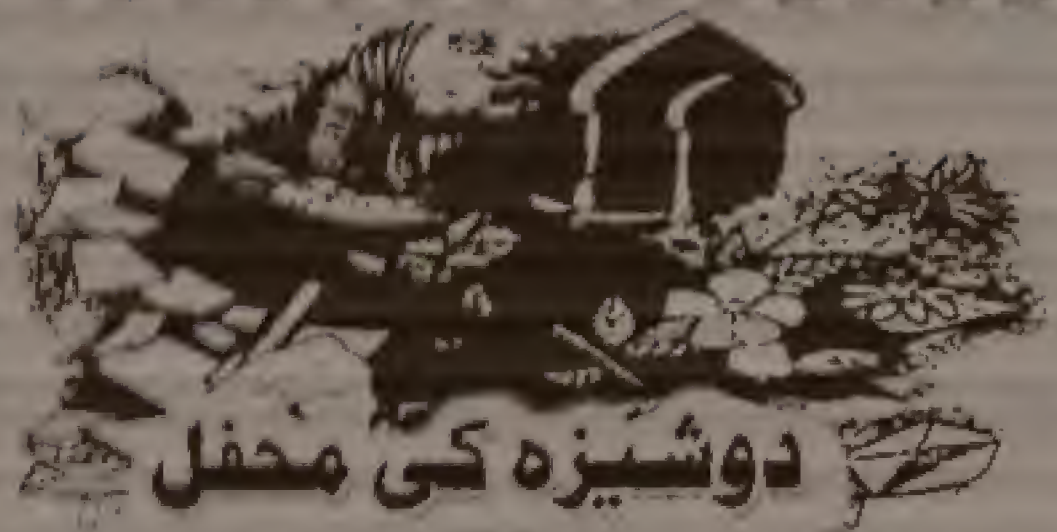
اسی کیفیت کو قرآن پاک نے دلوں پر مہر لگانے اور کان اور آنکھوں پر پردہ ڈال دینے سے تشبیہ دی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اپنے نبی ﷺ کو اپنے لوگوں کے لیے مطلع فرما دیا کرتا تھا کہ فلاں منافق ہے، فلاں مرتد اور فلاں متذبذب۔ اس وقت بھی ماننے والے موجود تھے جو اسلام کے برحق ہونے کو تسلیم کر کے اسے ثابت کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے تھے۔ اس وقت بھی نہ ماننے والے موجود تھے جو کھل کر مسلمانوں کے سامنے آ جاتے تھے اور اس وقت بھی منافقین تھے جن کی یہی صفات تھیں کہ اسلام سے بھی رابطہ رکھتے اور

منافقین سے بھی۔ جب جدھر فائدہ دیکھا، ادھر جھک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے انہیں اپنے نبی ﷺ پر عیاں کر دیا کیونکہ ان سب کی پہچان بتا دینی مقصود تھی اور علامتیں بھی واضح کرنی تھیں تو پھر ہر فرد جان سکتا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں منافقوں میں یہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ وہ دوستوں اور دشمنوں میں دونوں جگہ مقام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھے تو ان کی پالیسی کا دعویٰ کرنے لگے اور دشمنوں میں بیٹھے تو ان سے رفاقت بڑھالی۔ ایسے لوگ خود کو بہت صاحب عقل اور مدبر سمجھتے ہیں لیکن اپنی تمام تر تدبیروں سے خود ان ہی کو واسطہ پڑتا ہے اور ان کے اعمال کا نقصان ان ہی کو ہوتا ہے۔

”جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطان کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو محض مذاق کرتے ہیں حالانکہ اللہ ہی ان سے مذاق کرتا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں بڑھا دیتا ہے۔ وہ اندھے ہو رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی مول لی اور ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے تھے۔“ (البقرہ۔ ۱۶)

یہ تینوں قسم کے لوگ آج بھی ہیں مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دور میں ہم خود ہی تیسری قسم کے لوگوں میں شامل ہیں اور ایمان کا دعویٰ کر کے فساد پھیلانے والوں میں سے ہوں اور وہ ہم ہی ہیں جن کے اعمال کی بدولت ان سے نیکی کی توفیق سلب کر لی گئی ہو کہ ہم برائی کو برائی سمجھ کر بھی چھوڑ نہیں پارہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں اپنا ٹھکانہ خود سوچ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو منافقت اور کفر سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

☆☆.....☆☆



دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ 'خوب صورت' رابطوں کی دلفریب محفل

معاہدہ دوشیزہ ڈائجسٹ - II-C-88 - خیابان جامی ایٹس ہاؤسنگ انٹارلی - فیز-7، کراچی

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو!

آپ سب کو رضوانہ رنس کا سلام قبول ہو۔ کہے کیسی گزر رہی ہے زندگی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس پر آشوب زمانے میں سہولت سے زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں لیکن دوستو آپ کے خیالات اور سوچ کا مکمل زندگی سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے آپ اپنے آنے والے دنوں کے لیے جتنا اچھا سوچیں گے اللہ آپ کی جھولی میں ویسے ہی خوبصورت دن ڈالے گا۔ نیشنل سوچ ایک ایسا اندھیرا ہولی ہے جو آہستہ آہستہ آپ کی ساری خوشیوں پر سیاہی بن کر چھا جاتی ہے پوزیٹو سوچ کی جگہ گالی روشنی کو اپنے دل میں اتار کر دیکھیے زندگی خود بخود پیاری لگنے لگے گی تو آئیے چلتے ہیں اپنے ان خوبصورت مہمانوں کی جانب جو محفل میں کب سے آئے بیٹھے ہیں۔

آج کی ہماری پہلی مہمان ہماری بہت پیاری رائیٹر عیدہ محمد بیگ ہیں جو سیالکوٹ سے تشریف لا رہی ہیں پیاری رضوانہ اس بار دوشیزہ ملا آپ کا نام پڑھ کر بے اختیار آپ سے بات کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کو دل

برائے قانونی مشاورت

جی ایم بھٹولا، ایسوسی ایٹس

ایڈووکیٹ اینڈ اٹارنیز

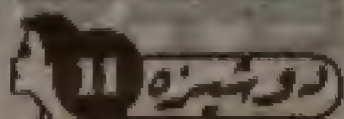
دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی رعایت

اپنی پریشانی ہمیں دیجیے اور خود پرسکون رہیے۔

اوقات کار: 3:00 تا 7:00 بجے تک رابطہ کیا جاسکتا ہے

برائے رابطہ: 021-35893121-35893122

Cell: 0321-9233256



چاہا گو کہ آج کل چمیلز پر لگتے میں کافی بڑی ہوں لیکن پھر بھی دو شیزہ سے رابطہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

بھو: ڈیر عقیقہ! آپ نے ہمیں سیالکوٹ سے یاد کر کے ہمارا مان بڑھا دیا کہ آپ ہمیں بھولی نہیں آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ اور ہاں اپنا وعدہ یاد رکھیے گا ارے وہی افسانہ بھیجئے والا۔

✉: احمد سجاد بابر لودھراں سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، پاکستان کی تعمیر و ترقی، اس کے اجالوں کے لئے دعا کے ساتھ بات آگے بڑھانا چاہوں گا، مارچ کے شمارے میں معادیہ عنبر کی ایک نظم لگی ہے، مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ ایک پرانی اور مشہور نظم میں صرف الفاظ کی جگہ تبدیل کر کے بنائی گئی ہے، پہلے آپ اصل نظم دیکھئے

فاختہ	بھی	پاگل	تھی
موسموں	کی	سازش	سے
پھر	فریب	کھا	بیٹھی
توب	کے	دہانے	پہنچی
گھونسلہ	بنا		بیٹھی!!

یہ کوئی گناہ نظم نہیں بلکہ ہر بڑے شاعر، لکھاری، دانشور کو اس کا پتہ ہے، یہ نظم ایک دور میں اتنی مشہور ہوئی کہ سہ فرماز شاہ نے اس کی پیروڈی "فاخرہ تو پاگل تھی" بھی لکھی، معادیہ عنبر نے الفاظ کے ادل بدل سے یہ نظم اپنے نام رل، اب آپ معادیہ کی نظم دیکھئے!!

وہ	فاختہ	بھی
ناداں	پاگل	تھی
موسم	سازش	باتوں میں
فریب	کھا	بیٹھی
شکاری	کی	گزر
گھونسلہ	اپنا	بنا
		بیٹھی!!

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ نظم کا تحسین، کلائمکس، اختتام، الفاظ سب وہی ہیں، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہا چاہتا۔ اب ذرا پرچے کی بات ہو جائے، صدف آصف کے کی تحریر "کیٹ وے آف لو" کو پہلے نمبر پر نہ رکھنا یقیناً زیادتی ہوگی، یہ وہ تحریر رہی کی جس نے جکڑ کر رکھا، کسی بھی جگہ پر تشنگی محسوس نہیں ہوئی، اختتام بہت اچھا رہا، تمام واقعات کو مربوط رکھا گیا، تفصیلات میں جزئیات تک پر دھیان دیا گیا، جس کی وجہ سے ایک اعلیٰ پائے کا ناولٹ وجود میں آیا، چاشنی کی وجہ سے تحریر نے کسی بھی موقع پر قاری کو دامن چھڑانے نہ دیا، اور جو انجام دکھایا وہ بھی اچھا اور فطری لگا۔ مکالمے عمدہ رہے۔ صدف آصف کو بہت بہت مبارک..... "مٹی کی قسمت" میں دلشاد نسیم نے منفرد لفاظی کے ذریعے جاگیردارانہ نظام میں پھنسی عورت کے مقدر کو گھورانہ حیروں میں پھنسا دکھایا کہ آج بھی کچھ نہیں بدلا، وہی صید اور وہی صیاد کا گورکھ دھندا یعنی "رندے بھی وہی ہوں گے، شکاری جال بدلے گا" "بے نام مسافرتیں" کو زہت جہیں نے عمدہ پیرائے میں پیش کیا، پرکشش انداز تحریر ہے ان کا، اچھا لگا یہ افسانہ۔ ایک اور تحریر جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ "صفائی کی مہک" تھی جس میں تحسین انجم نے ایک ایسا تحسین بیان کیا جو نیا اور کم یاب لگا، ایک مختلف موضوع پر لکھی تحریر، اور انداز بیان غضب کا پر

رسول افشاں رضا پہلی بار اسلام آباد سے ہماری محفل میں آئی ہیں۔ پیاری رضوانہ باجی دوشیزہ ڈائجسٹ میں اکثر پڑھتی ہوں لیکن اس ماہ سے میں اس کی سالانہ خریدار بھی بن گئی ہوں اور سچ جانے جب پوسٹ مین نے مجھے گھر پر دوشیزہ لا کر دیا تو اس کی خوشی اور مزہ کچھ اور ہی تھا پہلی بار آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں اس لیے کچھ زوریں سی ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ تفصیلی خط کے ساتھ آؤں گی ویسے اس ماہ کا دوشیزہ دل کو چھو گیا شاید

ہم نے سوچا کہ رائٹرز کے ساتھ تو گیٹ ٹو گیدر ہوتے ہی رہتے ہیں، کیوں نہ بہار کے اس خوبصورت موسم میں اس بار اپنے دو شیزہ پڑھنے والے قارئین کے ساتھ ایک شام منائی جائے کہ دو شیزہ کی یہ جگمگاہٹ آپ سب پڑھنے والوں کے دم سے ہی تو ہے سو محبتوں اور رابطوں کے اس بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے ہم نے اگلے ماہ ”ایک تقریب ملاقات“ کا اہتمام کیا ہے، جس میں ہم اپنے قارئین کے ساتھ چائے پر کچھ لمحات کو یادگار بنائیں گے اور پھر اس تقریب خاص کی تصویری جھلکیاں اگلے ماہ کے شمارے میں شائع کی جائیں گی تو قارئین اس تقریب ملاقات میں شرکت کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل ٹوکن پر کر کے ہمیں آج ہی پوسٹ کر دیں۔ دیر سے ملنے والے کو پن تقریب کے دعوت نامے میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔

f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

یہ ہی ایک جملے میں اس کی مکمل تعریف ہے۔

بھ: بہت پیار افشاں تم اسلام آباد جیسے خوبصورت شہر سے آئی ہو تو ہماری مہمان خاص بھی تو ہوئی نا لیکن اب دوشیزہ کے لیے تمہارا قلم رکنا نہیں چاہیے کہ اب تو دوشیزہ ہر ماہ چل کر خود تمہارے گھر آئے گی۔

✉: گلستان جوہر کراچی سے ریحانہ مجاہد ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئی ہیں۔ ڈیر رضوانہ پرنس السلام و علیکم دو شیزہ ملا پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا ٹائل سے لے کر آخری صفحات تک لا جواب۔ افسانوں کا انتخاب بھی بہت اچھا رہا خاص طور پر آپ کے افسانے نے تو دل چھولیا اسی طرح اگلے شمارے کا بھی انتظار رہے گا۔

بھ: اچھی ریحانہ لگتا ہے اس بار تم جلدی میں آئی ہو تبصرہ بھی ادھورہ ادھورہ سا ہے کبھی اس خوبصورت محفل میں اطمینان سے آ کر بیٹھو گھر کے سارے کام نمٹا کر۔ ٹھیک ہے نا۔

✉: کراچی سے ندیا مسعود اپنے تبصرے کے ساتھ ہماری محفل کی مہمان بنی ہیں۔ ڈیر رضوانہ ڈاکیے نے جب دوشیزہ لا کر ہاتھوں میں تھمایا تو سب سے پہلے ٹائل نے ہی دل خوش کر دیا سارے ہی افسانے اچھے تھے صفائی کی مہک اور ایسی یہ تنہائی نے دل کو چھولیا تمہارا افسانہ ”اک ستم“ اور میں رشتوں کی کڑواہٹ سب ہی نے محسوس کی ہوگی دوشیزہ گلستاں میں سب ہی کچھ اچھا تھا خاص طور پر لطیفے بہت پسند آئے اتنا پیارا رسالہ نکالنے پر تم سب لوگوں کو دعائیں اور مبارک باد۔

بھ: پیاری ندیا خوش رہو! اور ایسے ہی ہماری دوشیزہ کے لیے تبصرے بھیجتی رہو۔

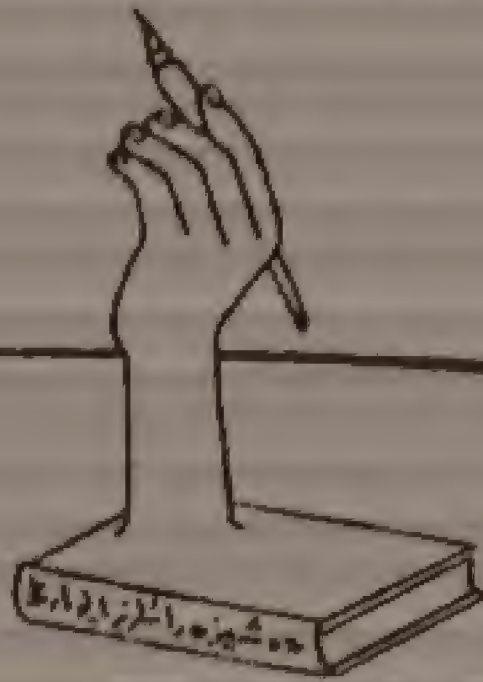
✉: انزاء نقوی آج پہلی بار کراچی سے ہماری محفل میں آئی ہیں۔ ڈیر رضوانہ آپنی السلام و علیکم سب سے پہلے آپ کو بہت بہت مبارک ہو ماہنامہ دوشیزہ کا ایڈیٹر بننے پر۔ میں نے آپ کا افسانہ ایک ستم اور پڑھا جیسے جیسے میں پڑھتی جا رہی تھی ویسے ویسے میرا Suspanceل بڑھتا جا رہا تھا بہت زبردست End لکھا ہے As a Wraiter آپ میں وہ کوالٹیز ہیں جو ایک لکھنے والے میں ہونی چاہیے اور میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ نئے لہجے نئی آوازیں میں میری غزل ”کاش حقدار کو اس کا حق دلا دیں ہم لوگ“ کے ذریعے میرا نام بھی دوشیزہ کے صفحات پر آ گیا غزل شائع کرنے کا بہت شکریہ اب میں بھی دوشیزہ کی مکمل قاری بن گئی ہوں میری جانب سے دوشیزہ کے تمام اسٹاف مینیمنٹ کو دعائیں اور سلام۔

بھ: پیاری سی انزاء تمہاری محبت اور پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ اور انشاء اللہ تمہارا نام دوشیزہ کے صفحات میں جگمگاتا رہے گا۔ کیوں کہ ہم باصلاحیت لوگوں کی قدر کرنا جانتے ہیں ایسی ہی پیاری غزلیں بھیجتی رہنا۔

✉: ہماری صہجی کاظمی کراچی سے لگتا ہے بڑی جلدی میں آئی ہیں۔ ہیلو کیسے ہیں آپ سب دوشیزہ کے جاننے والوں کو ہمارا سلام اللہ دوشیزہ کی جگمگاہٹ کو ہمیشہ جگمگاتا رہے دوشیزہ کا نکھار اور بڑھتا جائے رضوانہ پرنس کی دوشیزہ میں آمد دیکھ کر ہمارا خواب غفلت میں سویا ہوا ذہن اور قلم جاگ اٹھا ہم کوشش کریں گے دوشیزہ سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھیں۔

بھ: صہجی جی کبھی اطمینان سے اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ بھی تو آئیے نا۔

✉: فریدہ فری یوسف زئی لاہور سے ہماری محفل میں رونق بکھیرنے آئی ہیں۔ پیاری رضوانہ پرنس جی السلام و علیکم، مارچ کا دوشیزہ ملا مگر بہت ہی دیر سے۔ ٹائل بہت ہی دلکش تھا اور ساتھ ہی ہم



دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

مارچ 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

”گیٹ وے آف لو“ صدف آصف

آپ کی نظر میں اس ماہ ”دوشیزہ“ کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

اپریل 2015

دوشیزہ

عنوان: _____
قلم کار: _____
نام: _____
پتا: _____

دوشیزہ



دوشیزہ 2015

حیران بھی ہوئے کہ اتنے پیار سے ہمیں جواب کس نے دیا ہے اور پھر نام پڑھ کر حیران رہ گئے یہ تو ہماری پیاری رضوانہ پرنس ہیں دل خوش ہو گیا۔ اک ستم اور رضوانہ جی کا ناولٹ پڑھ کر دل بے حد خوش ہوا پڑھ کر مزہ آ گیا خوش رہو۔ مکمل ناول رحمن رحیم سدا سائیں ام مریم کا سلسلے وار ناول بے حد شاندار جا رہا ہے افسانوں میں کیسی تنہائی رو بینہ شاہین کا اور صفائی کی مہک بہترین تحریریں تھیں آنگن میں بارات پڑھ کر اچھا لگا حکیم جی کا سلسلہ بے حد اچھا ہے آج کل ہم بہت ہی بیمار ہیں بس آپ سب کی دعائیں چاہتے ہیں سب کو دعا اور سلام خاص کر رضوانہ جی۔ نسیم نیازی اور زمر کو بے حد دعا اور سلام۔ یا سکین اقبال ہماری شاعری پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

کھ: فریدہ بھئی! ہم تو پریشان ہو گئے ہیں آپ کا خط پڑھ کر اللہ ہماری فریدہ کو جلد از جلد صحت یاب کرے اور آپ کی شاعری ایسے ہی دوشیزہ کو جگمگاتی رہے امید ہے آئندہ آپ کا خط آپ کی صحت یابی کی نوید لے کر آئے گا۔

✉: کراچی سے نسیم سحر ہمیں لکھتی ہیں السلام علیکم اللہ آپ لوگوں کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے آمین۔ جنوری کی سالگرہ نمبر پہ شاید ذرا سی تنقید ہو گئی تھی اور جو مزاج یار پہ گراں گزری۔ لیکن با خدا فروری کا سالگرہ نمبر 2 سپر ڈپر ہٹ رہا یہ بالکل سچ ہے ساری کہانیاں لا جواب رہیں رفعت سراج کے ناول نے رنگ جمادیا پہلی قسط سے ہی۔ دردانہ نوشین لکھی بہت اچھا لکھتی ہیں میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دو کوڑی کی عورت دردانہ نوشین نے ہی لکھا تھا؟ اور اگر وہ مجھے پڑھنے کو مل جائے تو شکر گزار ہو جاؤں گی اگر آپ کے پاس نہیں دو دردانہ نوشین صاحبہ خود سے مہربانی فرمادیں (میں ڈاک کا خرچ دے دوں گی) فرحت کا ”الٹا سیدھا“ بہت اچھا رہا کاش آج کل کی مائیں بھی اپنے بچوں کی تربیت ایسے ہی کریں کہ وہ اپنا گھر بنا اور اور بچا سکیں انالیق اعظم اور مٹکی سے بہشت تک کے سب ہی افسانے خوب رہے۔ آپ کا ادارہ ہمیشہ سے ہی بہترین ہوتا ہے اب آپ کی ذمہ داریوں میں رضوانہ صاحبہ بھی شامل ہیں اور یقیناً بہترین طریقے سے ذمہ داریوں سے عہدہ برابھی ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمت طاقت اور صحت کے ساتھ زندہ رکھے (آمین) آخر میں اپنی کہانیوں کے بارے میں بھی پوچھنا تھا کہ کب تک شائع ہوگی؟ ”ہا ہا ہا پلیز جواب ضرور دیجیے گا اگر ناقابل اشاعت ہیں تو بھی بتادیں تاکہ بے چینی ختم ہو جائے خاص کر ”انہونی“ کے بارے میں۔ مارچ کا شلہ مل چکا ہے دلشاد کا ”مٹی کی قسمت“ بچارے گاؤں کے کلچر کو واضح کر رہا تھا ایڈیٹر صاحبہ بھی اچھا لکھتی ہیں صدف آصف کا بہت ہی پرانا موضوع تھا زیادہ مزانہ آسانی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

کھ: پیاری سحر تمہارے پہلے سوال کا جواب تو دردانہ ہی دے سکتی ہیں اور جناب ہم نے تمہاری تنقید کا ذرا سا بھی برا نہیں منایا کہ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے گھر والوں سے کہہ دو تمہارا افسانہ اگلے ماہ آ رہا ہے خوش؟

✉: فرح انیس کراچی سے لکھتی ہیں السلام علیکم امید کرتی ہوں آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا اور دعا کرتی ہوں رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا کرم کرے (آمین) دوسری بار دوشیزہ کے شمارے میں

کھارن کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے..... ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

خط لکھ رہی ہوں ایسی کیا ناراضگی کہ میرا خط فروری کے شمارے میں شائع نہیں کیا چلیں کوئی بات نہیں اب کہ ضرور جگہ دیجیے گا ہمیں بھی احوال میں فروری کا شمارہ کافی طویل انتظار کے بعد ملاحظت اخلاق اور بینا عالیہ کی والدہ کی اللہ مغفرت فرمائے آمین ام مریم کا ناول کافی دلچسپ مرحلے طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے معصوم منصور کا افسانہ ایثار قربانی کا خوبصورت سبق دے گیا باقی افسانے اچھے رہے شاعری زبردست تھی میرا خط اپریل کے شمارے میں لگا دیجیے گا کیوں کہ مارچ کا شمارہ ابھی نہیں ملا اور ہاں میری بھیجی ہوئی دو تحریروں کا کیا ہوا جواب ضرور دیجیے گا زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

سہ: ڈیر فرح! محفل میں خوش آمدید اور ہم آپ سے کیوں خفا ہوں گے بھلا ایسا سوچے گا بھی مت آپ کی تحریروں کا شوق چوہان کے پاس ہیں جو سچی کہانیاں میں لگیں گی۔

✉: نسیم ماپارا ڈیفنس کراچی سے پہلی بار تشریف لائی ہیں۔ میں دوشیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور جب سہام مرزا مرحوم زندہ تھے تو اس زمانے میں دوشیزہ ایوارڈ کے فنکشن میں بھی میں نے شرکت کی ہے آج بہت عرصے کے بعد ایک بار پھر میں دوشیزہ کو یاد کر رہی ہوں اور دوبارہ اس حسین دوشیزہ سے رابطہ جوڑنے کا کریڈٹ شاید آپ کو بھی جاتا ہے رضوانہ۔ میری دعا ہے کہ منزہ سہام کی زیرادارت ان کی دوشیزہ کا حسن ہمیشہ قائم و دائم رہے گا اور آپ لوگوں کی محنت کا صلہ آپ لوگوں کو ملتا رہے۔ رائیٹر ایک گیٹ ٹو گیدر میں منزہ سے میری ملاقات ہو چکی ہے لیکن شاید اب انہیں یاد نہیں ہو۔

سہ: بہت پیاری نسیم! محفل میں ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اتنے عرصے بعد دوشیزہ سے ناٹھ جوڑا ہے تو اب اسے توڑیے گا نہیں منزہ کو یقیناً وہ ملاقات یاد نہیں ہوگی لیکن ہم جلد ہی ایک خوبصورت ملاقات کا اہتمام اپنے قارئین کے ساتھ کرنے والے ہیں سو تیار رہیں۔ آئندہ آپ کے تبصرے کا بھی انتظار رہے گا۔

✉: سلمیٰ غزل نے کراچی سے لکھا ہے۔ خوش رہیں ایک افسانہ ارسال ہے یہ وہ افسانہ ہے جو 16-7-2013 کو بھیجا تھا مجھے فون کر کے کہا گیا تھا کہ عنقریب چھپ جائے گا اور افسانے بھی تھے ان کی فوٹو اسٹیٹ نہیں کروائی تھی اس لیے نئے سرے سے لکھنے کا سوچنا پڑنے گا اس افسانے کی کاپی بھی اس لیے مجھے صرف فیئر کرنا پڑا امید ہے جلد ہی دوشیزہ یا سچی کہانیاں میں جگہ مل جائے گی اور پھر اس کی کاپی بھی تو یقیناً آپ بھیجیں گے۔ منزہ کیسی ہیں آپ کا کیا حال ہے طارق روڈ والا آفس تو میں نے دیکھا تھا اور دو مرتبہ آئی بھی تھی مگر اب ڈیفنس شفٹ ہو گئے پتا ہی نہیں چلا کیوں کہ پراسرار حویلی تو میں نے پرانے پتے پر بھی بھیجی تھی۔

سہ: پیاری سلمیٰ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے انشاء اللہ بہت جلدی لگ بھی جائے گا اور یہ ٹالنے والی بات نہیں ہے۔ پچھلی بار کی طرح آپ کو انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور ہاں آپ کا دوسرا مسئلہ تو اس کے لیے براہ راست کاشی کو فون کریں۔

✉: کراچی سے تمثیلہ زاہد بھی ہماری مہمان بن کر محفل میں تشریف لارہی ہیں۔ ڈیر رضوانہ پرنس صاحبہ السلام وعلیکم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی فروری کا دوشیزہ نہیں ملا مارچ کے دوشیزہ میں آپ کا جگہ کا نام پڑھ کر جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے کھٹ موہاٹل پکڑا اور جھٹ دوشیزہ کا نمبر ڈائل کر کے اپنے

دل و سماعت کو مکمل یقین دہانی کروائی کہ ”ہن کسی آگئے ہو“ (اب آپ آگئی ہو) آپ کو بہت بہت مبارک ہو اس نئے اضافے سے یقیناً دوشیزہ پر جو نکھار آئے گا اس کا مجھے واثق یقین ہو گیا ہے دوشیزہ ایوارڈ تقریب میں آپ کا اپنائیت بھر انداز میں بھول نہیں سکتی آپ کو پھر ایک بار خوش آمدید۔ صدف و صف و دل و ذن ناول محبت سے گندھے جذبوں سے مزین اچھا لگا اک ستم اور میں ہر معاشرتی اور نفسیاتی مسئلہ بیٹے کی پیدائش پر دلوں کا مرجھا جانا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں ہرگز شیوا نہیں دیتا لیکن یہ ایک ایسا Fact ہے جو بہت عام ہے سب سے بڑھ کر ماں باپ کی وفادار اور حساس جتنی لڑکیاں اور بیٹیاں ہوتی ہیں ویسے ویسے بیٹے بہت کم ہوتے ہیں بہر حال نعمان اسحاق کا ناولٹ اچھا تھا افسانے تمام اچھے تھے ابھی کچھ تحریریں پڑھنی باقی ہیں اب اجازت چاہوں گی آخر میں پھر اک بار آپ کو یاد دہانی کروادوں کہ 15 فروری 2013 کو میرا ناولٹ ”راہیں محبت کی“ بھیجا تھا جس کا اب تک کچھ پتا نہیں اگر جلد اشاعت میں جگہ مل جائے تو مہربانی ہوگی۔ خدا حافظ

کچھ: پیاری سی تمثیلہ اپنائیت انہی لوگوں سے محسوس ہوتی ہے جو اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور اگر تم انہی لوگوں میں سے ہو تمہاری ”راہیں محبت کی“ یقیناً دوشیزہ کی زینت بنے گی بس تھوڑا انتظار کر لو ہم جلد ہی ناولٹ نمبر لا رہے ہیں۔

✉: مومنہ بتول کا محبت سے مہکتا خط آیا ہے کراچی سے۔ جان عزیز..... رضوانہ پرنس صاحبہ میں آپ سے بالمشافہ کبھی نہیں ملی آمین لہذا مجھے معلوم نہیں آپ میری محترم ہیں یا عزیز من پیاری پیاری کا منی لہذا آپ کو مخاطب کرنے میں کچھ پس و پیش ہو رہی ہے بہتر ہے آپ وضاحت کر دیں آپ کی محفل میں آپ کا انداز بہت دلنشین لگا محبت بھرا محبتوں کی ڈور میں سب کو باندھتا ہوا لہذا خط لکھنے کا خود بخود دل چاہا حالانکہ دوشیزہ (مین سٹی) میں 19 کو ملا ابھی تک پڑھا نہیں..... پھر تبصرہ.....! یہ آپ کو شناسائی کی رسید کے طور پر محبت بھرے یقین کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں آپ نے میرے افسانے ”چاچی یا نوری“ آپل میں چھپا لو، سودا، محبت تیز گام اور ابھی ایک دو دن پہلے لکھا افسانہ ایک کھی چڑیا پوسٹ کروایا ہے برائے کرم آپ کاشی سے مشورہ کر کے اپنی صوابیدہ کے مطابق ان تحریروں کو مطالعہ کرے مجھے بتادیں کہ کب شائع ہوگا تاکہ سکون سا ہو جائے گا مزید یہ کہ ”بلک ڈے“ سانحہ پشاور پر ایک عظیم ماں مجسم نہ سہی پر تیرے پاس ہوں بھیجی تھی آپ اسے ٹائل پیج یعنی شروع کے صفحات پر شائع کریں کیوں کہ ہر ماں کے دل کی آواز ہے آپ جواب ضرور دیں میں منتظر رہوں گی اور ہاں آپ نے یہ جو نیا سلسلہ قاری کا ملاقات کے لیے جو پروگرام بنایا ہے کیا میں اور میری بیٹی شریک ہو سکتے ہیں کیونکہ میں ادبی لوگوں سے ملنا اور ایسی تقریب میں جانا چاہتی ہوں مجھے آپ سے اور ادب سے متعلق ہر فرد سے ملنے کا اشتیاق ہے یہ ایک عرض ابھی نہ سہی پھر کسی تقریب میں سہی مگر آپ مجھے یاد رکھنا میں جوانی لفافہ پوسٹ کر رہی ہوں چند سطروں میں جواب دینا آپ کا یہ مجھ پر قرض ہے اگر آپ جواب نہ دے سکیں تو پلیز ان نمبر پر کال کر لیں یا پھر میں کال کر لوں، انینڈ ضرور کریں۔

کچھ: پیاری سی مومنہ بتول: ہمارے اور آپ کے درمیان تو محبت سے گندھا ایک بہت ہی خوبصورت تعلق ہے سو اسی حوالے سے چاہے ہمیں دوست سمجھ لو آپ یا باجی کہہ دو ہمیں کسی بھی رشتے پر اعتراض نہیں اور ہاں

تقریب تمہارے بنا تو سونی گئے کی نشاء نہ جیسے ہی اس کا انعقاد کریں گے تمہارا آنا لازمی ہوگا باقی باتوں کے لیے ہمیں کان کرلو۔

میرے عادل حسین اپنے تبصرے کے ساتھ کراچی سے تشریف لائے ہیں مارچ کا دوشیزہ اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلو اُگر ہوا ناکل ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا کاشی بھائی عورت کی جو کچی تصویر آپ نے پیش کی وہ ہمارے دل کی بھی آواز ہے زاور اور دل کو ہمیشہ کی طرح منور کی گیا دوشیزہ کی محفل کے تو کیا کہنے جہاں پر اسے لوگوں کے ساتھ نئے لوگ بھی محبتیں لٹا رہے ہیں صنم سعید سے ملاقات بھی اچھی رہی اور ہر دل عزیز فنکار جناب محمد علی صاحب پر مضمون بھی معلومات میں اضافہ کر گیا افسانے بہت خوبصورت رہے تھے دلشاد نسیم صاحبہ اس بار بھی بازی لے گئیں کیا خوبصورت افسانہ پیش کیا ہے جسے حقیقت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا نہ بہت جہیں ضیاء صاحبہ کی بے نام مسافرتیں بس سو سو رہا ہے کیسی ہے یہ تنہائی رو بینہ شاہین جی کا ایک اچھا افسانہ تھا معاشرتی رویوں کا عکاس تحسین انجم انصاری صاحبہ کا خوشبو کی مہک بھی ایک بہترین افسانہ تھا۔ خیر کی طرح اظہار بھی خوبصورت تھا نعمان الحق کا ناولٹ بھی اپنے انجی م کو پہنی صدف آصف صاحبہ کا گیت دے آف لو خوبصورت لگا گو کہ کہانی وہی ساس مندوں کے جسمیوں کی تھی مگر پیش بہت خوبصورتی کے ساتھ یہ دل تا آخر سب ہی ٹھیک رہا تیرے عشق نچایا اور رحمن رحیم سدا سائیں بھی بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں پڑھنے والے کو انکی قسط کے انتظار پر مجبور کر دیتے ہیں رفعت سراج صاحبہ کا دم دل بھی اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر چکا ہے انتخاب خاص اس بار بھی زبردست رہا پڑھ کر مزہ آ گیا بوختہ بھی اچھا لگا باقی تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب چل رہے ہیں شاعری کے صفحات میں کچھ اضافہ ہو جائے تو اچھا ہے اب دو صفحات کم لگتے ہیں تمام کہنے والے اور پڑھنے والوں کو سدم درد عاقلیں اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو معافی کا طلبگار ہوں۔ بشر زندگی پھر ملاقات ہوں۔ سندھ فقط

سچ عادل صاحب محفل میں اتنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ آنے کا بہت شکریہ امید ہے آئندہ بھی آتے رہے گے رائیٹر ز کو ایسے ہی تبصروں کا انتظار رہتا ہے۔

میرے خولہ عرفان اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ ہماری محفل میں بیٹھی نظر آ رہی ہیں۔ محترمہ رضوانہ صاحبہ پہلی دفعہ اس قلم کو آپ سے ہمکلام ہونے کا موقع مل رہا ہے اس امید کے ساتھ کہ جس طرح کاشی چوہان اپنے جوابات سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے آپ بھی ان سے پیچھے نہیں رہیں گی بلکہ مارچ کا شمارہ پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ ان ہی کے ہم قدم ہیں ماشاء اللہ۔ اب رسالے کی طرف آتی ہوں مارچ کا شمارہ میرے ہاتھوں میں اس وقت آیا۔ جب سترہ مارچ کا سورج انتظار کی گھڑیوں کو طے کرتا ہوا مغرب میں ناراض ہو کر چھپ چکا تھا ملاحظہ کا موقع میں مارچ کو نصیب ہوا اب تبصرے کے لیے بیٹھی ہوں تو چوبیس مارچ کا سورج آب و تاب سے چمک رہا ہے اور ماہ مارچ کے گزرنے کی خبر دے کر ہاتھ ہلا رہا ہے کہ ابھی خط لکھتا ہے تو لکھو ورنہ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک اس لیے قلم سنبھال لیا ہے دلشاد نسیم صاحبہ کا ”مٹی کی فہست“ بہت عمدہ ماشاء اللہ شہد میں ڈبو کر خنجر مارا ہے بقول میرے

ہم اسے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہم شکل بنائے ہیں۔“

کیا یہ روایت درست ہے؟

اسی روایت کی کھوج میں موت سے بچے کش اُس سرکش نوجوان کی
ناقابلِ فراموش داستان۔

کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟

کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

ایک انوکھی داستان جسے علامہ ”چنگی گھانچاں“ میں دھرم چاندی ہے
آپ بھی پڑھنا نہ مرت بھولے اور نادل ہم شکل کا حصہ بن جائے



آہ بھی نہیں نکلی اشک بھی نہیں آئے

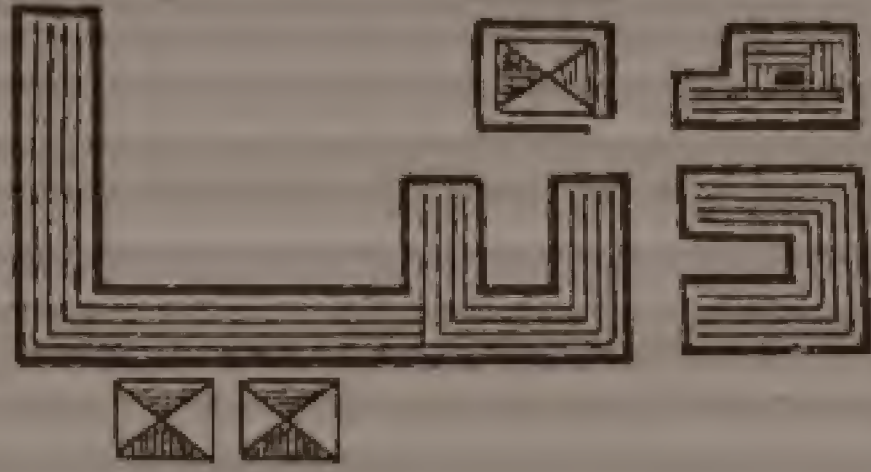
تیر کیا نشانے پر ٹھیک جا کے بیٹھا ہے !

زہت صاحبہ کا افسانہ "بے نام مسافتیں" معاشرے کی عکاسی کرتا ہے ہلکی پھلکی تحریر کے ساتھ اچھا لگا رضوانہ پرنس یعنی آپ کا "ایک ستم اور" اور روبینہ شاہین صاحبہ کا "کیسی ہے یہ تنہائی" حقیقی رشتوں کے ایسے زہریلے رویوں کی کہانی ہے جو انسانی رشتوں کا ناسور ہوتے ہیں۔ موضوع کی سفاکی کے باوجود کہانی اور انداز تحریر دونوں اچھے تھے تحسین انجم انصاری کا "صفائی کی مہک" مختلف انداز میں اچھی تحریر تھی نعمان الحق صاحب کا "میرے پرندہ دل" کا اختتام کچھ بے تاثر سارہا البتہ غزل اچھی تھی انتخاب خاص خاص ہی ہوتا ہے یعنی گراموفون بہت بہت اچھا رہا ماہ مارچ میں روشن خیال کاشی صاحب کا عورت کی عظمت دلوں میں اجاگر کرتا ادارہ یہ بھی بہت عمدہ تھا جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو محترمہ رضوانہ جی میری رائے یہ کہتی ہے کہ تحریر تو معاشرے کا آئینہ دار ہوتی ہے مصنف تو ان کو لفظوں کے لباس سے آراستہ کرتا ہے اور جیسا دلیس دیا بھیجیں ہو تو چار چاند لگ جاتے ہیں میرے نزدیک سب مصنفین اور ان کی تحریریں قابل احترام ہیں کہ وہ اپنا قیمتی وقت غیر محسوس طریقے سے معاشرے کی اصلاح کے لیے وقف کرتے ہیں کاشی صاحب اور رضوانہ جی وہ آنکھیں اور وہ ہاتھ قابل احترام ہیں میرے لیے جو اپنے خیال اور خواب سے اوراق کو سیراب کرتے ہیں اور لفظوں کو کاشت کر کے کہانیوں اور افسانوں اور ناولوں کی فصل بہار دیتے ہیں اتنے بڑے لوگوں پر میں کیا تنقید کر سکتی ہوں اللہ ان آنکھوں اور ہاتھوں کو سلامت رکھے آئین جو بھی رائے ہے آپ کے سامنے حاضر ہے ایک غزل ارسال کر رہی ہوں عزت بخش دیجیے کافی الحال ماہ مارچ کے شمارے کا جتنا مطالعہ کیا اس کا تبصرہ حاضر ہے باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔

بھ: بہت پیاری خولہ! دوشیزہ کو ایسے ہی مکمل تبصرے اچھے لگتے ہیں لیکن دوست تنقید کرنا کوئی بری بات نہیں ہوتی رائیٹرز ہمارے لیے بہت ہی قابل احترام ہیں لیکن مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے اگر آپ کو کسی تحریر میں کوئی خامی نظر آئے یا آپ کو اختلاف ہو تو بلا جھجک لکھ دیا کریں تب ہی تو دوشیزہ کا معیار بڑھے گا آپ کی غزل شائع ہو رہی ہے مٹھائی کدھر ہے۔

✉: لاہور سے رضوانہ کوثر کا محبت بھرا تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے لکھتی ہیں ماہ مارچ کا دوشیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت میرے ہاتھوں میں موجود ہے۔ سب سے پہلے تو رضوانہ آپ کو میرے خط کا اتنا خوبصورت جواب دینے پر شکریہ۔ کاشی کا ادارہ یہ ماہ مارچ اپنے اندر بہت گہرائی لیے ہوئے تھا زادراہ سے ہوتے ہوئے محفل تک پہنچے۔ سب اپنوں کے خطوط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس سے سوال میں صنم سعید سے ملاقات نے مزہ دیا۔ اس بار منی اسکرین غائب تھا اور سلور اسکرین ان۔ آنگن میں بارات میں اس بار رضیہ زمان کی پونی کی شادی کا احوال پڑھ کر دل خوشی اور غم کے احساسات سے نم رہا۔ رفعت سراج کا نیا ناول دام دل زبردست ثابت ہو رہا ہے۔ رفعت سراج نے دوسری قسط میں کمال کر دیا۔ ایمن اور چمن دونوں کے سسرال پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور پڑھتے ہوئے ہم خود کو ان ہی گھروں میں محسوس کرتے ہیں۔ مینا عالیہ کے ناول تیرے عشق نچایا کی سترہویں کڑی بھی خوب رہی

میں کس جگہ



سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ ”سچی کہانیاں“ کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برستے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ”سچی کہانیاں“ کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ”سچی کہانیاں“ پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ ”سچی کہانیاں“ میں آپ بتائیں جگہ بتائیں اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں ناقابلِ یقین کہانیاں دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دُمر کے درمیان دلچسپ نوک بھڑک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ ”سچی کہانیاں“ میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

رحمن رحیم سدا میں میں ام مریم نے جہاں سیاری گتھیاں سلجھا دیں وہیں ناول کے اختتام میں جب پڑھا کہ اگلے ماہ سے ناول نیا سوز لے رہا ہے تو تجسس اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ دیکھیے اب مریم اس ناول کو کہا نیا سوز دیں گی۔ نعمان الحق کا پرندہ دل بلا خرابی نے پہنچ ہی گیا۔ صدف آصف کا مکمل ناول گیت وے آف لو بہت زبردست تھا۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ ”اک ستم اور“ بھی پڑھ کر مزہ آیا افسانوں میں دلشاد نسیم کا مٹی کی قسمت بہت زبردست تھا۔ نزہت جبین ضیاء کا بے نام مسافتیں رو بینہ شاہین کا کیسی ہے تہائی اور تحسین انجم انصاری کا صفائی کی مہک بھی اچھے تھے۔ انتخاب خاص میں گراموفون نے سماں باندھ دیا۔ رنگ کائنات کی جلو خالہ بھی کمال تھیں اس کے علاوہ دوشیزہ میگزین کے تمام مستقل سلسلے اپنی مثال آپ ہیں۔ جس کے لیے آپ لوگ داد کے مستحق ہیں۔ چلیے تبصرہ تو اختتام کو پہنچا اب کچھ اپنی بات ہو جائے۔ آج کل میری طبیعت بہت خراب ہے میری اپنے پیاروں سے درخواست ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کریں۔ اب تبصرے کا دی اینڈ کرتی ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

سدا بہت پیاری رضوانہ اللہ جلدی آپ کو صحت یاب کرے صرف ہم ہی نہیں ساری محفل کے مہمانوں کے ہونٹوں پر بھی یہی دعا ہے۔

سر سوزیہ احسان رانا کی حاصل پور سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں مارچ کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل بہترین تھا۔ کاشی بھائی آپ کے ساتھ اب ایک اور ایڈیٹر صاحبہ رضوانہ پرنس بھی آگئی ہیں۔ امید ہے آپ دونوں مل کر دوشیزہ کا معیار اور بلند کریں گے۔ رضوانہ جی کو خوش آمدید، امید ہے آپ بھی ہمارے ساتھ مکمل تعاون کریں گی۔ کاشی بھائی کا ”ماہ مارچ“ ان کی سوچ کا عکاس تھا۔ محفل کی باگ دوڑ رضوانہ جی کے ہاتھ میں ہے۔ رضوانہ جی ذرا خیال سے... ہم بڑی دور سے دوشیزہ کی محبت میں حاضر ہوتے ہیں اس لیے اپنی قیمتی کو ہمارے تبصرے سے دور رکھیے گا۔ خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ اپنی فیورٹ رائیٹر رفعت سراج ٹھہری ہیں۔ دام دل زبردست ناول شروع ہوا ہے۔ اور رفعت سراج نے آتے ہی اپنی دھاک بٹھادی ہے۔ مینا عالیہ کا ناول ٹھیک ہے۔ ام مریم رحمن رحیم سدا میں میں کمال کر رہی ہیں۔ مریم میری طرف سے اس شاندار ناول کی کامیابی پر بہت مبارکباد قبول فرماؤ۔ نعمان الحق کا میرے پرندہ دل بھی بہتر تھا۔ نعمان کو ابھی مزید محنت کرنا ہوگی۔ دلشاد نسیم، نزہت جبین ضیاء، رو بینہ شاہین، اور تحسین انجم انصاری کے افسانے بھی اچھے تھے۔ کاشی بھائی آپ کی اور رضوانہ جی کی خدمت میں ڈھیروں دعائیں اچھا اب اجازت دیں۔ ارے اجازت سے پہلے یہ تو بتا دیں میرا انتظار کب ختم ہوگا۔ میرے ناولٹ کی باری کب آئے گی۔ پلیز کچھ خیال کریں اب تو بہت عرصہ گزر گیا۔ امید ہے میری بات کا برا نہیں منایا جائے گا۔ خدا حافظ۔

سجہ: اچھی فوزیہ خوش ہو جائیں اس ماہ سے ا کا ناولٹ شروع ہو رہا ہے اب بتائیے محفل کے مہمانوں کو مشائی کی ٹریٹ کب مل رہی ہے۔

ساتھیو! اب اس دعا کے ساتھ آپ سے اجازت چاہیں گے کہ اللہ آپ سب کو ہمیشہ اپنی مہربان پناہ میں رکھے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اسی محفل میں ملاقات ہوگی، آنا نہ بھولیے گا۔

آپ کی دعاؤں کی طالب

رضوانہ پرنس

☆☆.....☆☆

بہارِ نثر بہار ہو گئی

آراء

مدیرہ اعلیٰ منزلہ سہام مرزا کی پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج میں
تقریب تقسیم انعامات میں بطور مہمان اعزازی شرکت کا مختصر احوال



جیسے ہی پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج کی طالبات
نے سنا ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ اور نئی کہانیاں کی
سرپرست اعلیٰ آرہی ہیں تو سب میں ہچکچاہٹ مچ گئی ان
کا انتظار ہر طالبہ بے چینی سے کر رہی تھی۔ بار بار
انچارج پروگرام الماس راجی سے طالبات تقریب
تقسیم انعامات کا پوچھ رہی تھیں اور بالآخر وہ تاریخ



پروفیسر راشدہ محترمہ منزلہ سہام مرزا کو گلہ دستہ پیش کرتے ہوئے

اور دو دن آئی گئیں۔ تین مارچ بروز منگل طالبات
بست پر جوش تھیں۔ منیرہ سہام مرزا کے بارے میں
جان کر اساتذہ کو بھی ان کا انتظار تھا۔
"کانچ کی عورت" اور اہل عرف کی مصنفہ



ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کی مدیر اعلیٰ محترمہ سہام مرزا کالج کی پرنسپل محترمہ عفت بانو اور سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ
پرویز کے ہمراہ طالبات میں انعامات و اسناد تقسیم کرتے ہوئے

طالبات کو ان کے قریب لا رہی تھی۔ طالبات نے ان کے ساتھ نمائش میں تصویریں بنوائیں۔ منزہ سہام مرزا نے طالبات کے بنائے ہوئے پوسٹرز اور پروجیکٹ کو سراہا۔ ہجوم میں گھری منزہ سہام کو ہال میں لایا گیا۔ جہاں طالبات کا جم غفیر تھا، جو ان کا منتظر تھا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد اردو کی ہیڈ

سے سب ملنا چاہتے تھے۔ منزہ سہام مرزا کو اساتذہ نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ ان کا ظاہری اور باطنی حسن انہیں خیرہ کر رہا تھا۔ مدھم آواز اور ٹھہراؤ کے ساتھ گفتگو کے فن سے آشنا منزہ سہام مرزا دیکھنے اور سننے والوں کے دل میں اتر گئی تھیں۔ چائے پر ادبی سماجی اور معاشرتی موضوع پر منزہ سہام کی اساتذہ



محترمہ منزہ سہام مرزا کالج میں منعقدہ پوسٹرز نمائش کو اظہار سے دیکھتے ہوئے ساتھ میں پرنسپل محترمہ عفت بانو اور انچارج پروگرام محترمہ الماس روجی بھی ہمراہ ہیں

آف دی ڈپارٹمنٹ محترمہ ذولخا ذریں صاحبہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور محترمہ منزہ سہام مرزا کو ”کالج کی گڑیا“ سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر راشدہ نے محترمہ منزہ سہام مرزا کو پھولوں کا گلہستہ پیش کیا۔

انچارج پروگرام محترمہ الماس روجی صاحبہ نے سال بھر وقتاً فوقتاً طالبات میں مقابلے منعقد کروائے تھے۔ یہ مقابلے پوسٹرز، کہانی، کارڈز، افسانے، اور ریسی پر مشتمل تھے۔ ان مقابلوں میں جیتنے والی طالبات کو انعامات دینے کے لیے محترمہ منزہ سہام

سے گفتگو ہوتی رہی ادھر انچارج پروگرام الماس روجی اور ان کی طالبات، پرنسپل محترمہ عفت بانو کے آفس پہنچیں۔ اس پروگرام کی مہمان اعزازی منزہ سہام مرزا اور مہمان خصوصی سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ پرویز صاحبہ تھیں جنہوں نے کالج کی بہتری کے لیے نمایاں کام کیے اور یادگار فنکشن ان کے عہد سے منسوب رہے۔ پرنسپلز، اساتذہ اور طالبات کے ہجوم میں منزہ سہام مرزا نے پوسٹرز نمائش کا ربن کاٹ کر افتتاح کیا۔ طالبات خوبصورت سی منزہ سہام کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ اجلی اجلی اور پر وقار شخصیت

تقریب کے مہمانانِ گرامی محترمہ منزہ سہام مرزا، جن کی آمد نے بہار کو پُر بہار بنا دیا تھا۔ محترمہ صبیحہ پرویز جن کے ذوق کو کالج نے ہر موقع پر سراہا۔ پرنسپل عفت بانو جن کی معاملہ فہمی الجھے کاموں کو سلجھا دیتی ہے۔

پروفیسر ہما عظمیٰ جو ادب دوست ہیں۔ پروفیسر راشدہ اور پروفیسر شرجن کے تعاون نے تقریب کو چار چاند لگائے، ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے اختتام کے بعد منزہ سہام مرزا اور اساتذہ کرام

مرزا پرنسپل عفت بانو اور سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ پرویز کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ طالبات منزہ سہام مرزا کے ساتھ تصویریں بناتے ہوئے بہت خوش تھیں۔ انعامات کی تعداد ”اچلے حروف“، ”دوشیزہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیوں“ کی شمولیت سے بڑھ چکی تھی۔ آخر میں محترمہ منزہ سہام مرزا نے پرنسپل عفت بانو، پرنسپل صبیحہ پرویز، جج منٹ کے فرائض انجام دینے پر شاعرہ اور ادیبہ پروفیسر ہما عظمیٰ، پروفیسر شہناز،



محترمہ منزہ سہام مرزا طالبات کے بنائے گئے پروجیکٹس کو بغور دیکھتے ہوئے

پرنسپل عفت بانو کے ہمراہ آفس آگئے، جہاں ٹی پارٹی کا اہتمام تھا۔ گفتگو کا پھر ایک سلسلہ تھا۔ منزہ سہام مرزا نے طالبات کی صلاحیتوں کو سراہا۔ محترمہ الماس روجی کی خدمات کی تعریف کی۔ منزہ سہام مرزا کی گفتگو اساتذہ مزید سننا چاہتے تھے مگر وقت کا پیچھی اڑنے کے لیے پرتول چکا تھا۔ محترمہ منزہ سہام اب رخصتی کی اجازت لے رہی تھیں۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اساتذہ نے انہیں خدا حافظ کہا۔

☆☆.....☆☆

انتظامی امور میں پروفیسر راشدہ اور پروفیسر شرجن کو فہم دین پبلی کیشنز کی جانب سے کتابوں اور رسائل کے تحائف دیے گئے۔

محترمہ منزہ سہام جب طالبات سے مخاطب ہوئیں تو تالیوں سے ان کی ہر بات پر طالبات نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کہانی لکھنے اور عملی زندگی کے گر منزہ سہام نے طالبات کو بتائے۔ آخر میں انچارج پروگرام الماس روجی صاحبہ نے ادارہ فہم دین، پبلی کیشنز اور ادارہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں ڈائجسٹ

پاک سوسائٹی

آج کے کامیاب اور وقیعہ اداکار

شہزاد شیخ

دیشان فراز

شونگ یہ وقت کا پتا نہیں چلتا اور نماز فرض ہے اس لیے سب سے مشکل کام لگتا ہے۔

☆: کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
♥: شکر ادا کرتا ہوں فی الحال اللہ نے ہر

خواہش پوری کی ہے۔

☆: اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥: ایمانداری میری اچھی عادت ہے۔

☆: اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥: میں بہت ست واقع ہوا ہوں، یہی میری

سب سے بری عادت ہے۔

☆: کون سا کردار ہے جو آپ ادا کرنا چاہتے ہیں؟

♥: کوئی ایک نہیں بہت سارے کردار ہیں

جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔

☆: اردو والے ”سفر“ کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی کار۔

☆: صبح کا آغاز کس طرح کرتا ہیں؟

♥: ناشتا کر کے۔

☆: دن کا کون سا پہرا چھا لگتا ہے؟

♥: رات کا۔

☆: وہ وہاں جو شناخت کا باعث ہے؟
♥: شہزاد شیخ۔

☆: گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥: شرجی۔

☆: وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥: کراچی۔

☆: زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
♥: لبرہ۔

☆: علم کی اتنی دولت کمانی؟

♥: پیپلز کمپیوٹر سائنس اور فلم کے بارے میں کورس کیا ہے۔

☆: کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥: بس ایک چھوٹی بہن ہے۔

☆: اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥: بالکل۔

☆: اس زندگی میں کون سا کام سب سے

مشکل ہے؟

♥: نماز کے لیے وقت نکالنا کیوں کہ



علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

☆: موت سے سب ڈرتے ہیں۔

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین

رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

☆: یہ تو بالکل سچ ہے۔ دوست ہوتا نہیں ہر

ہاتھ ملانے والا۔

☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

☆: مجھے اپنی ماں کے ہاتھ کا بناؤا کھانا پسند ہے۔

☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے

قائل ہیں یا تدبیر کے؟

☆: آپ محنت کریں ایمانداری سے، جو آپ

کے نصیب میں ہوگا، وہ آپ کو ہر حال میں مل جائے گا۔

☆: ویک اینڈ کیسے گزارتے ہیں؟

☆: سوکر۔

☆: شو بزم میں آمد کیسے ہوئی؟

☆: بس اچانک ہی ایکٹنگ کا شوق ہو گیا تھا۔

☆: وجہ شہرت کون سا پروگرام بنا؟

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

☆: کوئی آپ کی برائی کرے۔ کوئی غلط بات کرے۔ کوئی آپ سے غیر دیانت دار رہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بہت دکھ دیتی ہیں۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

☆: صحت، عزت، محبت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

☆: سمندر کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ

زندگی میں ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں اصل میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

☆: خود ستائشی کے کس حد تک قائل ہیں؟

☆: ایک حد تک تو خود ستائشی کے سب قائل

ہوتے ہیں۔

☆: کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

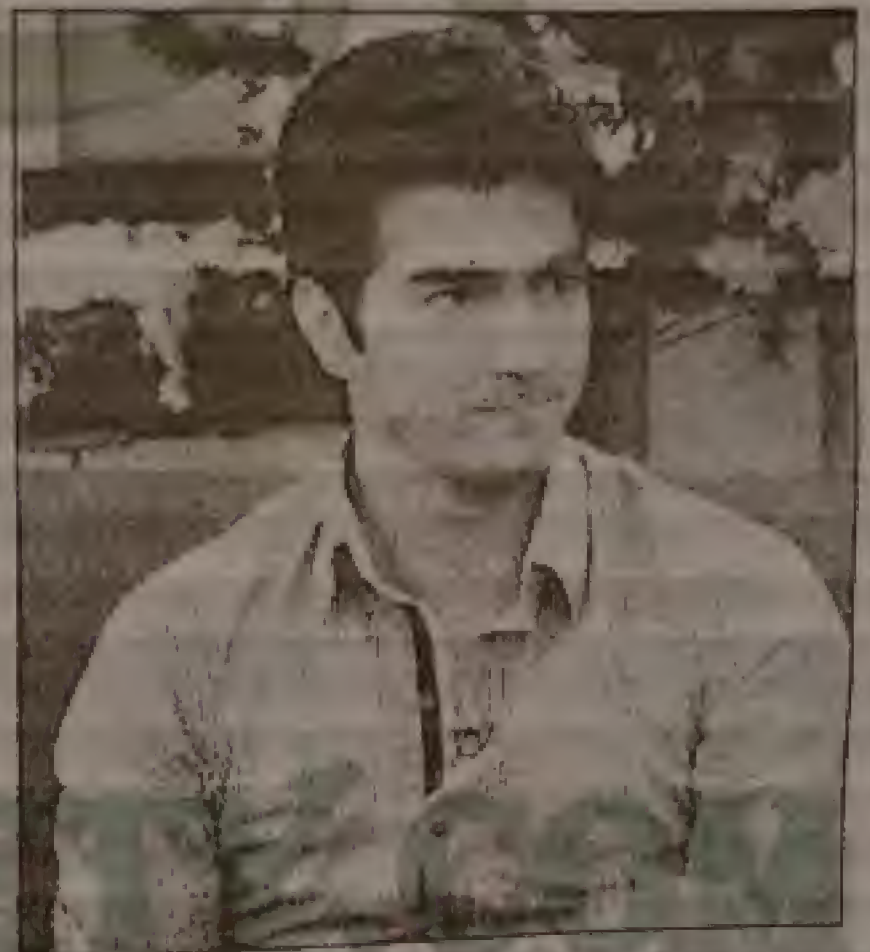
☆: بابا ہا..... لوگوں کو دکھانے کے لیے چھوڑ

دیتا ہوں۔ لیکن کھا لیتا ہوں۔

☆: آپ کی نظر میں خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟

☆: پوری دنیا ہی خدا کی حسین تخلیق ہے۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے



♥: آگ نی دی کے لیے ڈراما سیریل"
 ڈریمز" کیا تھا اور شہرت بھی اسی سیریل میں ملی۔
 ☆ سال کے کس دن کا بے چینی سے
 انتظار رہتا ہے؟
 ♥: اپنی سالگرہ کے دن کا..... ویسے تو ہر دن
 ہی نیا ہوتا ہے۔

☆ آپ کی نظر میں بہترین تحفہ کیا ہے؟
 ♥: امی اور بابا جو بھی تحفہ دیں میرے لیے
 بہت خاص ہوتا ہے۔

☆ محبت کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟
 ♥: محبت کا اظہار موقع محل کے اعتبار سے
 کیا جاتا ہے۔

☆ ہمارے معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟
 ♥: اچھی اور بری دونوں ایک ہی ہیں، وہ یہ کہ
 ہم جذباتی بہت ہیں۔

☆ بوریٹ دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟
 ♥: موویز بہت دیکھتا ہوں۔
 ☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥: شہرت اچھی چیز ہے۔ لوگ تعریف کرتے
 ہیں، حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔
 ☆ کیا آپ اچھے رازداں ہیں؟

♥: پتا نہیں، ویسے آج تک کسی کی بات کسی
 سے نہیں کی۔ دل دریا سمندروں ڈونگے والی مثال ہے۔
 ☆ عام لوگوں سے ایک اداکار کی زندگی

کتنی مختلف ہوتی ہے؟
 ♥: قطعی مختلف نہیں ہوتی۔ میں تو خود کو ایک
 عام انسان سمجھتا ہوں۔

☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
 ♥: بشیو کے وقت آئینہ دیکھتا ہوں اور ڈریسنگ کے
 لیے، آئینہ دیکھ کر کبھی سوچتا نہیں ہوں اس لیے خیال
 نہیں آتا کوئی۔

☆: "ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا"
 کس حد تک عمل کرتے ہیں؟
 ♥: جو جتنا مستحق ہوتا ہے اسی حساب سے
 عمل کیا جاتا ہے۔

☆: کس ملک کی شہریت لینا چاہتے ہیں؟
 I proud To be Pakistani: ♥
 ویسے امریکہ کی شہریت ہے میرے پاس۔

☆: زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟
 ♥: زندگی کبھی بری نہیں لگتی۔
 ☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥: مطالعہ بہت ضروری ہے۔ مطالعہ آپ کو
 ہر بار کچھ نہ کچھ نیا ضرور دیتا ہے۔
 ☆: انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی کس حد تک ہے؟

♥: ان چیزوں سے دلچسپی بہت محدود ہے۔
 ویسے بھی بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔
 ☆: کون سا چینل شوق سے دیکھتے ہیں؟

♥: اسپورٹس چینل شوق سے دیکھتا ہوں۔
 ☆: کس ہندوستانی شخصیت سے ملنے کے خواہش مند ہیں؟
 ♥: قاعد اعظم سے۔

☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟
 ♥: پانی کے بغیر سفر ممکن نہیں۔
 ☆: اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟

♥: بس یہی چاہوں گا کہ میں صبح جلدی اٹھنا
 شروع کر دوں۔
 ☆: کون سا تہوار شوق سے مناتے ہیں؟

♥: 14 اگست۔
 ☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گے؟
 ♥: اپنی زندگی میں ایمانداری کو شعار

بنائیں، بس آپ ایک اچھے انسان بن جائیں
 ، سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔
 ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

آروائی کے خوبصورت پروگرام

مشخ

مریم انصاری، انعم تنویر، عمران اسلم اور فضیلہ قاضی قابل ذکر ہیں سوپ "دل برباد" پیر سے لے کر جمعرات رات دس بجے تک ARY ڈیجیٹل پر دکھایا جائے گا۔ سیریل "تم سے مل کے" 21 سالہ ظل ہما کی کہانی ہے جو ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے، بچپن میں یتیم ہو جانے کے باعث اپنی تائی اماں کے ہمراہ

اے آروائی ڈیجیٹل نیٹ ورک پر نشر ہونے والا سوپ "دل برباد" یہ دو بہنوں ہانیہ اور رانیہ کی کہانی ہے، جن کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور وہ اپنی نانی کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہیں۔ نانی عالیہ بیگم کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے، جس کا تذکرہ وہ اپنے بیٹے شمس سے بھی کرتی ہے اور



تحریم زبیری، فیروز خان اور سنبھل اقبال سیریل "تم سے مل کے" میں

رہتی ہے اور نانی کے بیٹے سے خاموش محبت کرتی ہے مگر اپنے کزن ہمایوں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ ہمایوں ایک محنتی لڑکا ہے۔ ہمایوں کی ماں اور ظل ہما کی تائی نے بیوہ ہونے کے بعد اپنے بچوں کو بہت مشکل سے پالا ہے اور ظل ہما سے نوکروں والا سلوک کرتی ہے۔ تائی کے حالات بہتر ہو جانے کے بعد وہ اپنے بیٹے کے لیے ہر ماں کی طرح امیر بھولانا چاہتی ہے۔ ظل ہما تو ایک غریب لڑکی ہے تائی کے

فکر مند نواسیوں کی وجہ سے۔ شمس کی بیوی فرحت آرا بہت اچھی خاتون نہیں ہیں۔ وہ ان لڑکیوں کو بالکل پسند نہیں کرتی ہیں۔ نانی عالیہ بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ شمس بیوی فرحت آرا کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یہاں سے ہانیہ اور رانیہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ خوبصورت سوپ کو تحریر کیا ہے معروف مصنف نزہت سمنے جبکہ ہدایت شاہد یونس کی ہیں اس سوپ کے فنکاروں میں سنگیتا، فرح علی،

بیٹیاں ہیں دلشاد بیگم کی طرف سے توجہ نہ ملنے پر چاروں بچے اپنی اپنی سوچ کے مطابق زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بچے کس طرح اپنی زندگی کا معیار پر نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس کا جواب آپ دیکھ سکتے ہیں ہدایت کار محسن مرزا اور مصنفہ میمونہ خورشید کی تحریر کردہ سیریل ”پرورش“ دیکھ کر۔ یہ سیریل ہر منگل کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔

سیریل کے فنکاروں میں اسفر حمن، سدرہ بتول، انعم فیاض، محمود اختر، سندس طارق، صبا فیصل، بابر خان، نوید رضا، فردوس جمال، سہیلی پاشا، قابل ذکر ہیں۔

سیریل ”ممتا“ ہر بدھ کی رات 9 بجے دکھائی جائے گی اسے آر وائی ڈیجیٹل سے۔

سوپ ”قسمت“ میں اداکارہ میرا مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ جس میں دیورانی اور جیٹھانی کے



سیریل ”ممتا“ میں سونیا حسن اور آغا علی

جھگڑوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوپ کو لکھا ہے نادیر اختر نے جب کہ ہدایت کار شاہد یونس ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ اسے آر وائی ڈیجیٹل سے 7 بجے دکھایا جا رہا ہے۔

”خدا نہ کرے۔“ ہر پیر کی رات 9 بجے دکھائی جا رہی ہے۔

☆☆.....☆☆



سپراشار میرا سوپ ”قسمت“ میں

گھر میں پلتی ہے (تائی کے بیٹے) کے خواب دیکھتی ہے۔ ہمایوں کو دل و جان سے چاہتی ہے جبکہ تائی ہمایوں کے لیے مالدار بہولا بنا چاہتی ہے۔ کیا ہمایوں سے گل ہما کی شادی ہو جاتی ہے؟ گل ہما کی تائی رابعہ خوشحال گھرانے سے بہولانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب تو سیریل ”تم سے ملے کے“ دیکھنے کے بعد ہی ملے گا۔ اس سیریل کے ہدایت کار فرقان خان ہیں۔ سیریل کو تحریر کیا ہے عنیزہ سید نے جبکہ فنکاروں میں سہیل اقبال، فروز خان، فرح شاہ، تریم ذہری، سہیلی پاشا، اوز شہریار زیدی شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جاتی ہے۔

سیریل ”پرورش“ کی کہانی اس والدہ کی ہے جس نے شوہر کی کمائی کو اپنی عیاشیوں اور آرام میں ضائع کیا۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، دلشاد بیگم کے شوہر ابراہیم کمال بیرون ملک سے وافر رقم بھجوا رہے ہیں، جس سے روز بروز گھر کے حالات کیا دلشاد بیگم کے جینے کا اسٹائل بھی بدل جاتا ہے۔ جو وقت دلشاد بیگم کو بچوں کو دینا چاہیے وہ وقت اپنی دوستوں میں گزارتی ہیں۔ دلشاد بیگم کے دو بیٹے اور دو

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناول
رفعت سراج

دامِ اول

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی تیسری کڑی

چمن بینڈ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اصل میں وہ شمر کے واش روہم سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک اچھی
خبر بکہ خوش خبری اسے دن بھر بے چین کیے رہی۔ وہ پل پل گن کر شمر کے گھر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی



میڈیکل رپورٹ آج آگئی تھی، اس میں سب اچھا ہے کی خوش خبری تھی۔ رپورٹ نے اس کے نسوانی پندار کی بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ ایک مکمل عورت تھی۔ یاں بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ قدرت نے دونوں ہاتھوں سے خزانے اس کی جانب اچھالے تھے۔ وہ محروم نہیں تھی۔ اسے ہر دنیاوی نعمت سے نوازا گیا تھا، مگر.....

ثمر و اش روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔ چمن کو حالت مراقبہ میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ ابھری۔

”اللہ رحم کرے..... اکیلے اکیلے مسکرا رہی ہو۔ کل تمہارا چیک اپ کراتے ہیں۔“ ثمر کے شریر جملے نے اسے ایک حسین خیال کے سمندر سے باہر اچھال دیا۔

”چیک اپ تو ہو گیا ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر پُر سکون انداز میں گویا ہوئی۔ ”اور آج رزلٹ بھی آ گیا ہے۔“ وہ بیڈ سے اتر آئی۔ ثمر ٹاول سے اپنے بال خشک کر رہا تھا۔ اگلے مرحلے میں یہ ٹاول چمن کو پکڑا یا جاتا تھا۔ چمن اپنی معمول کی ڈیوٹی کے لیے پہلے ہی سے مستعد ہو گئی۔

”کیا کہہ رہی ہے رپورٹ؟ ویسے تو میں رپورٹ کی تفصیلات تمہارے چہرے سے پڑھ رہا ہوں۔“ ثمر نے سر رگڑنے کا آخری راؤنڈ مکمل کیا اور ٹاول چمن کی طرف بڑھا دیا۔

”پھر بھی آپ پڑھ لیں تو زیادہ اچھا ہے۔“ چمن کو عجیب سی بے تابی لاحق ہو چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ثمر خود اپنی آنکھوں سے پڑھ لے کہ اس کی بیوی ایک مکمل عورت ہے۔ قدرت نے اسے ہر طرح سے نوازا ہے۔

”وہ تو پڑھ ہی لیں گے۔ تمہاری زبانی سننے سے زیادہ اچھا لگے گا۔“ ثمر نے ڈرینک کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش چلانا شروع کیا۔ وہ آئینے میں چمن کو بغور دیکھ رہا تھا جو خوشی سے نہال، شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ گویا خود سے الجھ رہی تھی۔ الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔

”بھئی..... اتنا تکلف! بتا دو ناں کیا لکھا ہے رپورٹ میں؟“ ثمر نے پیشانی پر آنے والے والوں کو دو تین پھونکیں مار کر گویا پھونکوں سے ڈرائیو کا کام لیا۔

”I Am Perfect۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی بھی وقت ماں بن سکتی ہوں۔“

”میں تمہیں کیا کہتا تھا کہ فضول میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ چاہے گا اولاد بھی ہو جائے گی۔“ ثمر برش رکھ کر چمن کے قریب چلا آیا اور اسے شانوں سے تھام لیا۔

چمن نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت پیار سے چمن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چمن کے پاس اگلی بات بہت متنازعہ تھی اسی لیے وہ الفاظ منہ سے نکالنے سے پہلے تول رہی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ آنکھوں میں الجھن کے تاثرات تھے۔

”ارے..... کیا سوچنے لگیں؟ اب کیا مسئلہ ہے۔ خوش رہو، ریلیکس کرو۔“ ثمر نے پیار سے اس کے ہنجرے ہوئے ریشمی بال سنوارے۔

”مسئلہ ہے..... ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے ہیزمینڈ کا بھی میڈیکل چیک اپ کروالیں۔ یہ بہت ضروری ہے، ہو سکتا ہے.....“

”ہو سکتا ہے اس ڈاکٹر کا دماغ خراب ہو۔“ ثمر کو یوں لگا جیسے چمن نے اسے کوئی تنگی گالی دی ہو۔ اس نے چمن کے شانوں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ صاف شفاف آسمان پر اچانک کالی آندھی آنے کے امکانات چھا گئے۔





”ثمر..... یہ پرانے وقتوں میں مردوں کی سوچ ہوا کرتی تھی کہ مرد کو کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ جو کی ہوگی عورت میں ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ لیکن آج میڈیکل سائنس.....“ چمن نے اپنی دانست میں ثمر کو پُر سکون کرنے کی کوشش کی مگر ثمر نے بڑی درشتگی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”جانتے ہیں سب..... ہر مرد کو اپنا پتا ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے جب آپ کو یقین ہے تو ایک ٹیسٹ کرانے میں حرج ہی کیا ہے؟“ چمن بھی آج ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی ورنہ ثمر کے ریش ہونے پر وہ یا تو خاموش ہو جاتی تھی یا دم دبا کر بھاگ جاتی تھی۔ مگر آج وہ اپنی نظر میں بہت معتبر ہو چکی تھی۔ انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

”کیوں کراؤں میں اپنا ٹیسٹ..... کچھ نہیں ہے مجھے۔ ہمیشہ میرے خوشگوار موڈ کا ستیاناس مار دیتی ہو۔ کیا اب گھر آنا چھوڑ دوں؟ تم نے تو جیسے میری چڑ ہی بنالی ہے۔“ ثمر بری طرح برسنے لگا۔

”اچھا آہستہ تو بولیں۔ امی جان سمجھیں گی پتا نہیں کس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔“ چمن نے نرمی سے ثمر کا بازو تھام کر آہستہ آواز میں کہا۔

”نہیں کروں گا آہستہ آواز میں بات، میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ لپیٹ لپیٹ کر گالیاں دیتی ہو مجھے۔ چاہتی ہو میں خود کو تمہارا مجرم سمجھوں۔ تمہاری خوشیوں کا قاتل محسوس کروں۔ تم مجھے فضول کے احساس جرم میں مبتلا کرنا چاہتی ہو۔ چلی جاؤ میرے سامنے سے، اس وقت تمہاری شکل زہر لگ رہی ہے۔ ورنہ میں چلا جاتا ہوں کہیں۔“

”ثمر..... ثمر..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... پلیز ریلیکس..... میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اپنے کسی بھی مسئلے پر کیا بات نہیں کیا کرتے ہیں اور کوئی بھی خوشی صرف میری خوشی نہیں ہو سکتی جب تک اس خوشی میں آپ شریک نہ ہوں، آپ کا حصہ نہ ہو۔ میاں بیوی دھوپ چھاؤں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کیا کریں۔“ چمن کے انداز میں منت مچی۔ اب اسے مزید اندیشے بھی ستارے تھے کہ بانو آ پائیے کی ادنیٰ آواز سن کر دروازے سے کان لگا کر نہ کھڑی ہو گئی ہوں اور ایک محاذ سے گزر کر دوسرے محاذ پر گھمسان کا رن نہ پڑ جائے۔

”ہٹو میرے سامنے سے، پہلے آگ لگاتی ہو پھر معصوم شکل بنا کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“ ثمر اسے ایک طرف دھکیل کر نامکمل جملے کے معنی خیزانگارے اچھالتا بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

چمن کا حال یوں تھا جیسے کسی نے ہیروں تلے زمین کا تختہ کھینچ لیا ہو۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹ کر بیڈ تک گئی اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ وال کلاک کی ٹک اور دل کی دھک دھک کے آہنگ کے ساتھ اسے بانو آ پائے قدموں کی دھمک کا بھی انتظار تھا۔ وہ نئے محاذ کی تیاری کے قابل نہیں تھی۔ سر بری طرح چکرار ہا تھا۔ قدرت کو بالآخر اس پر رحم آ گیا۔

اس نے باہر ثمر کی کار اشارٹ ہونے کی آواز سنی۔ آن واحد میں پورچ تک جانا، پھر کار اشارٹ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ راہ میں ماں بیٹے کی ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً بانو آ پائلڈ پریشر کی ٹیلیٹ لے کر فل A.C چلا کر دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔

اب وہ اُدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت دنوں بعد آج کی اس رات میں ہزار راتوں کے برابر رت جگا ہونا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایمن کی دونوں بچیاں مہوش اور مہ پارہ لاؤنچ میں کھیل رہی تھیں۔ دونوں میں بمشکل ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ دیکھنے میں جڑواں ہی لگتی تھیں۔ کھیلتے کھیلتے اچانک ہی ایک دوسری سے اُلجھ پڑی تھیں۔ چھوٹی مہ پارہ نے کیرم میں اپنی ہار کا بدلہ مہوش کی گڑیا کے بال اکھینز کر لیا تھا جس کے ردِ عمل میں مہوش نے مہ پارہ کے بال نوچ ڈالے تھے۔ وہ درد سے بلبلا کر چیخ پڑی تھی۔ اس سے قبل کہ ایمن کچن سے دوڑتی ان کے پاس آتی حامد حسین سودا سلف لے کر لاؤنچ میں داخل ہو چکے تھے۔

”کیا ہو رہا ہے..... ارے..... رے..... یہ کیا کر رہی ہو؟“ حامد حسین نے مہ پارہ کے بازو میں دانت گاڑتے دیکھ کر غصے سے ٹوکا تھا۔

دادا کی آواز سن کر مہ پارہ ایک دم دبک گئی تھی۔ پھر پڑی مظلوم شکل بنا کر بولی۔
 ”دادا جان مہوش مجھے مار رہی ہے۔ اس نے میرے بال بھی نوچے تھے۔“ اس نے گویا دہائی دی تھی۔
 ”ہیں..... ہیں..... میں نے خود دیکھا تم مہوش کے بازو میں کاٹ رہی تھیں۔ اُلٹا اس پر الزام لگا رہی ہو۔ یہ سکھا رہی ہے تمہیں تمہاری ماں؟ خوب تربیت ہو رہی ہے بھئی شاباش۔“ ایمن سامنے آ گئی تھی۔ حامد حسین یہ سنہری موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا ہی تو وقت تھا۔
 ”مہ پارہ..... چلو اوپر کمرے میں۔ تمہیں بتانی ہوں اچھی طرح۔“ ایمن کے حساب سے یہی بہتر تھا کہ وہ بچپوں کو ان کے دادا کے سامنے سے فوراً لے جائے، اس سے بیشتر حامد حسین مزید زہر افشانی کرتے یا ایمن بچپوں کو لے کر اوپر جاتی ساس صاحبہ کمر پر ہاتھ رکھے باری باری سب کو گھورتی میاں کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔

”ارے کیا ہو گیا۔ کیوں اتنی زور سے چلا رہے ہیں؟“
 ”دشمنوں کی طرح لڑتی ہیں۔ کون کہے گا یہ سگی بہنیں ہیں۔ بچوں کا بھلا کیا تصور، یہ تو ماں کی تربیت ہوتی ہے۔ گیلی مٹی جیسے مرضی ڈھال لو۔“ حامد حسین نے سہی سہی سی ایمن پر ایک بیزار کن نگاہ ڈال کر لاڈلی بیگم کو جواب دیا۔

”ٹھیک بولے آپ! ارے یہ کیا بچوں کی تربیت کریں گی۔ ان کی ماں نے کون سا ان کو نیک تربیت دی۔ زمانے بھر کی ست و کابل، ایک کام بتا دو اور رات تک بھول جاؤ۔ میاں رات کو بارہ بجے گھر آئے گا تو اگلی سے کپڑے اتریں گے تاکہ میاں کو ترس آ جائے کہ بے چاری بیوی رات بارہ بارہ بجے تک گھر کا کام کرتی ہے۔ بس یہ چترائیاں سکھائی ہیں ماں نے۔ سارا دن خوب آرام کرو۔ کام جمع کرو..... جیسے ہی شوہر آ جائے، اس کے سامنے کام کر کے نمبر بناؤ۔“

”رات کو تو کپڑے دیے ہی سیل جاتے ہیں۔ اللہ بخشے ہماری اماں تو مغرب کے وقت کسی کو دھلے کپڑے اتارتے دیکھتی تھیں تو طوفان کھڑا کر دیتی تھیں۔ گھر سے برکت جاتی ہے۔ خارش کے کپڑے الماریوں میں پلنے لگتے ہیں۔ انٹی بائیٹک کھا کھا کر دس پندرہ بیماریاں اور پالنا ہوتی ہیں۔“ حامد حسین نے ہمیشہ کی طرح بیگم کی ہاں

میں ہاں ملانے کی حد ہی کر دی۔

”صرف ایک مرتبہ ہی رات کو اتارے تھے۔ منی خالہ (خلیہ ساس) اپنی بہوؤں کے ساتھ آئی تھیں۔ میں شام تک کچن میں رہی ذہن سے نکل گیا کہ۔“ ایمن نے گھبرا کر وضاحت پیش کرنا چاہی۔ مگر اسے بات مکمل کرنے کوں دیتا۔ ساس صاحبہ چمک کر بولیں۔

”دیکھ رہے ہیں۔۔۔ جتنا رہی ہے کہ سسرالیوں کے لیے دیکھیں دم کرنا پڑتی ہیں۔ ارے ہماری خدمتیں کرتے کرتے اسے گٹھیا ہو گیا ہے۔“ فردوس کی زبان کے آگے تو ویسے ہی خندق کھی شوہر کی شہ پر تو دل کھول کر کالج ٹھنڈا کرتی تھیں۔

ایمن کی آنکھوں میں احساسِ بے بسی سے آنسو چمکنے لگے تھے۔ بچیاں بھی اپنی لڑائی بھول کر ماں کے دانتیں مانتیں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جو بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

”چلو بیٹا۔۔۔ اوپر چلو۔۔۔ اپنا ہوم ورک شروع کرو۔ میں آتی ہوں۔“ اس نے بمشکل گلوگیر آواز میں بچیوں سے کہا۔ جو داد داد کی سخت سست کی وجہ و معنی سمجھنے سے ضرور قاصر تھیں مگر اتنا محسوس کر سکتی تھیں کہ ان کی ماں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔

”اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے بچوں پر ارکا جبین لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے والے یہ تم پر ہے“ فرانس کی بڑبڑاہٹ زہر کی سزا دہشت کے برابر تھی۔

”ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔“ حامد حسین نے لقمہ دیا۔

پندرہ لاکھ " فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بدوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

"ارے کہاں سے لاکھ کا ہمارا بچہ میں لاکھ؟" وہ گویا پتھیاڑیں کھانے لگیں۔

”آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہو گا۔“ حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمین کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمین کو یاؤں اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی قلمدار ہے۔

جسے رب العالمین کہتے ہیں۔

جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔

جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک بلنگی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

”ارے کیا لاکھوں کروڑوں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔ بس کریں۔ اسپتال پہنچ گئی تو لاکھ دو لاکھ ٹھکانے لگ جائیں گے۔ سارے پرائز بانڈز، سیونگ شپ کلیٹ بک جائیں گے۔“ فردوس دہل کر شوہر کو خاموش کر رہی تھیں۔

زینے کے موز پر کم ہونے سے پہلے ایمن سوچ رہی تھی۔ اللہ آپ کے پرائز بانڈز اور شوقیت کو سلامت رکھے جو آپ کو خاموش کرانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آمین

☆.....☆.....☆

ثمر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر Mails چیک کر رہا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ بہت سنجیدہ نوعیت کے معاملے میں الجھا ہوا ہے۔ چمن اس کی یہ مصروفیت دیکھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا، اسے اپنے کپڑے وغیرہ بھی دیکھنے تھے۔ اسے یہ موقع غنیمت لگا تو جا کر اپنا کام نپٹانے لگی۔ اسے عام بہوؤں کی طرح ماں بیٹے کی باتیں کان لگا کر سننے کا ذرہ برابر شوق نہیں تھا۔ بلکہ چار سالوں میں تو بہت کچھ "Under Stood" ہو چکا تھا۔

"ادھر بانو آ پادھر ادھر آتے جاتے جیسے کسی موقع کی تاک میں تھیں۔ شاہ جی سے لایا ہوا تعویذ تو وہ کچن کی کینٹ میں بہت احتیاط سے چھپا چکی تھیں۔ چمن اپنے کمرے میں چلی گئی تو دل کو مزید تقویت پہنچی۔ ثمر اتنا زیادہ مصروف دکھائی دے رہا تھا کہ پاس جا کر چائے پانی پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی مبادا انکار ہی نہ کر دے۔

بلی کے بھاگوں آخر چھینکا ٹوٹ ہی گیا۔ ثمر ملازمہ کو ٹھنڈا پانی لانے کے لیے آواز دے رہا تھا۔ بانو آ پادھر رفتاری سے اس کے قریب جا پہنچیں۔ اس سے پوچھتا کہ اس کی خدمت گزار بیوی آدمی کے۔

"ایک منٹ..... میں لے کر آتی ہوں پانی۔" بانو آ پادھر کی طرف بڑھیں۔

"امی آپ رہنے دیں۔ ساجدہ (ملازمہ) ہے۔ چمن ہے۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟" ثمر نے شرمندہ ہو کر ٹوکا۔

"ارے میرا بچہ صبح سے رات تک جان مارتا ہے۔ کس کے لیے؟ ہمارے لیے ناں، ایک گلاس ٹھنڈا پانی اپنے ہاتھ سے دے دوں گی تو کیا قیامت آجائے گی؟ البتہ میرے کلبے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔" بانو آ پادھر دلار کے موٹی روٹی کچن میں جا رہی تھیں۔ ثمر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"میرا بچہ..... ماں نوے برس کی ہو اور بیٹا ستر برس کا۔ مگر ماں کا بچہ ہی رہے گا۔ وہ شکر گزاری اور محبت کے جذباتوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

آن واحد میں پانی آنے کا اندازہ تھا۔ مگر چند منٹ لگ گئے۔ شاید ٹھنڈا پانی نہیں ہوگا یا زیادہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کیوبز ڈال رہی ہوں گی۔ ثمر نے کچن پر ایک سرسری نگاہ دوڑا کر گلے سے ٹائی اُتار کر بیک پر لٹکا دی۔ واقعہ یہ تھا کہ بانو آ پادھر اپنی بھرپور سلی کرنا چاہتی تھیں کہ تعویذ کی کرامات پوری طرح پانی میں حل ہو کر ثمر کے رگ وریشے میں حلول کر جائیں۔ پلاسٹک کے امپورٹنڈ لی اسپون سے تعویذ پانی میں گھمائے جا رہی تھیں۔

اسٹیل کے چمچ سے تو آواز ہی بہت ہوتی ہے۔ گیلا تعویذ پلاسٹک سے نکال کر دوپٹے کے پلو میں باندھا کیونکہ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق کسی جگہ کچی زمین میں نہایت ادب و احترام سے دفن کرنا تھا۔ شاہ جی کے حساب سے کسی فاقہ کش کی میت کو غسل و کفن نصیب ہونا ہو یہ ان کا "Concern" نہیں تھا مگر ان کے ہاتھ کے لکھے زردے کے رنگ اور کیوڑے (مشک وزعفران نام نہاد) کے مٹ جانے والے ہندسوں کی حیثیت بہت متبرک تھی۔

کمال مصلحتِ مادری سے بیٹے کو پانی پیش کیا۔

”ای آپ تو بس شرمندہ کر دیتی ہیں۔ آخر ساس بہو کو کس لیے لاتی ہے؟“ ثمر نے ہنس کر گلاس تھامتے ہوئے کہا۔

”بہو اس لیے لاتے ہیں کہ دادی چاند سے پوتے کھلائے، شجرہ مضبوط ہو، نسب آگے بڑھے۔“ بانو آ پا بہت خوش قسمت تھیں انہیں دل کی بات کہنے کا موقع جلدی جلدی ملتا رہتا تھا۔ خود سے بات نکال کر بری بننے سے بچ جاتی تھیں۔

”امی جان بس آپ تو....“ ثمر نے آدھا گلاس پانی پی کر رُک کر سانس لیا۔

”میٹا پورا پانی پیو، شور تو ایسے مچا رہے تھے جیسے بہت سخت پیاس لگ رہی ہو۔“ بچا ہوا پانی دیکھ کر بانو آ پا کو اندیشے ستانے لگے۔

”پی رہا ہوں امی..... سانس لے رہا ہوں۔ آپ ہی نے تو سکھایا ہے کہ تین سانس میں پانی پیتے ہیں تو ثواب ملتا ہے۔ ثمر نے ہنس کر کہا اور پھر گلاس منہ سے لگا لیا۔ عجب طرح کی مسرت کے احساس سے بانو آ پا بھیگ بھیگ گئیں۔

”ماں داری جائے اور میرے بیٹے کو نظر بد سے بچائے۔“ ثمر نے گلاس خالی کر کے ان کو واپس کرتے ہوئے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام کر چوم لیا۔ بانو آ پا نہال ہو گئیں۔ انہوں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے ادھر ادھر کن انکھیوں سے دیکھا مبادا کہیں چمن کھڑی نظر آ جائے۔ کاش وہ دیکھ لیتی کہ ثمر اپنی ماں سے کتنا پیار کرتا ہے۔

”تین تعویذوں کی مار ہے..... ثمر کی دوسری شادی تو پکی.....“

بانو آ پا کو گھر کے چار اطراف سے نئی بہو کی پازیب کی چھن چھن سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ لگا کر دوپٹے میں لپی گرہ کو چھوا، گیلا کا غذا اپنی جگہ موجود تھا۔ جس کی تدفین کا عمل باقی تھا۔

☆.....☆.....☆

یاور سر جھکائے ماں باپ کے بیڈروم میں بیٹھا ماں باپ سے بیوی کی لن ترانیوں، بدزبانوں کے تذکرے سن رہا تھا۔

”یار اب تو حد ہو گئی ہے۔ بہت بدزبان اور چڑچڑی ہو گئی ہے۔ سیدھی بات کرو تو الٹا جواب دیتی ہے۔“

”تھوڑا سا صبر کر لیں ابا جان! چند مہینوں کی بات ہے، پھر دیکھتے ہیں۔“

”ارے تم کیا دیکھو گے! میں نے تو لڑکیاں دیکھنی شروع کر دی ہیں۔“ فردوس نے بیٹے کی بات کاٹ کر چمک کر کہا۔ یاور نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

”لڑکیاں.....؟“ پھر طنزیہ مسکرایا۔ ”گھر میں بارش کی طرح برساتو شروع ہو گئی ہیں لڑکیاں..... بیٹھی دیکھتی رہیں۔“

”یہ برسات دیکھیں گے لڑکیوں کے نانائانی، خوب یاد دلایا۔ ارے اس کا الٹرا ساؤنڈ کروا کر پتا تو کراؤ، اس بار بھی کہیں.....“ فردوس جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ جیسے شوہر کی طرف سے بھی کچھ سننا چاہتی ہوں، جو درحقیقت بیٹے ہی کو سنانا تھا۔

”اچھا ہوا تم نے بات بچ میں روک لی۔ بدشگونی کی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔“ حامد حسین نے بیوی

سے آف موڈ میں کہا اور یاور کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

”تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پہلی فرصت میں اس کا الٹرا ساؤنڈ کراؤ۔ اگر لڑکی ہے تو ہمارے سات سلام پہنچا کر ماں کے گھر چھوڑ آؤ۔ ویسے بھی دو بیٹیاں پیادہ کر فارغ بیٹھے ہیں۔ دونوں کا خرچہ ہی کیا ہے۔ 65 ہزار پٹشن آرہی ہے مشکور احمد کی۔ بیٹی کو چار چھ مہینے پاس رہیں، ڈلیوری کا خرچہ اٹھائیں۔“

”اور نہیں تو کیا! بیٹی بیٹیاں پیدا کر رہی ہے۔ نرے خرچے ہی خرچے خود تو تین کروڑ کی کوٹھی میں جنت بنائے بیٹھے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں بیٹیوں کو ترکہ تو ملنے سے رہا۔ اللہ جانے کب مریں، صحت تو دونوں کی بہت اچھی ہے۔ لگتا تو یہی ہے قیامت کے پورے کمیشن گے۔ ہماری طرح تھوڑا ہی ہیں۔ ستر روگ لگے ہوئے ہیں جان..... کو..... نہ ڈھنگ سے کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں۔“

فردوس نے بھی جی بھر کر دل کی بھڑاس نکالی۔ یاور آسانی سے ہاتھ ہی کہاں لگتا تھا۔ گورنمنٹ جاب سے فارغ ہو کر ایک پرائیویٹ فرم میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ گھر آتے آتے رات کے دس گیارہ بج جاتے تھے۔ اس وقت تک حامد حسین اور فردوس ٹھنکی بھر دوایاں پھاٹک کر محو ستراحت ہو چکے ہوتے تھے۔ البتہ ہفتہ اتوار یاور کی چھٹی ہوتی تھی جو وہ سوسو کر گزارتا تھا اور دونوں گھات لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ جیسے ہی وہ سامنے پڑتا بڑی ترکیب سے حصار میں لے کر بیٹھ جاتے۔ پہلے اس کی صحت پر تشویش کا اظہار ہوتا پھر رشتے کی بھینچوں، بھانجوں کے سسرالی رشتے داروں کے رشتے داروں کے ہاں پیدا ہونے والے چاند سے بیٹوں کا ذکر کیا جاتا۔ پھر انتہائی غم تاک انداز میں اپنی محرومیوں کا ذکر ہوتا۔ اپنی بد نصیبی کا ذکر کرتے ہوئے آواز گلوگیر ہو جاتی۔ پھر رندمی ہوئی آواز میں بیٹے سے ہریرہ یا ہریرہ کھانے کی بابت دریافت کیا جاتا۔ اس خیال کے پیش نظر مبادا بیٹا یہ سمجھے کہ ماں کو رونے سنانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ اسے یہ بھی احساس ہو کہ انتہائی توانائی بخش تغذیہ کا اہتمام بھی بس ماں ہی کر سکتی ہے۔ بیوی تو بس شوہر کا مال اڑانے اور ہڈ حرامی کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

یاور کے اعصاب شل ہونے لگے۔ دو دونوں کر یوں کو بھگتا کر ماں باپ کی بے ٹکان گفتگو مرے پر سوڈرے کے مثل ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سرد ہاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے..... میں بات کرتا ہوں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کل لے جاؤں گا اسے الٹرا ساؤنڈ کے لیے۔“ وہ بڑھال سے انداز میں آگے بڑھا، فردوس نے ترحم آمیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”کتنا کمزور ہو گیا ہے میرا بچہ..... یا اللہ! اس کو اپنی جناب سے مضبوط بازو عطا فرما، آمین۔“ دعا با آواز بلند اور آئین سر بلند تھا۔

”اللہ تو سنتا ہی ہے۔ بیٹے کو بھی سننا چاہیے۔“

☆.....☆.....☆

عطیہ بیگم گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے معمول کی تسبیحات میں مصروف تھیں۔ کال بیل کی آواز نے چونکا کر رکھ دیا۔ بے اختیار نظر وال کلاک کی طرف اٹھیں۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

”اس وقت کون آ گیا؟“ وہ سوچتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ مشکور حسین کافی دیر ہوئی سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے۔ ٹھکر چہرے سے جھلکنے لگا۔ وہ بڑی تیز چلتی ہوئی انٹرکام تک آئی تھیں۔

”کون؟“ محتاط انداز تھا۔

”امی..... میں ایمن۔“ ایمن کی آواز انٹرکام کے ایئر پیس میں گونجی تو ہفت آسمان گھومتے دکھائی دیے۔
”ایمن! اس وقت۔“ وہ گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے پریشان گن کیفیت میں سوچ رہی تھیں۔ گیٹ دا
ہوا۔ سامنے ایمن مہوش و مہ پارہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بڑی سی سیاہ چادر میں لٹی دونوں بچیاں دائیں بائیں
کھڑی نانی کو بہت مسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم امی!“ ایمن میں ماں سے نظر ملانے کا یار اندہ تھا۔

”وعلیکم السلام! تم اس وقت اکیلی..... یا اور ساتھ نہیں ہے؟“

”امی اندر تو آنے دیں۔ یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ پوچھ لیں گی؟“ ایمن کے انداز میں عجیب بے کسی
تھی۔ جو ماں کا کلیجہ شق کرنے کے لیے کافی تھی۔

”ارے..... آؤ آؤ..... میں تو یوں اچانک اتنی رات کو تمہیں سامنے پا کر حواس باختہ سی ہو گئی۔“ عطیہ بیگم
نے ایک طرف ہو کر ماں بیٹیوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

ایمن بچیوں کے ساتھ اندر آ گئی تو عطیہ بیگم نے گیٹ بند کر دیا۔ ایمن اب ایک بیگ تقریباً کھینچتی ہوئی اندر
بڑھ رہی تھی۔ بچیوں نے دائیں بائیں ہو کر نانی کے ہاتھ تھام لیے۔

”پاپا کہاں ہیں بیٹا؟ کیسے آئی ہو آپ؟“ عطیہ بیگم کا دل اندیشوں نے لرزا کر رکھا ہوا تھا۔

”نانو ہم ٹیکسی سے آئے ہیں۔ پاپا تو گھر پر نہیں تھے، اس لیے ہم خود ہی آ گئے۔ ماما کہہ رہی تھیں نانو کو
سر پر اتر دیں گے۔“ بڑی بچی مہوش نے بڑے جوش و خروش سے جواب دیا تھا۔

”یاور گھر پر نہیں تھا..... ایمن اسے بتائے بغیر آئی ہے۔“ سوالات ذہن میں کلبلانے لگے۔

وہ بچیوں کے ساتھ بوجھل قدموں سے لڑاؤنچ میں داخل ہوئیں تو ایمن بھاری بھر کم صوفے میں دھنسی ہوئی
گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔ تیسری پریلیٹنسی تھی۔ ساتواں مہینہ ختم ہو کر آٹھواں لگا تھا۔ ذرا سا چلتی تھی تو
ہانپنے لگی تھی، شدید دہنی دباؤ، غیر متوازن اور بہت کم مقدار میں غذا لے رہی تھی اس لیے کمزوری بھی دن بدن
بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں کو سامنے پا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”ایمن یاور کو بتا کر آئی ہو؟“

”نہیں۔“ خوف میں لپٹے سوال کا جواب بڑی بے خوفی سے ملا۔ عطیہ بیگم نے دل کر دایاں ہاتھ اپنے سینے

پر رکھ لیا۔

”لڑ کر آئی ہو؟“ ماں کی آواز شکستگی کے آخری مرحلے کو چھو رہی تھی۔

”لڑنے کی تو ہمت ہی نہیں امی۔ بس خاموشی سے مر جانے کو جی چاہتا ہے۔“

”خبردار..... اس حالت میں اچھی اچھی دعائیں مانگتے ہیں اور بچیوں کے سامنے یہ اول فول بک رہی ہو۔“

عطیہ بیگم نے دکھ اور صدمے کی کیفیت میں تقریباً ڈانٹا تھا۔

ایمن نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

یاور ہکا بکا خالی بیڈروم کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرے میں ہر چیز بڑی بے ترتیب تھی۔ بچیوں کے کپڑے، ایمن

اختلاف

ایک بہت بڑا کہانی کار تھا 'Aesop' وہ لکھتا ہے کہ ایک سڑک پر اسلحہ سے لیس کھڑا سوار آ جا رہا ہے۔ سڑک پر ایک دو طرفہ بورڈ آویزاں تھا۔ دفعتاً ایک سوراخ اس بورڈ کو دیکھ کر رُک گیا۔ وہ بولا۔ "واہ! کیسا خوبصورت نیلے رنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔" سڑک کی دوسری جانب سے ایک اور سوراخ آ گیا۔ بولا۔ "واقعی بہت خوبصورت بورڈ ہے مگر رنگ تو سرخ ہے۔" پہلا سوراخ بولا۔ "ہم کہتے ہیں کہ اس کا رنگ نیلا ہے۔" دوسرے نے کہا کہ اس کا رنگ سرخ ہے۔ پہلے نے کہا "تم ہماری تو جین کر رہے ہو۔ نکالو تلوار۔" دونوں سوراخوں نے تلوار نکال لیں اور ڈوول (لڑنے) کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنے میں ایک سیانا بورڈ ہا موش پر آ پہنچا۔ بولا "بھائیو کس بات پر ڈوول لڑنے لگے ہو؟" پہلے سوراخ نے کہا۔ "اس شخص نے ہماری تو جین کی ہے۔" "کیسے؟" "بورڈ ہے" پوچھا۔ "ہم کہتے ہیں یہ بورڈ سڑک پر آویزاں ہے نیلے رنگ کا ہے جبکہ یہ کہتے ہیں اس کا رنگ سرخ ہے۔" "بورڈ ہا بولا۔" "آؤ دیکھیں کہ بورڈ کا کیا رنگ ہے؟" انہوں نے دیکھا کہ بورڈ پر ایک طرف نیلا رنگ ہے اور ایک طرف سرخ۔ آج بھی دنیا میں ڈیڑھ سیکڑے اسی بات پر ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "بورڈ نیلا ہے۔" دوسرا کہتا ہے "بورڈ سرخ ہے۔"

(ممتاز مفتی کی تصنیف 'تلاش' سے ایک اقتباس) انتخاب: روبینہ شاہین، کراچی

کاہل، پونہ، واشی روم، سلپرز، ٹائل، کھلونے، ٹیکے، لشن، آرٹ پیڈز، طرز، برش، پونی، جیجر برش غرض کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ کئی آوازیں بھی دے ڈالی تھیں مگر جواب میں دل دھڑکانے والی لامحدود خاموشی تھی۔ پھر اس کی نظر بینڈ پر پڑے ہوئے ایمن کے موبائل پر پڑی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور موبائل اٹھا لیا۔ "کہاں گئی ہے؟ موبائل بھی چھوڑ گئی یا بھول گئی۔ اس وقت کہاں جا سکتی ہے۔ امی جان کو بغیر بتائے گئی ہے، ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتی۔ ایک گھنٹے سے تو ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔" وہ سوچنے لگا، اُلجھنے لگا۔ ایمن کی آج کل جو حالت تھی اس کے پیش نظر وہ بہت جلدی سمجھ گیا کہ وہ اتنی رات کو کہاں جا سکتی ہے۔ اور یہ کہ اس بات سے اس کے والدین لاعلم ہیں۔ جس کا سیدھا سیدھا مطلب ہے وہ غصے یا ناراضگی کی کیفیت میں بچیوں کو ساتھ لے کر گئی ہے۔ یہ یقین روح میں اترتا تو خون جیسے کھولنے لگا۔ "میرے ماں باپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اس عورت میں بلا کی ہٹ دھرمی ہے۔ ضرور یہ میرے ماں باپ سے زبان درازی کرتی ہوگی۔ شکل سے کتنی مظلوم لگتی ہے۔ جو عورت اتنے دھڑلے سے رات کو اس حالت میں گھر سے نکل جائے وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔" یادِ غم و غصے کی کیفیت میں کھڑا مٹھیاں بیچ رہا تھا۔ "ارے میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی عورت پر، جس کو اپنی شکل پر اتنا گھمنڈ ہو اور اس کے پاس ہے ہی کیا، امی ٹھیک کہتی ہیں۔"

ایمن نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ ساس صاحبہ کی پروگریس رپورٹ مضبوط ہو رہی تھی۔ وہ میرٹ پر پاس ہو رہی تھیں۔

یادِ کچھ دیر تک اپنی سانسوں کو کنٹرول کرتا رہا، خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اب اسے پھر ایک محاذ کا سامنا تھا۔

جا کر ماں باپ کو بتانا تھا کہ ایمن بچیوں کو لے کر چلی گئی ہے اور جب عورت بچے لے کر خاموشی سے گھر سے نکل جائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

☆.....☆.....☆

”امی..... میں سچ کہہ رہی ہوں اب اُس گھر میں ایک پل گزارنا بھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی بیمار بستر پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہو۔“ ایمن سسکیاں لیتے بول رہی تھی اور عطیہ بیگم سکتے کی کیفیت میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سُن رہی تھیں مگر گویائی کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ تیسری مرتبہ ماں بننے جا رہی تھی۔ تین بچیوں کے ساتھ پہاڑی جوانی، اتنی اندھیری رات میں اس گھر کو چھوڑ کر آنے کا مقصد واضح تھا۔

”بیٹا تمہیں بہر حال اس طرح ان کو بتائے بغیر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ بھی بے وقت۔“ وہ بمشکل گویا ہوئیں۔

ایمن نے آنسو بھری آنکھوں سے ان کی سمت دیکھا۔

”بے وقت.....؟ وقت تو ٹھہر گیا ہے امی..... ایک لمحہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے..... وہاں ہر آنکھ میں میرے لیے نفرت، بے زاری اور اجنبیت ہے۔ ایسے ماحول میں کب تک رہا جاسکتا ہے۔ مجھے تو چھوڑیں، یہ بچیاں تو ان کا اپنا خون ہیں۔ مگر ان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے اگر آپ دیکھ لیں تو خود ہنس دیاں گے۔“ اتنا کہہ کر ایمن پھوٹ پھوٹ کر نئے سرے سے رونے لگی۔ عطیہ بیگم کے کلبجے پر گویا آری سی چلنے لگی، بے اختیار ایمن کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”یاور کو تو بتایا ہوگا؟“ وہ کر بناک لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”نہیں..... وہ آج در سے گھر آئے ہوں گے۔ میں ان کے آنے سے پہلے ہی نکل آئی۔ اگر وہ آجاتے تو میں اس گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔“ ایمن نے دوٹو سے آنسو پونچھتے ہوئے سسکیاں دبا کر جواب دیا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یاور کو بتائے بغیر تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بیٹا ان باتوں سے شوہر کے دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہے۔“

”چھوڑیں امی..... یاور نہ شوہر ہیں نہ باپ، وہ صرف اپنی ماں کے بیٹے ہیں جو فرشتہ ہیں، گناہ نہ کر آئی ہیں۔ کبھی غلطی نہیں کر سکتیں۔“ ایمن نے بڑی محنت سے جواب دیا تھا۔

”بری بات بیٹا! میاں بیوی کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا۔ مگر ان بچیوں کا تو وہ باپ ہے۔ یہ تو اس کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ماں کا تو دوسرا نام ہی قربانی ہے۔ تمہیں بس ان بچیوں کی طرف دیکھنا چاہیے۔ ایک دن ان بچیوں کی وجہ ہی سے اس کی نظر میں تمہاری اہمیت ہوگی۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ عطیہ بیگم نے ایمن کو بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

وہ جو کچھ محسوس کر سکتی تھیں، اندازے لگا سکتی تھیں، ایمن ابھی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کیونکہ تجربہ سب سے بڑا استاد ہے۔ وہ جانتی تھیں کہ طلاق یافتہ جوان عورت، جس کا بیٹیوں کا ساتھ ہو اس معاشرے میں کس طرح جیتی ہے۔ پورا معاشرہ ہی ظالم سسرال بن جاتا ہے۔ وہ بیٹی کو عزت سے رہنے کا ہنر بتا رہی تھیں۔

”یہ دنیا تو ویسے بھی مشقت گاہ ہے، جو آسمان سے گرتا ہے مجبور میں اٹک جاتا ہے۔ کیوں نہ پھر عزت کی بھاری قیمت چکا کر قید ہا مشقت کی میعادِ مکمل کی جائے۔“

”امی آپ چاہتی ہیں میں مر کر وہاں سے نکلوں؟“ ایمن ہلکے ہلکے کر رو پڑی۔ عطیہ بیگم دل کر رہ گئیں۔

”بیٹا! تم بھی ماں ہو۔ ماں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ماں تو اولاد کی زندگی و خوش بختی کی دعائیں مانگتے نہیں سکتی۔“ بولتے بولتے عطیہ بیگم کی آواز بھرانے لگی۔ وہ بڑے مضبوط سے کام لے رہی تھیں۔ مقصد عظیم ہو تو حوصلہ بھی بڑا درکار ہوتا ہے۔ بیٹی کے مضبوط مستقبل سے زیادہ ایک ماں کے نزدیک عظیم مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ ایمن کے سر پر تھا۔ بمشکل آنسو روک رہی تھیں۔

”اچھا چلو..... پہلے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھاپی لو۔ بچیاں بھی بھوکی ہوں گی۔ جن حالات میں تم گھر سے نکلی ہو ان حالات میں کس سے کھایا پیا جاتا ہے۔ چلو اٹھو شاہاش..... صبح بات کرتے ہیں۔ تمہارے ابا جان یاد رہے خود بات کریں گے۔ مجھے تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو بیٹا..... دیکھو بچیاں کیسی بھی ہوئی تمہاری طرف دیکھ رہی ہیں۔“ عطیہ بیگم نے ون پیس صوفے میں پھنسی پھنسی بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا تھا۔ جو درحقیقت اپنی ماں کو مسلسل آنسو بہاتے دیکھ کر پتھر کے بت کی مانند محسوس ہو رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”اے بے..... کم بخت بھاگ گئی، دیکھ لیا۔ شکل سے کتنی معصوم لگتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی، حوصلہ دیکھو، ارے یاد رہے! میرے بچے کلنک کا ٹیکہ جگ گیا ہمارے ماتھے پر۔“ فردوس مگر مجھ کے آنسو بہاتے ہوئے رانوں کو پیٹ پیٹ کر دہائی دے رہی تھیں۔

”امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کہاں گئی ہوگی؟ ظاہر ہے ماں کے گھر گئی ہوگی۔“ یاد رہے اعصاب میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کسی خوفناک تصور سے پاگل ہوتا۔ حامد حسین زخمی ناگ کی طرح بل کھاتے ہوئے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

”ارے ہمارے بچے بھی لے گئی۔ اپنے باپ کے گھر سے لائی تھی کیا؟“ فردوس نے پھر دہائی دی اور اب اپنا سر پیٹنے لگیں۔

”میں خوب سمجھ رہا ہوں، وہ ہمیں نچاؤ کھانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ مگر کیا کریں دو مہینے تو ہمیں صبر کرنا ہی ہے۔“ حامد حسین اندر کا اشتعال بمشکل کنٹرول کر پارے تھے۔

”اب کیا فائدہ صبر کرنے کا، ہماری مال و متاع تو ساتھ لے گئی۔“ فردوس ابھی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھیں۔

”اگر وہ چار سو بیس ہے تو ہم اسے آٹھ سو چالیس بن کر دکھائیں گے۔ تم ذرا آسرا تو کرو۔ مجھے اور یاد رکھو بھی پاگل کسے دے رہی ہو۔ کچھ سونے تو دو۔“ حامد حسین کے انداز میں اب جھلاہٹ سی تھی۔

”کہہ رہا ہے بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھ دیے۔ ارے مجھ پر کیوں غصہ ہو رہے ہیں۔ میں تو آپ کے جانشین کی ماں ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر کبھی سبزی لینے نہیں گئی۔ دفتر جاتے تھے تو اپنے ہاتھوں سے جوتے پہناتی تھی۔ یاد رکھو سوتے سے اٹھاتی تھی کہ باپ کو سلام کرو۔ خود بھی عزت کی اولاد سے بھی کرائی۔ اُس کلمو ہی کے پیچھے مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔“ فردوس نے اب نیا فساد مچا دیا۔ ایسا واویلا کیا کہ حامد حسین کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ لگے بیگم کو بچوں کی طرح چکارنے۔

”بھاگو ان میں تو تمہاری پریشانی دور کرنے کی فکر میں ہوں۔ ٹینشن سے تمہارے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ سب بھاڑ میں جائیں، مجھے تو بس تمہاری فکر ہے۔“ پھر یاد رہے گویا ہوئے۔

”میں تمہاری ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے زندگی بھر میری خدمت کی ہے۔ میری اجازت کے بغیر کبھی دلہیز پار نہیں کی۔ تمہاری نانی کا انتقال ہوا تو میں پنڈی میں تھا۔ جب تک میں گھر نہیں آ گیا یہ اپنی مری ماں کا منہ دیکھنے نہیں گئی۔ میں رات کو بارہ ایک بجے ڈیوٹی سے آتا تو یہ میرے انتظار میں بھوکے بیٹھی رہتی تھی۔ ارے میں اس عورت کی کیا کیا خوبیاں گنواؤں۔ تم خوش نصیب ہو جو ایسی ماں ملی ہے۔“

فردوس کے آنسو تھم گئے۔ شوہر نے قصیدہ پڑھا تو بچے موتیوں کے ہار یاد آ گئے۔ پرانے وقتوں میں بادشاہ قصیدہ سننے کے بعد موتیوں کا ہار گلے میں ڈالتے تھے۔ شوہر پر ایسا نوٹ کر پیار آیا کہ جوان بیٹا سامنے نہ ہوتا تو اپنی بانہوں کا ہار ہی اُن کے گلے میں ڈال دیتیں۔

”بس یہ پہاڑی رات گزرنے دو۔ ارے تمہارے قدموں میں لا کر بٹھاؤں گا۔ معافی مانگے گی تم سے۔“

”ارے بس کریں..... بھاگ گئی وہ اب نہیں آنے کی۔“ فردوس کو اچھے گمان آنا بند ہو چکے تھے۔ اپنی کار گزاری جو مد نظر تھی۔

”میں کون سا اسے کھینچ کر لاؤں گا، ایسی ترکیب لڑاؤں گا سر کے بل آئے گی۔“ پھر بیٹے کو سنانے کو بولے جیسے جلتی پر تیل چھڑک رہے ہوں۔

”جس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شادیاں بھجوا کر لاتے ہیں وہ بہو ہوتی ہے اور بھاگی ہوئی بھگوڑی کنیر ہوتی ہے۔ اب دیکھنا تم..... یاور کی غیرت کا سوال ہے۔“ شوہر کے منہ سے طفل تسلیاں سننے ہوئے فردوس نے یاور کی طرف دیکھا جو سر جھکائے گہری سوچ میں متغرق تھا۔ آنے والے دنوں میں ایمن کی درست بننے کے خیال سے ہی کلیجے میں ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔ پھر Wind Up ضروری تھا۔

”ارے میرا چاند سا پوتا ساتھ لے گئی، قرار کیسے آئے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں امی! ابھی تو وہ الٹرا ساؤنڈ کرانے پر ہی تیار نہیں اور آپ پوتے کے خواب دیکھ رہی ہیں؟“ یاور ذہنی دباؤ کی وجہ سے جھلا کر بولا۔

”تمہاری ماں کو بچے خواب آتے ہیں۔ کسی فرشتے نے فوٹو دکھائی ہوگی۔ میں تو سات مہینوں سے بس پوتا پوتا سن رہا ہوں۔“ حامد حسین نے بیگم کے چہرے پر گمشدہ مسکراہٹ دیکھنے کے جتن کیے۔ رات پڑی تھی، انہیں روتی دھونی بیگم کے پہلو میں سونے کی عادت تھی۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی ہری ہری سوچنے لگی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اور کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ بڑی سخت مجبوری تھی، بیگم کا موڈ خوشگوار بنانا بہت ضروری تھا۔

☆.....☆.....☆

”امی..... کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ چمن کے کان سے موبائل لگا تھا۔ ”ایمن آپا اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آ گئی ہیں؟“ چمن نے چند لمحے دم لے کر پھر بے ساختہ انداز میں سوال کیا۔ خبر پر حیرت تو ہرگز نہیں تھی مگر صدمہ تو تھا۔ اسے پتا تھا کہ ایمن اس وقت تیسری پریکٹس کے کٹھن وقت سے گزر رہی ہے۔

ایسے وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اپنی ساری ریاضتوں پر پانی پھیر دینے کے مترادف تھا۔

”ساری رات نیند نہیں آئی۔ وہ تو شکر ہے کہ تمہارے پاپا میڈیسن کی وجہ سے گہری نیند سو جاتے ہیں ورنہ ایمن کا حال دیکھ کر تو ان کی طبیعت بگڑ جاتی۔“ عطیہ بیگم اعصاب شکن رات کاٹنے کے بعد نہایت پڑمردہ، نڈھال لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مشکور احمد کو انہوں نے فجر کے وقت بس اتنا بتایا تھا کہ رات ایمن بچیوں کے

ساتھ آگئی تھی۔ دو چار دن ر کے گی۔ آنکھ کھلتے ہی ہارٹ چینٹ شوہر کو Stress دینا نہیں چاہتی تھیں۔ دل کی بے کلی سے عاجز آ کر یہی سوچ بھی کہ چمن سے فون پر باتیں کر کے خود کو قدرے ہلکا کر لیں۔ یوں بھی چمن کا تاثر بچپن سے کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ گویا اپنی اعصاب کی مالک ہے۔ آسانی سے ہار نہیں مانتی۔ ایک لگانے والے کو دو لگانے کا فارمولا بہت پسند کرتی ہے۔

مشکور احمد اپنی اس خود اعتماد، صاف گو، باہمت بیٹی پر بہت فخر کرتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ چمن جیسی بیٹی پا کر کبھی بیٹے کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا اور آج کل کے بیٹے یا تو باہر چلے جاتے ہیں یا بیویوں کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ چمن جیسی بیٹی تو نعمت بھی ہوتی ہے اور رحمت بھی۔

عطیہ بیگم بھی شوہر کے خیالات سے اختلاف نہیں کرتی تھیں البتہ یہ ضرور کہتی تھیں کہ بیٹا کہنے سے بیٹی بیٹا نہیں بن جاتی۔ آخر عورت ہی ہوتی ہے۔ ششے جیسا دل رکھتی ہے۔ اور بلور جیسی آبرو۔۔۔۔۔

مگر آج صبح سویرے جب چہار سو ادا سی اور مایوسی بال کھول کر تاپنے لگی تو بے اختیار جی چاہا چمن سے حوصلہ اور اُمید کی تازہ کمک حاصل کی جائے۔ کیونکہ وہ کبھی ہتھیار ڈالنے اور منگی رویوں کی آبیاری کرنے کی باتیں نہیں کرتی تھی۔ بہت مدلل، پُر اُمید، آخری ہتھیار ٹوٹ جانے تک مقابلہ کرنے کی باتیں کرتی تھی۔ پڑ مردہ انسان میں نئی روح پھونکنے کی صلاحیت ودیعت شدہ تھی۔

”بیٹا اُس کی جو حالت ہے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اگر وہ جذبات میں آ کر اس گھر سے نکل آئی ہے تو اب میں اس کی جان چھڑاؤں گی۔ اس جہنم میں دوبارہ نہیں بھیجوں گی۔“ عطیہ بیگم کی آواز بھرانے لگی۔

”امی..... امی..... خود کو سنبھالیں..... ایمن آپا تو اس وقت پریشان ہیں، کچھ بھی الٹا سیدھا کر جائیں تو حیرت نہیں۔ مگر آپ تو.....“

”بس چھوڑو..... رات میں نے بھی اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر رات بھر جاگ کر جب اس کی حالت پر غور کیا تو یہی سمجھ میں آیا۔ دنیا میں بھرم بنانے کے لیے اپنی اولاد کو دن رات تڑپا دیکھوں۔ ہماری بیٹی کی بات تو چھوڑو اس ظالم کو تو اپنی بیٹیوں کا احساس نہیں۔ ذرا تم آ کر ان معصوم بچیوں کی باتیں تو سنو۔“ عطیہ بیگم اب ضبط نہ کر سکیں رونے لگیں۔

چمن بری طرح پریشان ہوگئی۔ معاملہ نہایت حساس اور سنجیدہ نوعیت کا تھا۔ وہ خود ایک کڑے امتحان سے گزر رہی تھی مگر ماں باپ، بہن کو بھنک نہیں پڑنے دیتی تھی۔ یہ الگ بات کہ اسے اپنے شوہر کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا جبکہ ایمن کا شوہر اپنے والدین کی ڈگڈگی پر ناچتا تھا۔

”آپ ریلیکس کریں امی..... ثمر آفس چلے جائیں تو میں آتی ہوں آپ کے پاس۔ ایمن آپا کیا کر رہی ہیں اس وقت؟“

”سورہی ہے..... ہائے کاش تم دیکھ سکو ایسے سورہی ہے جیسے سالوں بعد سکون کی غیند ملی ہو۔ میں نے رات اسے کہہ دیا تھا کہ میں بچیوں کو لے کر سو جاؤں گی، تم اپنی نیند پوری کرو۔ بچیوں کی فکر میں اٹھنے کی ضرورت نہیں۔“ عطیہ بیگم آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”ہاں خیر! ٹھکی ہوئی تو بہت ہوں گی۔ وہاں سارا گھرا کیلے ہی تو سنبھالتی ہیں اور شوہر کے نخرے..... تو بہ..... فردوس آنٹی کا ایک بیٹا گیارہ بیٹوں کے برابر ہے۔“ چمن نے اب قدرے شگفتہ انداز میں بات کر کے

ماں کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

وہ فون لے کر لابی میں چلی آئی تھی شرداش روم میں تھا۔ کسی بھی لمحے باہر آ کر فون کی بابت پوچھ سکتا تھا۔ وہ صبح اپنے مسائل پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ماں سے بات کرتے کرتے ایک خیال پریشان کرنے لگا۔ ”کہیں اُس کی اپنی سائس تو کسی دیوار سے کان لگا کر نہیں سُن رہیں؟“

”ٹھیک ہے امی..... میں آتی ہوں۔ بس آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ حافظ۔“ اس نے جلدی سے موبائل آف کر کے ادھر ادھر دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا پڑی۔

ماں..... کسی وقت دل چاہتا ہے کہ آپ کو یہ شعر سنائیں۔

کسی کی آنکھ جو مَنم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو علم نہیں ہے

☆.....☆.....☆

”دیکھ لو..... دن چڑھ گیا۔ ادھر سے کوئی فون نہیں آیا۔ یہی پوچھ لیتے کہ ایمن یہاں پہنچی بھی کہ نہیں ارے اپنی بچیوں ہی کی فکر کرتے..... سوچ لو..... یہ کیسے وقت کاٹ رہی ہے۔“

چمن جیسے ہی سکے پہنچی ماں نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کی۔ ایمن نڈھال سی ماں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چمن کا دل اگرچہ اسے دیکھ کر بہت کڑھ رہا تھا۔ تاہم پھر بھی اس نے حوصلہ دلانے والے انداز میں بات کی۔

”آپا..... مرنے سے پہلے تو کوئی نہیں مرتا۔ البتہ زندہ لاش بن جاتے ہیں۔ آپ کی دو بیٹیاں ہیں۔ ماما کی قوت کو اپنی طاقت بنائیں۔ ماں بن جانے کے بعد عورت کو بھول جانا چاہیے کہ اس کی بھی کوئی ذات ہے۔ اسے صرف اپنے بچوں کی بہتری کے لیے سوچنا اور عمل کرنا چاہیے۔“

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی چمن..... میں کیا کروں۔ یاد رہی مجھے سمجھنے کی کوشش کرتے تو میں ان کے ماں باپ کی ساری سختیاں برداشت کر لیتی یا کم از کم وہ اپنی اولاد کو تو وہ توجہ دیا دیتے جو ان کا پیدائشی حق ہے۔“ ایمن نے دل شکستہ انداز میں چمن کو جواب دیا۔

”میں امی کی طرح آپ سے یہ نہیں کہوں گی کہ آپ ظلم پر سمجھوتا کر لیں۔ اب آگئی ہیں تو آرام سے رہیں۔ دیکھتے ہیں کیا کرتے ہیں وہ لوگ؟“ چمن نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میرا آرام میرے والدین کی تکلیف بن جائے گا..... بوجھ بن جاؤں گی اُن پر۔“ ایمن نے رندمی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ پڑھی لکھی ہیں۔ بے شمار عورتیں مرد کے بغیر زندگی گزارتی ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے دن رات جان کھپاتی ہیں۔ کیوں اتنی کم ہمت بن رہی ہیں؟ مت کریں یہ مایوسی کی باتیں۔“ چمن نے ایمن کو مزید بے چارگی طاری کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔

”میں اس مفلوج ذہن کے ساتھ کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوں۔ مر جاؤں تو جان چھوٹے۔“ اب ایمن رو پڑی تھی۔ چمن نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈپریشن کی اس کیفیت کو باتوں سے کنٹرول کرنا ناممکن تھا۔ جتنی بڑی تکلیف ہوتی ہے دوا بھی اتنی ہی ہائی پرائس کی درکار ہوتی ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ

ایمن کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے مزید بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔
 ”آپ فی الحال اس گھر سے اپنا ذہن بالکل ہٹالیں۔ یاور بھائی کے فون کا بھی انتظار نہ کریں۔ اس گھر میں سکھ ہے۔ امن ہے پیار ہے۔ یہاں تو کھل کر سانس لیں۔“ چمن اٹھ کر ایمن کے قریب آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ بہت پیار سے تھام لیا۔

”یہ کڑوا گھونٹ ہے ایمن، ہمیں پینا ہی پڑے گا۔ اب ہم ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں کون سا ہماری دوسری شادی کرنا ہے جو فیصلہ کرانے کے لیے بھاگ دوڑ کریں۔“
 ”شادی!“ ایمن کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوئی۔ ”مجھے تو شادی کے نام سے بھی خوف آتا ہے۔ جب کسی کی شادی کی خبر سنتی ہوں تو دعا کرتی ہوں یا اللہ یہ شادی سچ سچ شادی ہو اور اس دلہن کا نصیب میرے نصیب جیسا نہ ہو۔“ ایمن بول رہی تھی ماں کا کلیجہ شق ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

چمن جب سے ایمن سے مل کر آئی تھی اس کا ذہن اسی میں اٹکا ہوا تھا۔ آج تو ساس کی گفتگو میں طنز، طعنے، تشنہ بھی اس کی سوچ کے تالاب میں لہریں پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ سوچ ایمن سے ہٹتی تو کسی اور طرف جاتی۔ گھر واپس آ کر اس نے معمول کے کام نمٹائے اور اپنے بیڈ روم میں آ کر پہلے نماز پڑھی پھر ڈسپین کھا کر لیٹ گئی۔ جانے کب تک آنکھیں موندے لیٹی رہی تھی۔ نیند تو شاید رات کا وعدہ بھی نہیں کر رہی تھی، بے وقت کیسے آتی۔ لیکن شمر ذرا سالیٹ سہی مگر آ گیا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چمن نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اٹھنے کے بجائے شمر کی طرف کروٹ لے کر آہستہ سے سلام ضرور کیا۔

شمر کو اس کے بے وقت لیٹنے کی وجہ سے اگرچہ خاصی حیرت تو تھی مگر اس قدر تھکن غالب تھی کہ حیرت کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اعصاب شل ہو رہے تھے۔ کمرے کی طرف آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بس اب اندر مچھتے ہی شاور لے گا تا کہ دماغ ذرا تازگی محسوس کرے۔ اس لیے اس نے چمن سے سوال و جواب کرنے کے بجائے کوٹ اور ٹائی اُتار کر صوفے پر پھیکنے اور بیلٹ کھول کر بیڈ پر پھینکنے۔ شاید لاشعوری طور پر بیلٹ بیڈ پر پھینکنے کے عمل کے ذریعے چمن کا کچھ رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر چمن بس سے کس نہ ہوئی۔ شمر شرٹ کے بٹن کھولتا ہوا ڈریسنگ کی طرف بڑھ گیا۔ چمن نے داش روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کو کئی سال گزر جائیں تو بیوی کو شوہر کے داش روم جانے کے بعد داش روم سے باہر آنے کے دورانیے کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے اندر کسی قسم کا اضطراب یا بے چینی نہیں تھی۔ آنکھیں بند کر کے بالکل خالی الذہن اور خاموش لیٹنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

جانے کتنی دیر وہ ایک ہی زاویے سے لیٹی رہی تھی۔ یہاں تک کہ شمر شاور لے کر داش روم سے باہر آ گیا تھا۔ ٹاول سے سر رکڑتے ہوئے اب اس نے بہت سوچتی ہوئی نظر چمن پر ڈالی تھی۔ اب سوال جواب کا مرحلہ قابل برداشت محسوس ہو رہا تھا، اس نے بے ساختگی سے آخر پوچھ ہی لیا۔

”میری ماں نے پھر تمہیں اُداس کر دیا؟“ چمن نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر بڑے سکون سے گویا ہوئی۔

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تم کم بولتی ہو..... مگر تمہارا چہرہ بہت بولتا ہے۔ لیکن جب یہ بولتا ہے تو کبھی اس کی بات سمجھ آ جاتی ہے کبھی اُلجھ جاتا ہوں۔“ ثمر نے اب گیلاناؤل بھی صوفے پر پھینک دیا۔

آخر بیوی کس لیے ہوتی ہے۔ نوے فیصد شوہر فریق کے پاس کھڑے چلا رہے ہوتے ہیں۔ ”ارے بھئی کہاں ہو؟ ایک گلاس پانی پلاؤ۔“ گیلے تو لیے، پھلے ہوئے کپڑے، ٹائی، موزے، مختلف سمتوں میں پڑے ہوئے، سلیپر بھی شوہر کے موجودہ موڈ اور تاثرات جانچنے کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ جب شوہر کا موڈ اچھا ہو تو وہ جوتے موزے بھی بہت سکون اور اہتمام سے اتارتا ہے اور اچھے بچے کی طرح انگلیوں سے پکڑ کر سائیڈ میں بھی رکھ دیتا ہے اور جب میدان کارزار یا روزگار کے ٹھسے سے کسی سے دو دو ہاتھ کر کے نکلا ہو تو گھر پہنچ کر جوتے بھی اس طرح اتارتا ہے جیسے کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔ شاید ثمر نے رد عمل کے لیے عمل کیا ہو۔ مگر چمن پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ جو چیز جہاں پھینکی گئی تھی اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں میں کسی اور وجہ سے تھوڑی ڈسٹرب ہوں۔ آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ چمن نے خود کو یوں اٹھایا جیسے بڑے بڑے پتھر سمیٹ رہی ہو۔

”میں آج لیٹ ہو گیا تھا اس لیے چائے پی چکا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تو کھانے کا ٹائم ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کھانا باہر تو نہیں کھانا پڑے گا؟“ ثمر اب آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا، ساتھ ہی آئینے میں اُسے دیکھ بھی رہا تھا۔

”اتنا خراب نہیں کہ آپ کو وقت پر کھانا بھی نہ دے سکوں۔“ چمن زبردستی کے انداز میں مسکرائی۔

”جتنا بھی خراب ہے اس کی وجہ..... امی ہیں یا افشاں؟ کیونکہ تمہیں تنگ کرنے کا ٹھیکہ تو میری ماں بہن کے پاس ہے۔“

”طنز کے علاوہ بھی کوئی بات کر لیا کریں۔“ چمن سلیپر میں پاؤں بھی پھنسا رہی تھی، ساتھ ہی بالوں کو جوڑے کی شکل میں بھی سمیٹ رہی تھی۔

”تمہارے منہ سے تو پھول جھڑ رہے ہیں بلکہ جھڑتے ہی رہتے ہیں۔ مگر تم بھی کیا کرو..... اپنی محرومیوں کے بدلے مجھ ہی سے تو لے سکتی ہو۔“

ثمر نے بال سنوار کر تنقیدی جائزہ لیا ساتھ ہی زبان کو بھی تنقید کی ترشی سے آلودہ کیا۔ چمن جو اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس نے بوجھل اعصاب سے اضافی خدمت لینے کی کوشش کی یعنی ثمر کی بات کو نظر انداز کرنا چاہا مگر اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھی، منہ سے نکل ہی گیا۔

”مجھے میری محرومیوں کے طعنے مت دیا کریں ثمر، ابھی تک جو کچھ بھی ہے ادھورا ہے، نامکمل ہے، نامکمل مواد پر نتیجہ نہیں سنایا جاتا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے بڑھی۔

”ایک منٹ..... میری بات سنو..... کیا ادھورا اور نامکمل ہے؟“ ثمر نے غضب ناک ہو کر پوچھا تھا۔

چمن جہاں تھی وہیں رک گئی تھی۔

”ثمر..... ہم ماڈرن نہیں الٹرا ماڈرن دور میں جی رہے ہیں۔ Mars (مرخ) پر پانی کی موجودگی کے انکشافات کر رہے ہیں۔ تصویریں کھینچ کر زمین پر بھیج رہے ہیں۔ اتنے میچور ہو گئے ہیں کہ حیران ہونا چھوڑ دیا ہے اور Latest میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ اولاد سے محرومی کی وجہ صرف عورت کے اندر نہیں ہوتی، اس لیے

اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے بائبل سپاٹ اور دھیمے لہجے میں محرومی کا طعنہ دینے والے کو احساس دلایا کہ اسے ناجائز اسلحہ اور یا برادر دینا چاہیے۔ مگر وہاں تو تیر کے جواب میں اینٹم بم تیار تھا۔

"بہت بڑھی لکھی ہو؟ ایک نمبر کی جاہل ہو۔ شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔ اتنا نہیں جانتیں مذہب نے مرد کو عورت پر قوام (نگران) بنایا ہے اور یہ برتری اسے فز۔ رکھی بھی ہے اور Morally بھی۔ کیوں کہ وہ اپنی فیملی کے لیے جان مارتا ہے۔ سختیاں اٹھا کر کما کرتا ہے اور خرچ کرتا ہے۔"

"عورت کو بھی گھر کی چار دیواری میں بہت کام ہوتے ہیں، گھر میں کتنی بھی تھک جائے شوہر کی اجازت کے بغیر اس سے پہلے سو نہیں سکتی اور اگر سو بھی جائے تو مرد تھکی ہاری عورت کو جب دل چاہے جگا سکتا ہے۔ مرد کو نگران بنایا ہے تو اسی مذہب نے گھر میں رہنے والی عورت کے حقوق کی حفاظت کی بھی تھی سے تاکید کی ہے۔" یہ کہہ کر وہ رُک کی نہیں دروازہ آرام سے کھول کر باہر نکل گئی۔

شمر کا دل چاہ رہا تھا اس وکیل نما بیوی کو کھڑے کھڑے فارغ کر دے۔

"کیسی عورت ہے یار۔ امی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ اولاد نہیں ہے تو اتنا زور دکھاتی ہے۔ زبان چلاتی ہے۔ اگر شادی کے دس مہینے بعد جڑواں بیٹے پیدا کر لیتی۔ ہمارا تو اس گھر سے بوریا بستر گول تھا۔" وہ بری طرح تلملا رہا تھا۔

مرد کی مردانگی پر ضرب کاری لگانے والی عورت کے ہاتھ سے تو پانی نہیں پینا چاہیے۔

اُسی وقت اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔

'چلوں ہر مار کرتے ہیں۔ بیگم صلابہ کھانا لگا رہی ہوں گی۔' اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور خود کو سمجھاتا بھاتا لاونج کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

یاد رکھو کہ بستر میں جیسے کانٹے اُگ آئے تھے۔ کسی کروٹ پھین نہیں تھا۔ ایمن نے نہ خود فون کیا نہ اس کا فون اٹینڈ کیا۔ اپنا موبائل تو وہ گھر پر چھوڑ گئی تھی۔ اس نے عطیہ بیگم کے موبائل پر اسے کئی مرتبہ ٹرائی کیا۔ عطیہ بیگم نے خود اس کی کال ریسیو نہیں کی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ صورت حال کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ اب معاملہ چلا تو بات طویل مذاکرات تک جاسکتی ہے اور مذاکرات ناکام بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کے ماں باپ خود بھی ایک جھٹکے سے تعلقات ختم کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ان کے پوتے کو ان سے دور لے گئی ہے اور اتنے دھڑتے سے رات کو گھر سے نکلنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس نے الٹرا ساؤنڈ سے پتا کر لیا ہوگا کہ وہ اس بار بیٹے کو جنم دینے والی ہے۔ سبھی سبھی فوراً ہتھیار پھینک دینے والی ایمن ایک دم سے اتنی حوصلہ مند کیسے ہو سکتی تھی۔

وہ پڑا گتیاں سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار سرا چھوٹ کر گتھی میں گم ہو جاتا تھا۔ وہ پھر سے سرا ڈھونڈنے لگ پڑتا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے کرتے اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

آٹھ سالہ رفاقت..... اس پر تیسرے بچے کی آمد کا موسم..... اتنا کمزور بندھن بھی نہیں تھا کہ کھانا کھا کر آرام سے سو جاتا اور کچھ بھائی بھی نہیں دے رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ایک بڑی لڑکی سونچ

ردا کی نظروں کے سامنے کئی مناظر کھوم گئے۔ وہ انٹر میں تھی تو رشتے والیاں آ رہی تھیں۔ ہاں! میں نے اس کی قابلیت اور سیرت کو پہچانے بغیر اس کی ظاہری سنہری رنگت کو نہا "رنگ لہا" کیا کہ ہم خواتین رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتی ہیں اس لیے ردا کی سنہری سانولی رنگت

معاشرے کا ایک المیہ، خوب صورت افسانے کی صورت

ناں اس لیے۔!! کئی آنسو ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ماں کے رخساروں کو تر کر گئے تو سراج صاحب نے نوالہ منہ میں ڈالنے کا ارادہ ترک کر کے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر قرعہ گری پر بٹھایا۔ "تم! مائیں یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ہم باپوں کو اپنے بچوں کی تکلیف اور دکھ کا اس وقت تک پتا نہیں چلتا جب تک بتایا نہ جائے۔ باپ بھی وہی دکھ اور تکلیف محسوس کر رہے ہوتے ہیں جو مائیں کرتی ہیں ہاں اظہار کی راہ میں ان کی مضبوطی اور دلیری حائل ہوتی ہے۔ اور میڈم ہمیں مردانگی کا طعنہ دینے سے پہلے آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ آپ کی بیٹی کو Reject کر کے جانے والی خواتین آپ ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں یعنی حسب معمول اس بار بھی ہماری بیٹی کو لڑکے کی ماں نے رجیکٹ کیا ہے جب کہ میں دیکھ رہا تھا..... لڑکے کا باپ اور لڑکا خود آگے بات بڑھانا چاہ رہے تھے۔ مگر آپ خواتین ہیں ناں..... سارا بگاڑ بھی خود پیدا کرتی ہیں اور پھر لڑتی جھگڑتی بھی خود ہی

"ردا! ردا بیٹا آؤ کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

سراج صاحب نے چادلوں کی ڈش اپنے قریب کرتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا تو قدسیہ بیگم نے بھی قدرے گھور کر انہیں دیکھا۔

"آپ! کھانا تناول فرمائیے سراج صاحب آپ کی صاحبزادی آنے والے دو دنوں تک بھوک ہرٹال کرے گی۔ احتجاجاً۔"

"ہائیں... مگر کیوں!" میاں کی ممکنہ حیرت قدسیہ کو کھولا گئی۔

"جیسے آپ تو کچھ جانتے ہی نہیں۔"

"بخدا! جانتا ہوتا تو تم سے... خیر مان لیا ہم جاہل ہیں اب بتاؤ ہماری بیٹی کی بھوک ہرٹال کس سلسلے میں ہے۔ مطلب سلسلہ کس حد تک سیریس ہے اس کے بعد ریلی فیلٹی کا تو ارادہ نہیں۔"

"اف! بند کریں جگت بازیاں..... اس کا موڈ کیوں آف ہے وہ کیوں ہرٹ ہے وہ کیوں دکھی ہے آپ نہیں سمجھ سکتے۔ باپ ہیں ناں مرد ہیں

ہیں۔“

روا اس معاشرے کی کوئی پہلی لڑکی تو تھی نہیں
کہ اس کو قبول صورت ہونے کی سزا لڑکے کی
ماں بہنیں دیتی اور اس کی طرح ہر لڑکی لڑالی
کرب..... اب آپ پوچھیں گے کہ بھیا یہ لڑالی
کرب کیا نئی بیماری ان ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں یہ
بیماری تو ہر لڑکی کو پیدائشی طور پر ملتی ہوئی ہے۔ یعنی

شوہر کی ایک ایک بات درست تھی قد یہ چپ
چاپ ایک گہرا سانس لے کر کچھ کھائے بغیر اٹھ
گئیں سراج صاحب نے دکھ اور کرب کا ایک گہرا
کش باہر نکالنے کے بجائے اندر دبا لیا۔

☆... ☆... ☆



جب لڑکی شادی کی Age کو پہنچ جاتی ہے تو اس پر لازم ہے کہ سر پر دوپٹہ جمائے کیک پیسٹری اور دیگر لوازمات سجا کر ان مہمانوں کے سامنے لے کر آئے جو اس کی سیرت اس کی قابلیت اس کی ڈگریوں کو پرے دھکیلے لڑکی کی صورت ناک نقشہ سب سے بڑھ کر رنگت..... ارے بھئی ہر کسی کو اپنے کو بے سے کو بے پتر (بیٹے) کے لیے چاند چہرہ ستارہ..... آنکھوں والی کانچ کا پیکر رکھنے والی..... بہو اور بھابی چاہیے اور جو لڑکیاں ماں بہنوں کا پل صراط سفر ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ عبور کرتی ہیں وہ قبول کر لی جاتی ہیں..... ورنہ ماں بہن ردا جیسی لڑکیوں کو دیکھتی ہیں پھر کانوں میں کھسر پھسر کرتی ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹے کو اٹھنے کا اشارہ کرتی ہیں جو لڑکی کو دیکھ کر سوچ رہا ہوتا ہے۔

”اچھی! ہے مگر یہ اماں اور آپا ہیں ناں..... جانے کس دور میں سے لڑکیوں میں خامیاں تلاش کر لیتی ہیں۔“

”اچھا! بہن جی رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ملنا ملنا تو رہے گا آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔“

”اجی! بھاڑ میں گئی ایسی اچھائی آپ ہماری کندن جیسی بیٹی کو پیتل کی طرح رنجیکٹ کر کے اسے احساس کمتری کی آگ میں دھکیل کر دفنان ہو رہے ہیں۔“

یہ تو وہ حقائق ہیں جو ہر لڑکی پیدائش پر اس کے ساتھ چلے آتے ہیں اب آپ کہیں گے یہ کون سا نیا ٹاپک ہے یا نئی بات ہے کہ اس پر لکھا جائے بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔

ہے ناں کہنا فقط یہ ہے کہ ہر لڑکی کا اک ایسی Rejection کے بعد ایکشن مختلف ہوتا ہے کچھ

تو احساس کمتری کی دلدل میں دھنس جاتی ہیں۔ بہر حال ہر رنجیکٹ ہونے والی لڑکی کا Reaction مختلف ہوتا ہے۔ ہماری ہیروئن ردا کا ری ایکشن بھی خاصا مختلف ہے۔ جو اس بار اپنے ماں باپ کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔

”میں! میں بتائے رہی ہوں..... آج کے بعد اس گھر میں کسی منحوس مارے کی ماں بہنیں آئی تو..... تو واپس اپنے گھر نہیں جائیں گی۔“

”تو! تو! وہ میرا مطلب ہے بیٹا جی کہاں جائیں گی؟“

ابا نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹینگ کی تو..... وہ ان کی طرف گھوی۔

”سیدھی! ہو سٹل۔“

”باپ رے ہماری بیٹی تو دہشت گرد بن گئی ہے۔“

”ٹھکرائے جانے کا احساس وہ بھی اتنی باریا تو لڑکی کو مار دیتا ہے یا پھر دہشت گرد بنا دیتا ہے۔ خیر یہ بات آپ نہیں سمجھے گے ابا..... کیوں کہ آپ ٹھکرائے جانے والی لڑکی نہیں۔“

ردا کی آواز کا موسم بھیگ سا گیا تو قدیسہ آگے بڑھیں۔

”ردا میری بیٹی..... تم..... تم اتنا سیریس کیوں ہو رہی ہو جان تم کوئی پہلی لڑکی تو نہیں ہو..... ہر لڑکی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔“

”کیوں! کیوں..... ماں..... کیوں ہوتا ہے چاند سی بہو تلاش کرنے والی مائیں پہلے اپنی ڈائن جیسی بنیاں تو گھر چھوڑ کر آیا کریں اس دن جو نہ ہونے والی میری سا سوماں ہیں میرا ایکسرے پرنٹ نکال رہی تھیں ساتھ بیٹھی ڈائن جیسی بیٹی کو بھول گئیں جن کی آنکھیں دوسروں کو غلط فہمی کا شکار کر رہی تھیں..... وہ اپنے بھیا جان کو دیکھ رہی تھیں

میں شرما گئی کہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔“

”بہت بری بات ہے ردا..... وہ جیسی بھی تھی اللہ کی مخلوق تھی۔ اللہ تعالیٰ جیسے چاہے اپنی مخلوق بنا دے۔“

قدسیہ نے غصے میں سرخ بٹی کے بال سنوارے۔

”یہ! یہ! یہ ہی تو..... میں کہتی ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مصوری ہے۔ ہم آپ یا اور کوئی کون ہوتا ہے اللہ رب العزت کی مصوری میں نقص نکالنے والا پھر کیوں..... کیوں لڑکے والے لڑکیوں میں نقص نکالتے ہیں..... جب کہ بغل میں چڑیل کی ہم شکل بٹی بٹھائی ہوتی ہے۔“

”سو فیصد درست کہہ رہی ہے ہماری بٹی..... آخر ان لوگوں کو اپنی بٹی بھی کی تو شادی کرنی ہو گی ان کو بھی تو باتیں سننا پڑتی ہوں گی ناں۔“

”ارے! نہیں میاں بڑی لگی ہوتی ہیں ایسی چڑیلیں وہ میرا مطلب ہے لڑکیاں اس کی معافی اس کے چچا کے بیٹے سے ہو گئی ہے وہ ڈاکٹر ہے۔“

قدسیہ نے جلے دل سے کہا واقعی بات تھی بھی تو جلنے کی ان کی ٹھیک ٹھاک اچھی شکل کی بٹی کو وہ ٹھکرا گئے تھے۔

”ارے بھئی تب ہی اتنا اترا رہی تھی وہ اس کی

اماں جان۔“

”جی خود لڑکی صرف انٹر پاس ہے نخرے دیکھے تھے آپ نے جیسے آسانی حور ہو میری ردا کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ ہو۔“

ماں اور باپ دونوں ہی دکھی تھے اپنی پرکشش اور تعلیم یافتہ بٹی کی Rejection پر..... جو ان دونوں کو پیار سے دیکھ رہی تھی یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ کوئی آیا اور اسے Reject کر کے گیا ہو۔ اور ان تینوں میں بحث نہ ہوئی ہو والدین کا

اندر ہی اندر بٹی کی انسلٹ پر کڑھنا اور پھر اسے دلا سے دینا کہ کوئی بات نہیں بیٹا تمہارے معاشرے کی ہر لڑکی کو یہ سب سہنا پڑتا ہے مگر اس بار مختلف یہ بات ہوئی تھی کہ ردا کا رویہ بہت حوصلہ مند تھا۔ وہ جلنے کڑھنے کے بجائے بہت مطمئن نظر آ رہی تھی اور ماں باپ کو Relex کر رہی تھی۔۔

”Forget it! اماں بابا..... ہوتا ہے..... ایسا بھی ہوتا ہے اور جب تک عورت کی سیرت اس کی تعلیمی یا دوسری صلاحیتوں کو اس کی ظاہری شکل و صورت پر ترجیح دیتے رہیں گے ایسا ہوتا ہی رہے گا۔ نا اچھی کی حد ناں..... ایک انسان کی بلا وجہ تذلیل کی جاتی ہے اسے ان چیزوں کی کمی کی سزا دی جاتی ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہوتیں اگر ایسا ہوتا تو ہر لڑکی سار احسن خود میں سمیٹ لیتی تاکہ لڑکے والے اس کو Reject نہ کر سکے۔“

ماں اور باپ اپنی بٹی کو دکھی ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مگر آج کی Rejection کے بعد جیسے ردا پھر سے پیدا ہو گئی۔۔ ایک عجیب سی ہمت آ گئی تھی اس کے اندر۔

’میری بچی!..... قدسیہ نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا ممتا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”اوہ کم آن مام! مام..... Leave it سب چلتا ہے۔ آپ کو پتا ہے ماں آج جب وہ لوگ مجھے Reject کر کے گئے تو میں آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور بابا آپ کو معلوم ہے میں نے کیا دیکھا۔“

ابا بھی خامے سنبھل چکے تھے۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”کیا دیکھا میری شہزادی نے..... آئینے میں۔“

جوانی اکلوتی لالائی بنی جوان کے جینے کی آس تھی جس کو ٹھکرائے جانے کا درد دل میں لیے چپ کھڑے تھے چونک کر بولے۔
 ”من..... من منظور ہے میری گڑیا منظور ہے۔“

”مگر مجھے منظور نہیں یہ شرط۔“
 اماں نے بڑی دلیری سے بیٹی کی عدالت میں اپنا فیصلہ سنایا تو بیٹی گھومی۔ ”کیوں..... کیوں اماں کیا آپ ناامید ہو چکی تھیں کہ واقعی کسی لڑکے کی ماں بہنیں مجھے پسند نہیں کر سکتیں۔“
 ”نہیں! بیٹا..... دیکھو ناں اگر کوئی معقول لڑکا تمہیں پسند کرتا ہے اور۔“

”اور اپنی ماں بہن کو خود کشی کی دھمکی دے کر ہمارے گھر لے آتا ہے اور ماں بہن اپنے بیٹے کی محبت میں آکر مجبوراً مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں..... نو..... نو..... مام اس طرح بھیک میں ملا ہوا شوہر مجھے نہیں چاہیے۔“
 ”مام..... آئی ایم سوری۔“

ارے بھی ہو سکتا ہے اس کی ماں بہنیں نہ ہوں میرا مطلب ہے بہن قدرتی طور پر نہ ہو اور ماں فوت ہو چکی ہو۔“

”واہ! واہ! بھئی..... بیگم آج تک تو ہم آپ کی ذہانت کے قائل ہوئے کہیں آج ہو گئے..... واہ..... کیا سوچ ہے آپ کی۔ کیا تربیت ہو رہی ہے بیٹی کی۔ میڈم شکر کیجیے آپ کا کوئی بیٹا نہیں ورنہ کسی لڑکی کی ماں بہن کی بھی آپ کے لیے یہی سوچ ہوتی ہر ماں کو بیٹیوں کے رشتے بھانا اور رشتے جیتنا سیکھنا چاہیے..... یہ..... یہ..... نہیں کہ بہن ہو ہواں فوت ہو چکی ہو..... حد ہو گئی ہے قد یہ۔۔۔“

”ارے! بھئی میں نے تو یونہی بات کہہ دی

”ابا شاید زندگی میں پہلی بار میں نے خود پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی بلکہ میں نے ان مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے میں نے خود کو حقیقت کی نظر سے دیکھا اور مجھے خود پر پیار آ گیا۔ اللہ کے حضور سجدے میں شکریہ ادا کیا۔ کہ اللہ کریم نے مجھے آنکھیں دیں جن سے میں دیکھ سکتی ہوں ناک دیا جس سے میں سونگھ سکتی ہوں زبان دی جس سے میں کلمہ پڑھتی ہوں سچ بات کہتی ہوں اور اگر کبھی آپ دونوں سے مذاق میں بدتمیزی کرتی ہوں تو دانت زبان کو چبا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور رنگت سنہری گندم جیسی..... یہ تمام نعمتیں اللہ کریم نے عطا کر کے بھیجا ہے دنیا میں۔ جن میں سے ایک بھی نہ ہوتی تو میں معذور ہوتی۔ مگر میری رب العزت نے مجھے سب کچھ نوازا ہے اور پھر اللہ نے قابلیت اور تعلیمی ڈگریاں نواز کر میری شخصیت کو چار نہیں آٹھ آٹھ چاند لگا دیے ہیں۔ میں حیران ہوں آج سے پہلے مجھے اپنے اندر موجود اتنی خوبیوں نظر کیوں نہیں آئیں۔ میں اگر اللہ سے شکوہ کرنے بیٹھ جاتی کہ مجھے بھی چاند چہرہ اور ستارہ آنکھیں دی ہوئیں تو شاید..... بہر حال..... آج کے مہمانوں نے مجھے سمجھا دیا کہ تم ناشکری مت بنو اللہ کا شکر ادا کرو اور آج میں نے خود کو پہچانا ہے اللہ کی نعمتوں کو پہچانا ہے آج میں بہت خوش ہوں..... اور مطمئن ہوں۔ ہاں بس اماں بابا آپ لوگ بالکل اداس اور پریشان مت ہوں ہاں بس ایک بات پلو سے باندھ لو..... اماں جان کہ اب میں شادی صرف اسی سے کروں گی..... جس کی ماں بہنیں مجھے خود پسند کر کے جائیں گی کوئی چاہے میرے عشق میں مر بھی جائے اس سے نہیں کروں گی..... کہیے ابا منظور ہے شرط۔“

وہ جارحانہ انداز میں ابا کی طرف گھومی اور ابا

اس کی الٹی سیدھی شرطوں سے ڈرکتا ہے۔ مجھے
..... ایسا کون سا عزیز رشتے دار بیٹھا ہے آپ کا یا
میرا جو ہمارے مرنے کے بعد اس کا خیال رکھے
گا۔“

”اوہ کم آن مام سیریس کیوں ہو رہی ہیں۔
کوئی عزیز رشتے دار خیال نہیں رکھتا خیال ہمیشہ
وہی رکھتا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اور
پیدا کرنے والا اللہ ہے وہی مالک ہے اسی نے خیال
رکھنا ہے۔۔۔ But یہ ہے کہ میں شادی اسی لڑکے
سے کروں گی جس کی ماں بہنیں مجھے پسند کریں گی
کیوں کہ اب میں کسی بھی ماں بہن کی
Rejection برداشت نہیں کر سکتی۔“

ردا کی نظروں کے سامنے کئی مناظر گھوم
گئے وہ انٹر میں تھی تو رشتے والیاں آ رہی تھیں ہر
ماں بہن نے اس کی قابلیت اور سیرت کو پہچانے
بغیر اس کی ظاہری سنہری رنگت کو ”پکا“ رنگ کہا جیسا
کہ ہم خواتین رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتی ہیں
اس لیے ردا کی سنہری سانولی رنگت کو ”پکا“ یعنی
کالا کہا گیا۔ اس کی چھوٹی ناک کو پھنی کہا گیا
مناسب قد کو کشمی کہا گیا اب آپ پوچھیں گی
کشمی کیا تو مطلب پستہ قد..... اب لڑکیاں اپنا
خیال رکھتی ہیں، قبوے بنتی ہیں پودینے کا پانی پی کر
خود کو اسمارٹ رکھتی ہیں تو آنے والیاں ناک پر
انگلی رکھ کر سر سے پاؤں تک دیکھتی ہیں پھر ساتھ
بیٹھی پڑوسن رشتے دار کے کان میں کہتی ہیں۔“
اوکی نوج بوا لڑکی تو ٹی بی کی مریضہ لگتی ہے۔“
لیجیے اب آپ کی شخصیت ایک اور اضافہ ہو گیا یعنی
آپ پھنی کشمی کے رنگ والی ٹی بی کی مریضہ بھی
ہو گئی۔ مبارک ہو۔ آپ کو آپ ایک بار پھر
ریجنیکٹ ہو گئیں۔

اب آپ خود بھی انصاف کیجیے کہ ردا پھر

چڑتی کہ نہ چڑتی۔ اب اس نے جو فیصلہ کیا.....
ہے یقین کیجیے بالکل..... ٹھیک کیا ہے مگر قد سیہ
ماں ہیں ناں سو طرح کے وہم دامن گیر رہتے ہیں
یہ سوچ سو کر ہلکان ہو رہی ہیں کہ بیٹی کی یہ سوچ
رہی تو وہ کہیں بیٹھی نہ رہ جائے کیوں کہ وہ لڑکے
والیوں کو جانتی ہیں۔

”ٹھیک ہے یہ تجربہ کر لو، لیکن پھر اگر نہ ہو
سکی تمہاری شرط پوری..... تو میں تمہاری..... اسی
سے فوراً نکاح کر دوں گی جو تمہیں پسند کرے گا۔
”اور آپ کو یقین ہے کہ کوئی احق مجھے ذرا
سا بھی پسند کرے گا۔“

”ویسے بیٹا تم نے خود کو کچھ زیادہ ہلکا نہیں لے
لیا۔ کچھ کو تو میں بھی جانتا ہوں..... جو تمہیں۔“
”اوہ کم آن ابا آپ اس جھینگڑ کی بات کر
رہے ہیں ناں۔“

”بری بات! ابا نے جاتے جاتے پلٹ کر
کہا۔“

جی اس کی والدہ ماجدہ نے کہا یاد ہے آپ کو
کیا فرمایا تھا کہ مجھے تو اپنے بیٹے کے لیے کترینہ
کیف جیسی لڑکی چاہیے ہونہ جیسے بغل میں سلمان
خان لیے بیٹھی ہوں ہونہ اور ماں آپ کی جو ایک
کزن آئیں تمہیں اپنے چند بیٹے کے ساتھ اے قد سیہ
چاند لے کر آئی ہوں چاندنی لے کر جاؤں گی.....
اور جب قد سیہ کی بیٹی کو دیکھا تو اپنے چاند کو جسے
پہلے سے ہی گرہن لگا ہوا تھا آٹھل میں چھپایا اور
کہتے ہوئے چل دیں اگر تمہاری کوئی اچھی لڑکی ہو
تو دکھانا اب اتنی ڈگریوں والی لڑکی کو کیا کرنا جو
ساتھ چلتی اچھی نہ لگتی ہو اور یوں اپنوں اور
غیروں نے آپ کی لاڈلی بیٹی کو کنویں میں دھکیل
دیا۔“

بولتے بولتے ایک بار پھر لہجے کا موسم بھیکا

پہچانتے نہیں۔“

☆.....☆.....☆

فرح کی مہندی پر ردا خلاف توقع بڑے اہتمام سے ہوئی تھی گولڈن کام دار سوٹ فل میک اپ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے پہن کر وہ واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی کیوں کہ وہ اب پسند کیے جانے اور ٹھکرانے سے آزاد ہو چکی تھی یعنی CareFree ہو چکی تھی ایک عجیب سا اعتماد سا آ گیا تھا اس کے اندر۔ اسی لیے مہندی کی رسم میں اس نے بھرپور حصہ لیا خاصی شوخ ہو رہی تھی۔ قدسیہ نہال وہ رہی تھیں بیٹی کو دکھ کر۔ اور کتنی اچھی وہ لگ رہی تھی ان کو امید ہو گئی تھی کہ شاید کوئی خاتون اس کو پسند کر لیں گی اور ان سے بات کریں گی۔ ”پر کتھوں جی“ مگر ماں کی سوچ سے بے خبر ردا مہندی کے ہنگامے میں بڑی تھی کسی کو مہندی لگا رہی تھی تو کسی سے بچ کر بھاگ رہی تھی..... فرح کی فیملی کوئی غیر نہیں تھی ابا کے کزن کی فیملی تھی اسی لیے سب سے فری تھی اس بار اس نے ہاتھ میں مہندی لی اور فرح کے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھی اور راحیل نے اسے بڑھتے دیکھا اور جب وہ قریب آئی اپنے بڑے بھائی کے ایک دوست ارمان کو سامنے گر دیا اور پھر کیا ہوا وہی جو فلموں میں ہوتا ہے..... یعنی کہ ارمان میاں ہیرو ہیں ہیروئین جیسے ہی ردا کا مہندی کا ہاتھ اٹھا ارمان نے مضبوطی سے ان کی کلائی تھام لی اور شوخی سے اسے دیکھنے لگا۔

”چھوڑیے میرا ہاتھ۔“ لیجیے باقاعدہ لو اسٹوری کا آغاز اس جملے سے ہو گیا۔ ”کیوں چھوڑیں ہاتھ کیوں کہ ہاتھ اور ہاتھ والی ہماری مجرم ہیں اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارا یہ روپ یہ وجاہت یہ اتراہٹ تو دھری رہ جاتی

قریب تھا کہ بوندا باندی بھی ہونے لگتی ہے اس نے خود کو سنبھالا وہ جانتی تھی کہ اس کی بھیگی پلک اس کے اکلوتے والدین کے دل میں درد پیدا کر دیں گی تو اب اتنی بھی کمزور اور بد عقل نہیں تھی کہ عقل کے اندھوں کی سزا اپنے جانوں ماں باپ کو دیتی۔

”اچھا تو پھر فرح کی مہندی میں جانا ہے خالدہ کو منع کر دوں۔“

”قدسیہ کی افسردہ سی آواز گونجی تو سراج صاحب نے برہمی سے ان کو دیکھا۔“

کیوں بھی کیوں منع کر دوں کتنے اصرار سے بلایا ہے ان لوگوں نے ہونہہ کر دوں..... ارے بھئی بیٹی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے تاکہ۔

”اوہو آپ تو جان کو آ جاتے ہیں آپ کی بیٹی ہی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتی اس لیے کہہ رہی تھی۔“ اب قدسیہ کو اپنا دفاع کرنا تو تھا ناں۔

لیکن اماں اب میں ہر تقریب میں جاؤں گی اب میں کسی سے نہیں چھپوں گی کیوں کہ اب میں نے اللہ تعالیٰ خود پر مہربانیوں کو پہچان لیا ہے۔ الحمد للہ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے کمی ہے تو لوگوں کی عقل کی۔ اب میں نے لوگوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دی ہے۔ ہم فرح کی مہندی میں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی چاند کی ماں بہن مجھے پسند کر لے..... ہے ناں ابا۔

ردا نے شرارت میں کہا کیا تو ابا اندر ہی اندر اس کے لہجے میں چھپی احساس کتری کی تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کر کے تڑپ سے گئے۔

”میری بیٹی یہ تو معلوم نہیں لیکن یہ بات ضرور سمجھ گیا ہوں کہ واقعی عقل کے اندھے لوگ ہی تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو صرف دیکھتے ہیں

ناں مہندی لگ جاتی ہمارے اس دیکھ روپ کو اور
ایڈیز کپ ٹسٹ میں ہری سو فیصدی پسندیدگی
مہندی دار ہو جاتی۔

”لگتا ہے آپ نے خود کو کبھی آئینے میں
نہیں دیکھا۔ خوش فہم نہ ہوں تو۔“

ارے میرا یقین کیجیے میں بالکل بھی خوش فہم
نہیں ہوں آئینے میں خود کو دیکھتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا
کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنا ہنڈ سم پیدا کیا ہے۔
”یہ بابہ تو میری سوچ بھی رکھتا ہے۔“

اس نے آہستگی سے سوچا اور پھر اپنا ہاتھ آزاد
کراٹنے کی کوشش کی مگر گرفت مردانہ بھی اور خاصی
مضبوط۔

”What Ever چھوڑیے میرا
ہاتھ۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا کہ ہاتھ چھوڑ دوں
اٹھائی گیر دل پھینک۔ غم کی سمجھ رکھا ہے جو شخص
لڑکیوں کو ستانے کے لیے ہاتھ پکڑتے ہیں اور ایک
آدھ پھنر کھا کر چھوڑ دیتے ہیں۔“

اس کی اس بات پر ردا کا تملانا کوئی نئی بات
نہیں تھی۔

”اچھا تو آپ پھر کیسے چھوڑا کرتے ہیں
لڑکیوں کے ہاتھ۔“

اس کا طنزیہ جملہ ارمان کے دل میں تیر بن
کر اترتا۔

”یعنی! کہ کیا مطلب ہے آپ کا آپ نے
ہمیں بھی اٹھائی گیر سمجھ لیا ارے خاتون زندگی
میں یہ پہلا حادثہ ہوا ہے کہ کسی لڑکی کا ہاتھ
ہمارے ہاتھ میں آیا ہے وہ بھی ہماری خواہش کے
بغیر تو جب اللہ تعالیٰ نے یہ خوبصورت ہاتھ ہمارے
ہاتھ میں دے دیے تو چھوڑ کر ہم کفران
نعت تو نہیں کر سکتے ناں۔ سمجھو۔ لڑکی۔“

”تو کیا کریں گے آپ۔“

”ارے کیا کروں گا یہ مت پوچھو لڑکی۔“

تمہارے گھر جاؤں گا تمہیں پرپوز کروں گا۔ اس
ہاتھ میں پھر اپنے نام کی مہندی لگاؤں گا کیوں کہ
پہلی نظر کی محبت کا بڑا شدید جان لیوا حملہ ہوا ہے مجھ
پر کہ میں پہلی نظر کے اس حادثے میں جان بحق ہو
گیا ہوں۔“ اس کو چڑانے کے لیے ارمان نے
شوخی سے گہرا سانس لیا تو وہ غصے میں آ گئی۔

”دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہی ہیں مگر باتیں

خاصی فٹ پاتھیا ہیں آپ کی۔“

”ذرہ! نوازی ہے آپ کی۔ But I

-Really Mean it

”میرا ہاتھ چھوڑیے ورنہ۔“

”ورنہ! یا قسم سے یہ ورنہ ہی فساد کی جڑ ہے اس

ورنہ ہی سے لو اسٹوری اشارٹ ہوتی ہے۔ دشمنی
شروع ہوتی ہے۔“

”آپ! آپ!۔۔۔۔۔“

بندے کو ارمان کہتے ہیں! جس کے دل میں
آپ کو دیکھ کر ہزاروں ارمان پیدا ہو گئے ہیں۔“
وہ مسلسل شوخ جملوں سے اسے تپا رہا تھا۔

”شٹ اپ۔“

اس نے جب پوری قوت سے ہاتھ کھینچا تو
اس نے بھی جھٹکے سے چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ تو ارمان کھلکھلا
کر ہنس دیا وہ تمللاتی ہوئی آ گئی تو ارمان شوخ
سیٹی نے دور تک اس کا پیچھا کیا وہ گنگنا رہا تھا اک
اجنبی حسینہ آنکھوں کو بھاگتی ہے۔

☆.....☆.....☆

ارمان نے واقعی اس بات کو سچ ثابت کر دیا تھا
اس نے فرح کے بھائی سے ردا کے بارے میں
ساری معلومات لے لی تھی اور فرح نے تو اس کا

سیل نمبر بھی دے دیا تھا کیوں کہ وہ چاہتی تھی کہ ردا جیسی اچھی لڑکی کو ارمان جیسا اچھا بیٹا ساسی ملے۔ اس لیے پوری فیملی اس مہم میں شامل تھی اور پھر ردا کا اکثر ارمان سے ٹکراؤ ہونے لگا۔ وہ ردا کو چاہنے لگا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا مگر ردا اپنی ضد میں تھی کہ جب تک کوئی ماں بہن اسے پسند نہیں کرے گی وہ شادی نہیں کرے گی اور ارمان کے بارے میں تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ اتنا خوب رو اور ہینڈسم ہے۔ اس کی ماں بہنوں کو تو کوئی حسین لڑکی درکار ہو گی۔ اس لیے ارمان کو پسند کرنے کے باوجود وہ اسے انکور کر دیتی۔۔

”آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں آخر۔“ وہ چڑ گئی تھی۔

”اس لیے کہ تم میں کچھ خاص بات ہے۔ اور یہ بات میں مذاق میں نہیں کہہ رہا Believe Me“

”تو! یہ خاص بات کسی ماں بہن کو نظر نہیں آتی۔“

دھک کی ایک لہر اس کے ظاہری سکوت کو مرتعش کر گئی۔

”ایکسیوزی! کہاں کھو گئیں میڈم۔۔۔ میں کوئی فلرٹ نہیں کر رہا آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تمہرے پراپر و چینل۔ Because i Love You ارمان کے دل کی سچائی اور ارادے۔۔۔ کی پختگی کی چمک آنکھوں میں تھی اور اور لہجے کی کھنک اس کی گواہ۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھنے لگی تو ارمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”I am not Joking! ردا میں ایسا کیا کروں کہ تمہیں میرے جذباتوں کی سچائی پر یقین آ جائے اور وہ چھ ماہ سے اس کے گھر کسی بھورے کی طرح منڈلا رہا تھا وہ تو محبت کے جانے کتنے فاصلے

ملے کر آیا تھا مگر ردا اجدیت کے کسی موڑ پر کسی معجزے کی منتظر تھی۔

”آپ کو ایسا ویسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ آپ سیریس ہیں اس نے اس کی محبت کے اعتراف پر نظریں جھکا لی تو وہ ہچل گیا۔“

”پھر! پھر ردا کیوں مسلسل انکار کر رہی ہو۔ کیوں؟“

”Rejection سے ڈرتی ہوں۔“

”اوہ تو یہ بات ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا ردا میرا یقین کر دیا نہیں ہوگا میری امی اور آپ مجھے اتنا چاہتی ہیں کہ میری ذرا سی خواہش رد نہیں کرتیں تو تم تو ان کے بیٹے کی پسند ہو محبت ہو..... تمہیں ریجیکٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تم Rejection کا خوف نکال دو اپنے دل سے۔“

”میں اپنی Rejection کی بات نہیں کر رہی میں آپ کی ماں بہن کی بات کر رہی ہوں کیوں کہ میں لڑکے کی ماں بہنوں سے اتنی بار ریجیکٹ کے تیر کھا چکی ہوں کہ اب فیصلہ کر چکی ہوں کہ اس درد سے دور رہوں گی اس لیے آپ اپنی محبت یا اپنی جان کا واسطہ دے کر ہرگز اپنی ماں بہن کو لے کر مت آئیں میں بری طرح انکار کر دوں گی..... اور جانتی ہوں..... غلط کر رہی ہوں مگر مجھے اب یہ درد لینا نہیں دیتا ہے اگر آپ چاہے ہیں کہ آپ کی ماں بہن کوئی دھک نہ ملے تو مت لے کر آئیں میرے گھر ان کو۔ ردا کی آواز بھینگنے لگی تو وہ آگے بڑھ گئی وہ دھک سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ارمان میاں کی خوش فہمی بھی دور ہو گئی جب اس کی والدہ نے اس کی پسند کی ہوئی لڑکی کو بہو

بنانے سے انکار کر دیا۔

”کیوں! امی آپ ایک بار اس سے مل لیں
آپ کو پسند آجائے گی۔ ارمان کے ارمانوں پر
اوس پڑنے لگی۔

”اور جو لڑکی میں نے تمہارے لیے پسند کی
ہے ناں..... تم اس سے ملو گے تو۔ کہو گے امی میرا
ابھی اس سے نکاح پڑھوادیں۔“

”کون وہی لڑکی جو وقار کی شادی میں آپ
نے پسند کی تھی۔“

”ہاں میں سے تمہیں اتنا دھونڈا کہ تم بھی
دیکھ لو۔ مگر تم نجانے کہاں تھے نظر ہی نہیں آئے۔“

”میں! وقار کے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ خیر
اماں پلیز آپ اس لڑکی کو دیکھ لیں آپ کی طرح
ڈھیر ساری ڈگریاں جمع کر رکھی ہیں اس نے بہت
اچھی ہے۔“

”اچھی تو وہ بھی بہت تھی۔“

”اماں ہو سکتا ہے اب اس کی شادی وادی نہ
ہو گئی ہو..... آپ نے بھی اس کا نہ نام پوچھا نہ پتا

اب بھند ہیں کہ اسی کو ہی بہو بنائیں گی۔“ مینا نے
تو بڑی اچھی بات کی تھی تب ہی تو شہل بیگم کو اپنی
بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔

”ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر کیا کروں
وہ بچی مجھے اتنی بھائی تھی کہ۔“

”اماں جب اتنی پسند آ گئی تھی تو اس کا اتنا پتا
بھی معلوم کر لیتیں لیکن اب چونکہ اب اس کا آپ

کے پاس کوئی نام و نشان نہیں تو آپ میری پسند کی
ہوئی لڑکی دیکھ لیں آپ اسے دیکھیں گی تو کہہ

اٹھیں گی آج ہی اس سے شادی کر لو ارمان نے تو
شکر ادا کیا کہ اماں کو ان کی پسند کی ہوئی لڑکی کا

کوئی اتنا پتا معلوم نہیں تھا اس لیے اس نے ردا سے
بات کرنے کی بجائے اس کے اماں ابا کو پکڑا

تو قہقہے بہہ حد خوش ہو گئیں کہ اتنا اچھا خوبرو لڑکا
ابھی پوسٹ والا! ادا خود چل کر ان کے گھر آ گیا
ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے بیگم لیکن تم شاید اپنی بیٹی
کی اتنی بڑی شرط بھول گئی ہو میری مانو تو ارمان کو

منع کر دو کہ اپنی ماں بہن کو نہ لے کر آئے۔“

”ارے! واہ کیوں منع کر دوں ارے اللہ نے
میری فریادیں سن لی ہیں میں تو ہرگز کفرانِ نعمت
نہیں کروں گی۔“

”اور تمہاری صاحب زادی نے جو منع کر دیا
تو۔“

”ارے صاحب زادی کا تو دماغ خراب ہے نا
سمجھ ہے یہ ساری باتیں تو ہمیں ہی دیکھنی چاہئیں

اتے سمجھانا چاہیے چھ سات ماہ ہو گئے ہیں اب تو
رشتے بھی نہیں آتے۔ رشتے کرانے والیاں بھی ردا

کی وجہ سے بدک گئیں ہیں بس اللہ نے اپنا کرم کیا
آپ اسے سمجھائیں کہ اب وہ بے وقوفی نہ

کرے۔“

مگر جناب ردا تو ردا تھیں Rejection کی
ڈسی ہوئی صاف انکار کر دیا۔

”دیکھیے ارمان صاحب میں واقعی آپ کو پسند
کرتی ہوں اور آپ کی عزت بھی کرتی ہوں اس

لیے میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ کی ماں بہنوں کو منع
کروں یا کوئی ایسی بات کہہ دوں جو ان کو بری لگے

تو.....“

”آپ تو احمق ہیں انشاء اللہ وہ آپ کو پسند کر
لیں گی۔“

”آئی نو وہ کر لیں گی کیوں کہ ان کا بیٹا جو ان کا
جینا حرام کر رہا ہے اور یہ ہی چیز میں نہیں چاہتی یہ ہی

میرا اختلاف ہے یہ ہی میری انسلٹ ہے کہ ایک
جسمتی جاگتی قابل لڑکی کی حیثیت ہی کوئی نہیں اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بے چارگی

جاپان کا ایک پھانسی گھاٹ دریا کے قریب تھا تاکہ مجرم کو پھانسی دینے کے بعد دریا میں بہا دیا جائے۔ دو مجرموں کو پھانسی دی جا رہی تھی۔ ایک کے گلے میں پھندا ڈال کر تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ مجرم کی خوش بختی کہ پھندا ڈھیلہ رہ گیا۔ چنانچہ اس نے پھندا اتار کر پھینکا اور دریا میں چھلانگ لگا کر فرار ہو گیا۔ دوسرا مجرم جسے پھانسی دی جانے والی تھی، یہ منظر دیکھ کر تھر تھر کاپٹنے لگا۔ جلاد نے اُس کی کپکپاہٹ کا سبب پوچھا تو اُسے جواب ملا۔ ”بھالی، پھندا ذرا مضبوطی سے ڈالنا۔“ مجھے تیرنا نہیں آتا۔“

مرسلہ: نازش در آب خان۔ خانیوال

تو شاید ارمان تمہیں دوبارہ نہ ملے..... اور تمہیں زندگی میں کوئی بہت بڑا کمپروماز کرنا پڑے تو۔“

”ابا اگر اس کی ماں بہن نے بھی مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ارمان میرے پاؤں بھی پکڑے گا میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔..... ابا..... ابا آپ کو معلوم نہیں جب ایک لڑکی اتنی ہار ٹھکرائی جاتی ہے تو اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔“ وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر شدت سے رو پڑی۔ تو ابا کا دل بھی رو دیا۔

”میری بچی میرے دل میں اتر کر تو دیکھو تو سہی ٹھکرائی جانے والی لڑکی کا باپ ہوں۔ میں تو تمہیں لگے گا تمہارا درد کم اور ماں باپ کا درد زیادہ ہوتا ہے تم نے آج تک جو کہا میں نے تمہارا ساتھ دیا تمہاری ماں کی ناراضگی بھی مول لی مگر آج میں درخواست کرتا ہوں کہ تم ارمان کی ماں کے سامنے آ جاؤ۔“ ابا کی آواز بھی بھگ گئی۔

ان چیزوں کی سزا دینا جن کا اس میں کوئی اختیار ہی نہیں کہاں کا انصاف ہے بس کہہ دیا..... تاں نہیں کرنی مجھے شادی نہ آپ سے نہ کسی اور سے جو لڑکیاں شادی نہیں کرتی وہ کیا زندہ نہیں رہتی میں اس وقت تک نہیں کروں گی جب تک کوئی.....“

”اوکے تو ویٹ کرو ایسی ماں بہنوں کا اور بوڑھی ہو جاؤ انتہائی فضول ضد پراڑی بیٹھی ہو میں کل شام کو اپنی امی اور آپا کے ساتھ آرہا ہوں بغیر کسی میک اپ کے سامنے آنا اوکے بائے۔“

ارمان بھی تو پھر ارمان تھا اسے اسنے ارمان ردا کی ضد سے زیادہ عزیز تھے اسی لیے اگلی شام اپنی ماں بہن کو لے کر ردا کے گھر پہنچ گیا ماں ہے کہ ان کے ساتھ کچھی جا رہی ہے جو بیٹی ہے سامنے آنے کے لیے تیار نہیں۔

”جائیے جی آپ ردا کو لے آئیے.....“ لیجیے مہمانوں کے سامنے آج قد یہ نے شوہر کو بھی عزت دے ڈالی کیوں کہ سراج بھی یہ رشتہ مس نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے سر پر کفن باندھ کر بیٹی کے سامنے پہنچ گئے۔

”ابا! پلیز“ وہ ہارون کو دیکھتے ہی رو پڑی۔“

دیکھو بیٹا کبھی بھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا ہمیں زندگی کی ان باتوں کے ساتھ جینا ہے مانا کے تم اپنی جگہ درست ہو بار بار کی Rejection بچوں کو اندر سے مار دیتی ہے لیکن کفران نعمت کرنا بھی تو گناہ ہے۔ ارمان ایک با عزت نو جوان ہے گذشتہ دو سال سے تمہارے پیچھے میرے ساتھ وہ گھنٹوں وہ باتیں کرتا ہے سلجھا ہوا ہے تم اسے ٹھکرا دو محض اپنی انا کی تسکین کے لیے تو میری بچی نقصان کسی کا نہیں ہوگا اسے تو ہو سکتا ہے تم جیسی کوئی اور مل جائے مگر تم ارمان کو ٹھکرا دو گی

شادی ختم ہو گئی تو افسوس رہا کہ اس کا اتنا پتا نہیں معلوم کیا۔ فرح کی امی سے پوچھا تو وہ پہچان نہیں پائیں کہ اس قسم کی تو ڈھیروں لڑکیاں تھیں۔
 ”ہوں تو ساس کو گویا اپنی چھڑی ہوئی بہو مل گئی اسی خوشی میں اپنا وعدہ پورا کیجیے۔“
 ”کون! سادہ بیٹا۔“

”وہی کہ جب میری پسند کی ہوئی لڑکی کو دیکھو کے تو فوراً کہو گے کہ امی آج ہی شادی کروادیں۔“
 ”ہاں..... ہاں کیوں نہیں بیٹا میں خود بھی یہ نہیں چاہتی کہ یہ پیاری لڑکی دوبارہ کہیں نہ کھو جائے۔“
 ردا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش پوری کر دی تھی کہ اسے ارمان کی ماں نے پہلے پسند کیا اور بعد میں ارمان نے۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کے حضور توبہ کر رہی تھی کہ اپنی ضد کی وجہ سے اس نے اپنے والدین کو پریشان کیا اور شکر بھی ادا کر رہی تھی کہ اللہ نے اس کی خواہش کو پورا کیا۔“

لیجیے ردا کی شادی ارمان سے ہو گئی ماں باپ بھی خوش لڑکا لڑکی بھی خوش ہو سکتا ہے ردا کی کہانی آپ کو فضول لگے کچھ کو فکری بھی لگے ہو سکتا ہے ووت ردا کے حق میں..... یا مخالف میں ہوں۔ مگر یہ بات یہ ہے کہ یہ اس ہر لڑکی کی کہانی ہے جو ردا جیسی ہوئی ہیں لڑکے والوں سے فقط یہ کہنا ہے کہ کسی لڑکی کو اس کی کمی کی سزا مت دیں اس کی سیرت کو پہچانیں اس کی قابلیت ہنر کو پہچانیے ہر لڑکی میں خوبیاں موجود ہوتیں ہیں کسی بھی لڑکی کو رنگ روپ قد جسامت کی وجہ سے ٹھکراتے ہوئے ایک پل صرف ایک پل کے لیے ضرور سوچیے گا اللہ آپ کا بھلا کرے گا ہو سکتا ہے سوچ کا یہ پل کسی دوشیزہ کا گھر آباد کر جائے..... ذرا سوچیے گا۔“

☆☆☆☆

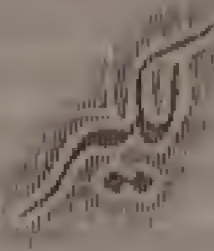
”سوچ لیں ابا آج کہ بعد یہ ٹرالی سین نہیں ہوگا؟“
 ”نہیں ہوگا میری بچی! آج کے بعد فریزنگ سین ہوگا تمہاری رخصتی کا سین۔“
 ردا افسردگی سے مسکرا کر آگے بڑھی تو ابا اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا گئے۔

”یا اللہ میری بیٹی کو خوش کر دے۔ آمین۔“
 ردا جس حلیے میں تھی اسی حلیے میں آگئی ارمان کو تو وہ ہر روپ میں حسین لگتی تھی بس امی اور آپا سے خوف آ رہا تھا اس نے چور نظروں سے ماں بہن کو دیکھا۔ ردا ہر قسم کی بات کے لیے تیار بیٹھی اپنے ٹوٹے ناخن کو دیکھ رہی تھی۔
 ”بیٹی مجھے کیوں لگ رہا ہے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔“
 ”کھسکی بڑھیا! میں وہاں کبھی نہیں گئی جہاں آپ نے مجھے دیکھا ہے۔“

یہ جملہ دانشوں میں دبا کر رہ گئی تو ارمان کی امی بے اختیار وچوٹیں۔

”ہاں تم وہی ہوتا جسے میں نے وقار کی شادی میں دیکھا تھا تم دلہن فرح کے پاس جا رہی تھیں میں نے تمہیں روک کر بات کی تھی۔“
 ”لیجیے ساسو ماں کی تو یادداشت واپس آگئی تھی۔ ردا کو بھی وہ سین یاد آ گیا جب وہ فرح کو اسٹیج پر لانے کے لیے جا رہی تھی تو آنٹی نے دیوچ لیا تھا اور پھر ساری تقریب اپنی نظروں میں رکھا تھا۔“
 ”جی آنٹی..... یاد آ گیا ہے۔“

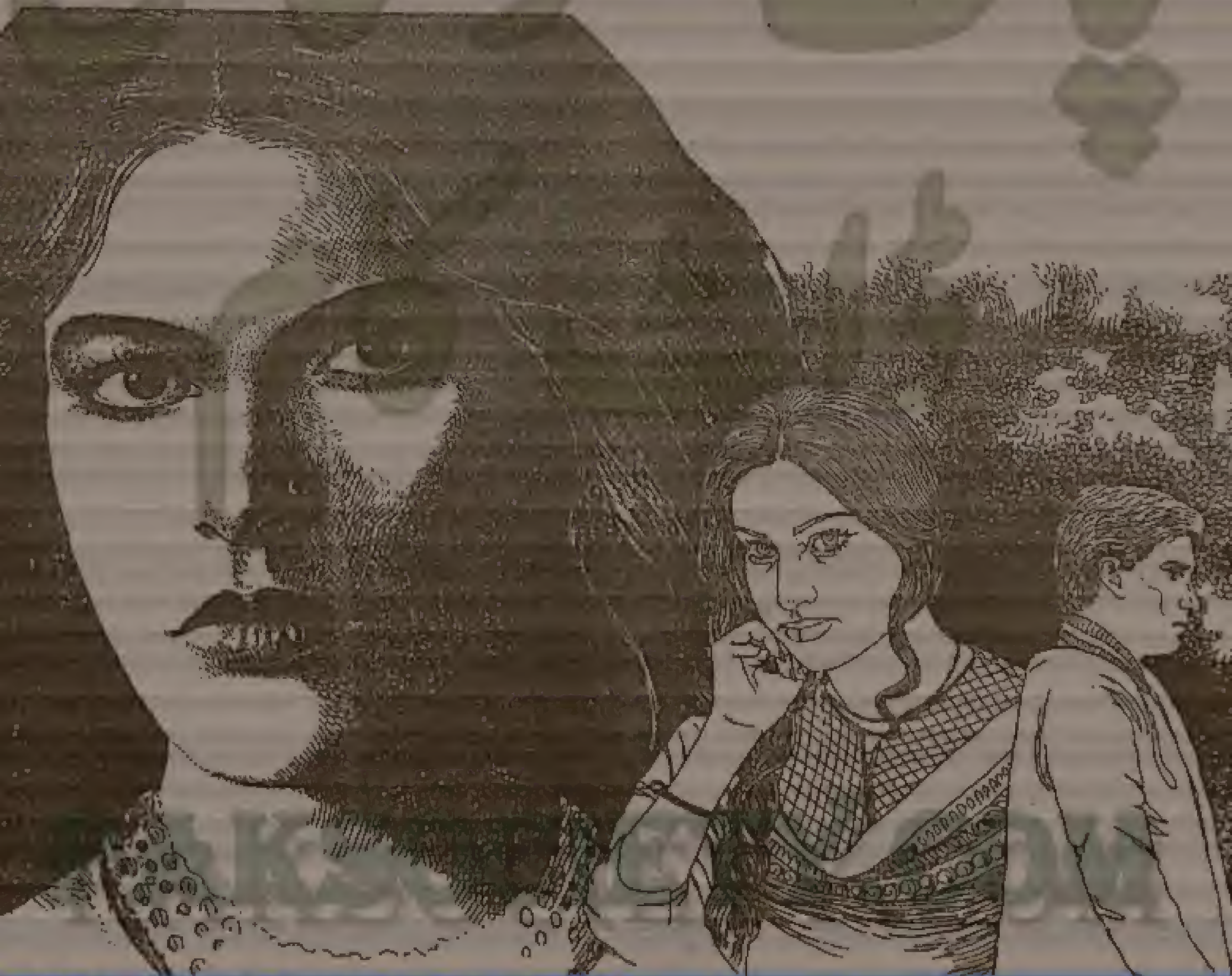
سب تو اس ملاپ پر حیران ہو رہے تھے ارمان کے سینے سے دل باہر آ رہا تھا۔ تو..... تو امی یہ وہی لڑکی ہے جسے آپ نے میرے لیے پسند کیا تھا۔“
 ہاں بیٹا وہی ہے جو اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے تمہاری دلہن بنانے کے لیے پسند کیا تھا۔ مگر پھر



لیکچر کے اُس پارا برمودا اثرائی اینجکل میں گم مئے چکراتے مجھے احساس ہو رہا ہے یک طرفہ محبت ایک بانٹھ کی تالی ہوتی ہے کہ سب وہ بھتی ہے تو کرنے والے کے منہ پر پڑتی ہے اور پھر وہ اپنا ایسا نشان چھوڑ جاتی ہے کہ کرنے والے کے پاس کہنے کے لیے لفظ تو بڑی بات

آگاہی کا کرب لیے، ایک خوب صورت افسانہ

ان لفظوں نے جیسے اسے پتھر کا کر دیا تھا ان لفظوں نے اس کے آگے
حرف ایک ہم کی طرح اس کے چہرے کے
پر نیچے اڑا رہا تھا ایک ایسی لکیر جس کا کوئی
ایک لکیر کھینچ دی تھی۔ ایک ایسی لکیر جس کا کوئی



وجود ہی نہیں تھا..... لیکن لکیر تھی۔ ایک ایسی لکیر جو اس کو اس کی اوقات..... اس کی حیثیت بتا رہی تھی ایک ایسی لکیر جس نے اس کو اس کے وجود اس کی محبوں، خواہشوں، اور احساسات کو دیوار پر دے مارا تھا۔

وہ نظر نہ آنے والی لکیر سیکنڈوں سیکنڈوں کے حساب سے گہری ہوئی چلی جا رہی تھی۔

گہری..... مزید گہری۔

لکیر جو کہ دیوار بننے لگی تھی..... ایک ایسی دیوار جس میں گارے اور سینٹ کے بجائے اس کا خون اس کا گوشت استعمال ہو رہا تھا۔ اپنے وجود کے چیتھڑے اس کو ان پتھروں کے درمیان سکتے..... روتے..... لکھتے نظر آ رہے تھے.....

لیکن وہ کیا کر سکتی تھی..... دیوار مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ، بلند بھی ہوتی جا رہی تھی دیوار چین سے زیادہ بلند.....

بلند..... اور بلند..... ایسی بلند کے اس کو سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی..... وہ بلبلا نے لگی۔

زندگی کے لیے تڑپنے لگی.....

موت سے پہلے اپنی موت پر رونے لگی۔

اس کا دل چاہا کہ اس دیوار کو گرا دے..... اس لکیر کو مٹا دے.....

یا پھر اس دیوار کے بلے تلے دب جائے..... کسی کو نظر نہ آئے.....

☆.....☆.....☆

آپا اور میں..... بہنیں نہیں میں اور آپا کے بچے بلکہ ہم سب.....

ارے چھوڑیے میں بات یوں کروں یا دوں کروں..... مقصد ایک ہی ہے کہ ہم ایک دوسرے میں ایسے غم تھے جیسے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں.....

ٹھہرے..... آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں آپ کو دوسرے انداز میں بتاتی ہوں..... ☆.....☆.....☆

بتا سکتی ہیں کہ آج آپ کی سواری یا باد بہاری کہاں گئی ہوئی تھی..... میں نے جیسے ہی چارو تہہ کر کے الماری کھولی اسما کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یا اللہ اسما تم بھی نا.....!

تم کو اپنے گھر میں کوئی کام کاج نہیں ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

جی ظاہر ہے میں صرف اپنے گھر کا کام کرتی

ہوں۔ میں نے اپنے وجود کو کسی کی غلامی میں نہیں در رکھا۔

ہمارے گھر اور میری زندگی میں جمہوریت ہے.....

میں کسی ڈکٹیٹر سے ڈکٹیشن نہیں لیتی..... اس لیے میرے پاس وقت بچ ہی جاتا ہے۔

”لیکن آپ بلیقیس ایدھی اور عبدالستار ایدھی کی جانشین کسی کے درجھاڑ دینے گئی ہوئی تھیں آپ بتا رہی ہیں یا تکلیف میں کروں.....“

اسما کہنے کہتے رکی تو اس کے انداز پر میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی.....

اسما میری بچپن کی دوست تھی..... میں تو شاید اس کو صرف دوست سمجھتی تھی لیکن میری حیثیت اس کے نزدیک بہنوں سے زیادہ تھی.....

وہ مجھے یقین ہے کہ تم یا تو بڑی آپا کے گھر ان کے پودے دھونے گئی ہوگی یا پھر ان کی اپنی اس میٹھی کے پیسے دینے گئی ہوگی جو تم کو کبھی ملتی ہی نہیں ہے۔

کیا ہوا جو میں نے آج ان کے قالین دھو دے تو..... وہ میری بڑی بہن ہیں..... اگر میں ان کا کوئی کام کرتی ہوں تو کوئی بری بات ہے۔

ابلتی ہوئی چائے گک میں انڈیل کر منہ بناتی ہوئی
اسماء کے ہاتھ میں پکڑ والی.....
اور خود دسترخوان لے کر کچن سے باہر نکل
گئی.....

☆.....☆.....☆

ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایک ماں کے پیٹ پر
پیر پھیلا نے والے..... ایک دسترخوان پر کھانا
کھانے والے اور ایک ہی تکیہ پر سر رکھ کر سونے
والے بہن بھائی رشتے دار بن جاتے ہیں۔
اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ رشتہ دار کنبہ دار
بن جاتے ہیں.....

اور کنبہ دار کون ہوتا ہے؟

کنے دار وہ ہوتے ہیں جو ہماری تقریبات کی
لسٹ میں نہیں ہوتے..... لیکن وہ ہمارے لیے بس
ایک حوالہ ہوتے ہیں اور پھر وہ حوالہ نئے رشتوں کے
وجود میں آنے کے بعد کہیں گم ہو جاتا ہے..... اور
جب ہم رشتوں کی گھٹیوں کو سلجھاتے سلجھاتے ان
کی حقیقتوں کو جان پاتے ہیں..... تو ہمیں احساس
ہوتا ہے کہ لاشعوری یا شعوری طور پر.....

احساسات اور محبتوں کے ہاتھوں.....

مستقبل کے غیروں کے لیے ہم اپنا سب کچھ
ہار چکے ہوتے ہیں..... حتیٰ کے رونے کے لیے
ہماری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں بہتے.....

☆.....☆.....☆

ابا ہمیشہ گھر کے معاملات سے دور ہی رہتے تھے سو
ایماں کے انتقال کے بعد..... گو کہ آپا کی شادی ہو چکی
تھی پھر بھی گھر کی بادشاہت آپا کو سونپ دی گئی۔
میں آپا کے فیصلوں پر چلنے لگی.....
آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ فرما
برداری نہیں تھی..... وہ محبت نہیں تھی.....

وہ غلامی تھی..... میں آپا کی غلامی میں چلی گئی

”دراصل اسماء تمہاری کوئی بہن نہیں ہے تا تم
تمہیں اس رشتے کی خوبصورتی کا احساس نہیں
ہے۔“ میں نے جلدی جلدی روئی بیلتے ہوئے
کہا..... ابا مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھاتے تھے
اور اماں کے بعد کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ابا کو کھانے
کے لیے انتظار کرنا پڑا ہو

ہم دو بہنیں اور پانچ بھائی تھے آپا سب سے
بڑی تھیں اور میں سب سے چھوٹی.....

ایک ایک کر کے بچپن میں ہی پانچوں بھائی
اللہ کو پیارے ہو گئے اور رہ گئی میں اور آپا.....
اور آپا اور میرے درمیان ماں بنی جیسی عمر کا فرق
مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا اسکول میں پہلا دن
تھا اس وقت آپا کی یونیورسٹی میں پہلی کلاس تھی۔
میرا تھا ہی کون؟

ایک ابا اور ایک میری آپا۔

میں میٹرک میں تھی تو اماں چل بسیں..... میں
جو اماں کا دوپٹہ پکڑ کر چلتی تھی غیر ارادی اور غیر
اختیاری طور پر آپا کے پیچھے پیچھے چلنے لگی.....

آپا ہمیشہ مجھے اپنی ماں جیسی لگیں بلکہ یہ کہنا غلط
ہوگا کہ میری ماں جیسی

آپا میری ماں بن گئیں اور میں آپا کے بچوں کی.....
تم نے بھی سوچا زرین کے تم گنتی مصروف رہتی
ہو..... تمہاری آپا کو ذرا بھی خیال نہیں کہ تم کو آرام
کرنا ہوگا۔ تمہاری اپنی بھی کوئی لائف ہے یا نہیں۔“

اسماء کی آواز مجھے حقیقت میں واپس لے آئی.....
اس کے لہجے میں میرے لیے محبت اور فکر تھی.....
روئی پکاتے پکاتے میرا ہاتھ ایک لمحے کے لیے
رکا اور پھر میں توے پر ڈالی ہوئی روئی کی طرف متوجہ
ہو گئی.....

ارے چھوڑو میری جان..... واشل پیو اور
زندگی جیو..... میں نے برابر والے چولہے پر سے

لیکن کیسے.....!

☆.....☆.....☆

ابا اماں کو اس قدر چاہتے تھے اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب اماں کے انتقال کے چند سالوں بعد ہی وہ ان کے پہلو میں جا سوئے..... اور پھر دنیا میں میرے لیے کپارہ گیا! میری آپا..... میری ماں جانی..... میرا واحد خون کا رشتہ۔

☆.....☆.....☆

تو تم اپنی آپا کے ساتھ رہو گی..... اسماء نے مجھے پکینگ کرتے دیکھ کر کہا..... جواب جانتے ہوئے بھی سوال کیا!

”ظاہر ہے یا راب میں اتنے بڑے گھر میں اکیلی تو نہیں رہ سکتی نا اوپر سے آپا بھی میری طرف سے بہت پریشان رہتی ہیں تو آپا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ رہوں.....“ میں نے جلدی جلدی اپنی کتابیں بیگ میں بھرتے ہوئے اسماء کو بتایا.....

اور یہ گھر.....!

یہ گھر تو آپا نے بیچ دیا ہے نا..... میرا انداز سرسری تھا۔ بیچ دیا.....

لیکن کب؟ اسماء کی تو جیسے چیخ ہی نکل گئی۔

”ابا کے چالیسویں کے فوراً بعد ہی..... آپا کہنے لگی اب گھر کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے مکان کا سارا پیسا میرے نام بینک میں رکھ دیا ہے۔“ ”اچھا!“ میری وضاحت..... پر اسماء کے منہ سے طنز یہ نکلا۔

کیا مطلب؟ میں اس کے طنز پر حیران ہوئی۔

”ارے زرین..... تم کو کب عقل آئے گی..... اسماء کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرا سر پھوڑ دے..... ظاہر ہے جتنی عمر ہے اتنی تو عقل ہے لیکن تم نجانے کون سی نالی دادی والی عقل کی

بات کر رہی ہو مجھے لگتا ہے تمہارے اندر دو سو سال والی بوڑھی اور جہان دیدہ عورت کی روح سمائی ہوئی

ہے

میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات کو ہوا میں اڑا دیا۔

یہ جو تم اپنا آپا نامہ پڑھتی رہتی ہونا تو سن لو زرین یہ پیار اور محبت بس دو دن کا ہونا ہے۔ اور سامنے زندگی کی تلخ حقیقت آ جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد تمہارے بہنوئی کو کاروبار میں نقصان ہوگا اور آپا کہ منافع کی یقین دہانی پر تمہارا پیسہ ان کے کاروبار میں لگا دیا جائے گا۔ اور پھر وہ رقم تم کو کبھی نہیں ملے گی..... اور پھر رہ جاؤ گی تم صرف

110 پونڈ کا بوجھ..... ذمہ داری اور مصیبت.....

آج لکیر سوال کر رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا اسماء.....

☆.....☆.....☆

بھئی بہت ہی نیک کام ہے اللہ ایسی بڑی بہن سب کو دے..... کاش تمہاری جیسی کوئی بہن ہماری بھی ہوتی..... اور آج تمہارے ماں باپ کی روحیں کس قدر خوش ہوں گی..... تم نے اپنی بہن کے لیے کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے..... اللہ ہر ایک کو تمہاری جیسی بیٹی اور بہن دے.....

نجمہ خالہ نے میری سمیں آپا سے میری رخصتی کے وقت کہا..... تو میرا دل بھرا آیا.....

میری رخصتی..... میری شادی.....

آپا کے گھر میں نجانے کیوں فٹ نہ ہو سکی.....

جبکہ آپا کے بچوں میں میری اور ان کی مجھ میں جان تھی.....

آپا نے مجھے کھانا پکانے اور سلائی کڑھائی طاق کر دیا تھا۔ میں نے بھی بیٹیوں کی طرح آپا کو جیسے تخت پر بٹھا دیا تھا.....

میں نے بہن کے ساتھ ساتھ آپا کا ہوا کمرہ ہی
سنبھال لیا تھا۔

آپا کے اور آپا کے چاروں بچوں کے کپڑے
سینے اور کاڑھنے تک میں ہی تیار کرتی.....
آپا بس آرام کرتیں.....

میری تعلیم مکمل نہ ہو سکی لیکن منا اور شہا کیوں
کے گھر کے کاموں اور الجھنوں سے دور رہیں سو وہ
ہمیشہ اچھے گریڈ لے کر ہی پاس ہوتیں..... اور میں
ان کی کامیابیوں پر خوش رہتی..... ہم بہنوں کی طرح
کھیلتے باتیں کرتے، اور پھر شہا کی منگنی ایک ڈاکٹر
سے ہو گئی اور میری شادی منزل سے.....

منزل ایک اسکول ٹیچر تھے لیکن بہت اچھے.....
میں محبت کی طلبگار تھی اور منزل مجھ سے بہت
محبت کرتے تھے.....

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم لفظ زوال پر
کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہی کہ وہ ہمارا
نقطہ عروج ہے لیکن درحقیقت وہ ہمارا نقطہ انجماد ہوتا
ہے اور وقت کی گرمی اس نقطہ کو مزید نیچے جانے پر
مجبور کر دیتی ہے.....

☆.....☆.....☆

آپا کے احسانات اور مہربانیوں کی گھڑی نے
کبھی میرا سراٹھنے نہیں دیا گو کہ اب میرے بھی چار
بچے تھے..... میری فرما برداری..... محبت.....
عزت..... آپا کے لیے روز اول کی طرح تھے۔

اگر آپا مجھ سے کسی کام کو آدمی رات کو بھی کہتی
تو میں کچھ بھی کرتی اپنے وسائل اور مسائل سے لڑتی
کبھی کبھی منزل کے حلقہ محبت سے باہر نکل جاتی لیکن
پھر بھی آپا کا مان رکھتی.....

میرے پاس گاڑی نہیں تھی میرے بچوں کا
نخیال ابا کا گھر تھا سو ہر ہفتے میں اپنے بچوں کو لے

کر سارا دن آپا کے گھر ضرور جاتی۔
کبھی کبھی آپا ہمیں الجھی ہوئی لگتیں.....
بیزار..... بیزاری جھنجھلاتی ہوئی سی.....

میرے بچوں کی محبتوں پر وہ اپنے ان کو جھڑک
کر رکھ دیتیں منزل آتے تو کبھی دل چاہتا تو اپنا کمرہ
بند کر کے سو جاتیں یا اپنی دہذمہ داریاں بتاتی رہتیں
جو انہوں نے ابا کی اٹھائیں ہیں..... نبھائیں
ہیں..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا.....

مجھے کچھ نظر نہیں آتا، اکثر منزل مجھے بہت سی ایسی
باتیں جتاتے جو میرے خاندان کی سیکریٹ تھیں.....
میرے دل کو منزل سے شکایت رہنے لگی۔

میں محبتوں میں سمجھوتہ نہیں کرتی.....
میں محبت کرتی ہوں اور بے تحاشہ کرتی ہوں
لیکن ایک بات آپا کو بتا دوں میں ہر کسی سے محبت
نہیں کر سکتی لیکن مجھے آپا اور آپا سے وابستہ ہر چیز
سے محبت تھی.....

محبت تھی.....!

☆.....☆.....☆

لکیر کے اس پار، برمودا ٹرائی اینگل میں
گھومتے..... چکراتے مجھے احساس ہو رہا ہے یک
طرفہ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے کہ جب وہ
بجھتی ہے تو کرنے والے کے منہ پر پڑتی ہے اور
پھر وہ اپنا ایسا نشان چھوڑ جاتی ہے کہ کرنے والے کہ
پاس کہنے کے لیے لفظ تو بڑی بات..... سانس لینے
کے لیے آکسیجن بھی نہیں بچتی.....

زندگی کے اس موڑ پر کھڑے ہو کر، جب وقت،
ریت کی طرح میری منگی سے پھسل گیا اب گزرا
وقت مجھ کو کبھی نہیں مل سکتا..... میں سوچ رہی
ہوں..... عشق حقیقی اور عشق مجازوں کے درمیان
بچکولے کھاتی میری زندگی.....

☆.....☆.....☆

مزل پلیز آپ اسکول سے واپسی پر آپا کے کمرے میرا موبائل لے آئے گا کل اس کو آپا کے پاس بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر بھول آئی ہوں موبائل نہ ہو تو لگتا ہے آپ کا دنیا سے رابطہ ہی ختم ہو گیا ہے میں نے صبح ناشتے کے وقت مزل کو دس منٹ میں کوئی پانچ مرتبہ تاکید کی۔

آپا کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کل جب اتفاقاً آپا کے گھر گئی تو ثناء اور مینا آئی ہوئی تھیں اور دلہن کے نکاح کا سوٹ کٹ رہا تھا.....
ماشاء اللہ ایسی رونق تھی کہ واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

”ارے آیا دیکھیں اس کو کہتے ہیں محبت صبح سے ہی میرے دل کو لگی ہوئی تھی آپ کے گھر آؤں، میرے پاس پیسے نہیں تھے میں نے بچوں سے کہا چلو کوئی بات نہیں 11-W زندہ باد لیکن جانا ہے..... دراصل آپا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دلہن کا جوڑا کٹ رہا ہو اور میں نہ ہوں۔“

ارے تم مجھ کو ہی فون کر دیتیں تو میں مٹھائی کا ڈبہ ہی لے آتی..... میں نے ثناء کا ویکس ہوا اور سونے کی چوڑیوں سے سجا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے شکوہ کیا.....
لیکن کمرے میں موجود کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا.....

”چلو بچو کو تو ہٹاؤ..... اس قدر قیمتی سوٹ ہے ہاتھ لگائے جارہے ہیں۔“ آپا نے میری طویل بات کا مختصر اور غیر متعلقہ جواب دیا۔

اور میں چپ سی ہو گئی.....
آپ کا کیا خیال ہے چپ نہ ہوتی تو اور کیا کرتی.....

☆.....☆.....☆

بھئی میں تنگ آ گئی ہوں ان ذمہ داریوں

سے اس کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ میرا بھی گھر بار ہے، بچے ہیں جب دل چاہتا ہے اپنے حواریوں کو لیے چلی آتی ہے۔

اور کیا امی آپ تو ساری زندگی ان کے مسائل میں ہی الجھی رہتی رہیں۔ حارث (آپا کا بیٹا) کی آواز آئی۔ وہ بول رہا تھا جس کو میرے سینے پر سر رکھے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی.....

کسی جذباتی لمحے میں، میں نے ابا سے ان کی ذمہ داریاں نبھانے کا عہد کر لیا تھا مجھے کیا پتا تھا وہ ایک لمحہ میری ساری زندگی پر محیط ہو جائے گا..... تنگ آ گئی ہوں میں ان سب سے۔

اور تم لوگ..... تم لوگ بھی بہت ہی قابو سے باہر ہو رہی ہو..... بھئی اب پتا کاٹو.....

کیا کرتی امی..... آپ یقین تو کریں، نہ فون کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا فون اٹھاتے ہیں، کس کے پاس ٹائم رکھا ہوا ہے، ان کے دکھڑے سننے اور ان محبتوں کی داستانیں کا جو بقول ان کے انہوں نے ہم سے کی ہیں، ہماری اپنی زندگی ہے کب تک ہم آپ کے رشتوں کو نبھاتے پھریں گے

الفاظ تھے کہ بارود..... وہ مسلسل بول رہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش فون کی چار جنگ ختم ہو جائے کاش جتنی محبت میں نے تم لوگوں سے کی ہے اتنی میں اپنے اللہ سے کرتی۔ وہ اللہ جو کہتا ہے تم ایک قدم بڑھاؤ میں دس قدم بڑھاؤں گا۔

وہ اللہ جو اپنے بندوں سے ان کی ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔

میں بدنصیب، انسانوں سے محبت میں اتنی غرق ہو گئی میں مخلوق کی محبت میں خالق کی محبت کو فراموش کر بیٹھی.....

میں نے ان انسانوں سے محبت کی جن کی حقیقت کم ظہری ہے۔

بعض اوقات ہم کو محبتیں وہاں لاکر پہنچاتی ہیں کہ
ہم مارے شرمندگی کے مز بھی نہیں پاتے
ہماری عزت و نفس..... اتا..... خود داری ہو
میں کہیں تحلیل ہو جاتی ہیں ہمارے ارد گرد لفظوں کی
آگ لگ جاتی ہے.....
ہم برمودا ٹرائی ایٹکل کے مصور میں ڈوبنے اور
ابھرنے لگتے ہیں.....

ہم ایک اندھے کنویں میں جا گرتے ہیں اور
ہمارے رشتے اس اندھے کنویں کے منہ کو اپنے
لفظوں کے نوکیلے پتھروں سے بند کر دیتے ہیں.....
آپا نے میرے اور اپنے بچوں کے درمیان
ایک لکیر کھینچی ہے..... ایک ایسی لکیر جو ان کی زندگی
میں میری حیثیت اور اوقات کا تعین کرتی ہے.....
اب شاید آپا چاہیں بھی تو وہ کھینچی ہوئی لکیر
کبھی نہیں مٹ سکتی.....

میں محبتوں کی ترسی..... ایک ایسی لڑکی تھی جس
کے گرد کوئی رشتہ نہیں تھا.....
میرا سب کچھ تھیں آپا.....
آپ کے لیے میں نے ہمیشہ منزل کی بات کو رد
کیا.....

آپ کے حکم اور آپ کے فیصلوں کو اپنی زندگی
اور گھر میں رائج کیا..... اور نتیجہ میرا بہت محبت
کرنے والا شوہر ایک روایتی مرد بن گیا.....
میں نے آپ کے جوان بچوں کی خوشیوں پر
اپنے معصوم بچوں کی شرارتوں کو بھی محبت سے جواب
نہیں دیا..... میرے بچے مجھ سے دور ہو گئے۔

میں صرف ان کے کام کرنے والی ایک عورت بن گئی۔
میں نے سارا خزانہ محبت لٹا دیا..... آنے والے
وقتوں کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہا.....

میں کیا کروں کس سے قصہ غم کہوں؟
کسی کو بتاتی ہوں تو لوگ سوال کریں گے.....

میں کسی سے کیا کہوں گی کہ محبتوں میں سوال نہیں
ہوتا..... محبتوں میں سودے بازی نہیں ہوتی.....
میں بد نصیب محبت ہوں.....
میری محبتوں کے نصیبوں میں زوال تھا.....
زوال محبت.....

پائیمالی محبت.....
تقدیر میں رقم تھی..... اور تقدیر.....
☆.....☆.....☆

کاش میرا موبائل چھن جاتا..... چوری ہو جاتا.....
کاش مجھے نہ ملتا.....

جب منزل نے بتایا کہ موبائل آپا کے کمرے
میں نہیں ہے میں آپا کی سیڑھیوں پر گرا آئی تھی.....
جو آپا کے بچوں کو مل گیا تھا.....
اس بات کو سن کر کئی کاش میرے آئینہ زندگی
کا حصہ بن گئے.....

☆.....☆.....☆

لکیر..... دیوار..... بن گئی تھی۔

گارے اور سیمنٹ کی جگہ میرے خون اور
گوشت کے چیتھڑے جھانک رہے تھے۔

میرا دم گھٹ رہا تھا.....

میرا دل دھاڑے مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا.....

لیکن روایتوں کی رشتوں میں گہری.....

میکہ اور سسرال کی چکی میں پستی.....

میں ایک مشرقی عورت.....

میں نے آنکھیں بند کر کے..... مصلحتوں کے
ہاتھ کانوں پر رکھ کر.....

کرب کی چادر میں اپنے آپ کو چھپا لیا.....

اور اب مجھے اسی طرح.....

ان ہی حقیقتوں سے آنکھ پھولی کھلتے ہوئے جینا تھا.....

اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

☆☆.....☆☆

رحمن، رحیم، سید اسحاق

گو تو میری بھی خالی تھی ناں عبداللہادی! نا مراد تو میں بھی تھی۔ پھر لاریب نے یہ سخاوت اور فیاضی صرف مجھ کے لیے کیوں دکھائی؟ کیا اس کے لیے یہ گھر کی بات تھی.....؟ یا ان کا دکھ سا بھٹکا تھا۔ اور میں..... میں جولاریب کی گہری سہیلی تھی۔ راز داں تھی۔ اس سے سب سے.....

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا تیر ہواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے درپچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پھتادوا، ملاں، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے دشتوں میں بھٹاتا ہے۔ گندگی اور پلیدی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرچن نو جوان جو اپنی خودی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جسی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناچائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب ناچا ہے۔ ہونے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے..... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبد الغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھٹکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوہر کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر



اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوہر تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا ادبائش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی می اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاأبالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لااعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیاد یا اور سرد مہر ہی نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔ اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ می کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جیسی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے سے روار کھا جانے والا می کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی رنجش اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایک سیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ می اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ می جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو نا پسند کرتی ہے۔ جیسی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو رد کرنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنور لی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں..... اس سلسلی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساس جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی منتظر ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لااعلق اور بے گامگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھا۔ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوہر کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو مجبور کرنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم پانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عمر ایک بد فطرت عورت کے وطن سے جنم لینے والی با کردار اور با حیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرز زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تار عنکبوت نے اسے اپنے منہوس بچوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب ملاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے ہیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاسلیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عمیر کو حالات اس کج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اسے اپنی پُر شفقت پناہ میں لے کر اس کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ ام جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اسے قابل بھروسہ جان کر عمیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں ان کا یہ فیصلہ قبول کر کے عمیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اس بارے میں کوئی ذکر تو گنج مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عمیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اس لیے لاریب کو سمجھنا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اس کی مام سے ملنے ان کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں بچے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہوئی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور عمیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

اے میرے کن فیکون
میں تیری حد سے کہاں دور نکل سکتا ہوں
تیری مرضی ہے مجھے توڑ دے یا پھر سے بنا
پھر مجھے خاک کر کے یونہی جینا سکھا
میرے اندر جو خلا ہے میرے مالک بھر دے
تو نے جو خاص توجہ سے بنایا ہے یہ دل
اس کو مٹی میں ملا دے یا پھر پورا کر دے
میرے خالق! میں تیرے کن کی طلب میں زندہ
ہر گھڑی ایک قیامت سے گزر جاتا ہوں
اتنی شدت سے میرا پہلو سلگ اٹھتا ہے
ضبط کی ہر حد سے گزر جاتا ہوں
مر جاتا ہوں
اے میرے کن فیکون
اے میرے کن فیکون!
دعا کو پھیلے ہاتھوں میں آنسو پلکوں کی جھالروں

سے ٹوٹ کر بے تابانہ بکھر جاتے تھے۔ بے قراری کا
عجب عالم تھا۔ سوز و گداز روح پگھلائے جاتا تھا۔ وہ
جب بھی بارگاہ ایزوری میں حاضر ہوتی انکساری و
عاجزی کے ساتھ گر گڑا ہٹ کا انداز ایسا ہی ہوا کرتا
تھا۔ عبدالہادی نے بارہا مرتبہ اب تک اس کی
کیفیت دیکھ رکھی تھی۔ مگر آج انداز میں عجیب سی
وحشت بھی پائی تو خود مضطرب ہونے لگا۔ بہت بار
چاہا، آگے بڑھے اور دلا سہ دے مگر ہر بار رک گیا وہ
جس دربار میں حاضر تھی وہاں خالق و مخلوق کے بیچ
حائل ہونے کی جرات کسی تیسرے کو نہیں ہو سکتی۔
وہاں ضرورت بھی نہیں ہوا کرتی کسی تیسرے کی.....
خالق سے بڑھ کر مخلوق کو سمجھنے سمجھانے اور دلا سہ
دینے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ بھی خاموش بت بنا
بیٹھا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود منہ پر
ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جائے نماز تہہ کر کے اس

کی نگاہ عبدالبہادی پر انکھی، اسے موجود اور متوجہ پا کر
نجانے کس احساس سے اس کا چہرہ سرخ پڑا تھا۔
جب ہی ہونٹوں کو باہم بٹھینچتے ہوئے رخ موڑ لیا۔
عبدالبہادی نے گہرا سانس بھرا اور خود اٹھ کے اس
کے مقابل آ گیا۔

گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک تر ہونٹ شدت
جذب کے باوجود کپکپاتے تھے۔ صبح کی تمام تازگی
اور روشنی سمیٹے چہرہ حزن کے باوجود جکڑ لینے کی
صلاحیت سے مالا مال تھا۔

”آج کچھ زیادہ اداس ہیں لیزے.....؟“
عبدالبہادی نے ہاتھ بڑھایا اور اسے بازو کے حلق
میں لے لیا۔ وہ چپ رہی البتہ سسکیاں پھر بے
بکھر نے لگی تھیں۔ عبدالبہادی نے اسے سمیٹ کر خود
کے اور قریب کیا۔

”اگر اس خیال سے کہ یہاں سے جانے پر آمادہ
نہیں ہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا آپ.....“
”یہ بات نہیں ہے.....“ وہ بے اختیار ٹوک
گئی۔ عبدالبہادی نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔ گویا وجہ جاننا
چاہی۔ وہ محض ہونٹ کچلتی ہاتھ کی انگلیاں مروڑتی رہی۔
”لیزے.....! عبدالبہادی کہ لہجے میں اصرار
نہیں تھا۔ التجا آمیز عاجزی تھی۔ گویا اسے یقین
سونپ رہا ہو۔ اس کی یہ بے قراری، یہ اضطراب اس
کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔“

”آپ کہتے ہیں ناں عبدالبہادی! اللہ نے مجھے
معاف فرما دیا ہوگا.....“

اس کی آواز بھیگی ہوئی اور بہت دکھ میں ڈوبی
ہوئی تھی۔ عبدالبہادی نے انگشت شہادت سے اس کا
نم گال تھپکا۔

”کیا شک.....“ وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ
گھپ اندھیری رات میں گویا صبح امید جیسی حوصلہ
افزا اور دل نشیں ہوا کرتی تھی یا علیزے کو ہمیشہ لگتی تھی

مگر آج اس کا دل بہلانے کا باعث نہ بن سکی۔ وہ
اتنی ہی زود رنج ہو رہی تھی۔

”ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے عبدالبہادی!
آج پورے دو سال..... ان دو سالوں میں سب پہ
اللہ کی ہر نعمت و عنایت ہوئی سوائے ہمارے.....
بھائی کے ہاں عبدالعلی اور احد کے بعد بیٹی چلی آئی۔
دو دن کی ہو گئی ہے وہ بھی۔ غیر کو بھی اللہ نے بیٹے
سے نوازا یہ الگ بات کہ وہ جی نہیں سکا۔ بجو بھی پھر
امید سے ہیں اور میں.....“

”وہ بات مکمل کیے بنا پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی۔ عبدالبہادی جو بہت دھیان سے سن رہا تھا، گہرا
سانس بھر کے رہ گیا۔

”کیوں پریشان ہوتی ہیں علیزے! صرف دو
سال گزرے ہیں، ہماری زندگی تو نہیں اللہ سے
ہمیشہ پر امید رہتے ہیں سویت ہارٹ!“ وہ اسے
صوفے پر بٹھا کر خود اس کے لیے پانی لینے چلا گیا۔
واپس آیا تو زبردستی دو گھونٹ پلا سکا تھا۔ وہ اسی
اضطراری کیفیت کے زیر اثر سرکونی میں جنبش دیتی رہی
اور اسی تسلسل سے آنسو بہاتی گئی۔

”آپ سمجھے نہیں ہی عبدالبہادی! یہ بھی میری
غلطی، میرے گناہ کے باعث ہو رہا ہے۔ میں نے
..... میں نے اس کی نعمت کو ٹھکرایا تھا۔ کل کیا تھا، خود
اپنی اولاد کو یہ گناہ چھوٹا تو نہ تھا۔“

وہ جائز تھا، یا ناجائز تھا۔ مگر تھا۔ تو اولاد ہی
نا..... عبدالبہادی مجھے اس گناہ کی پاداش میں اولاد
نہیں مل رہی ہے۔“

اس کی آہ و بکا میں تاسف و ملال کا رنگ
تھا۔ عبدالبہادی نے بے ساختہ و بے اختیار اسے
بازوؤں کے حصار میں مقید کر کے سینے سے لگا لیا۔

”میری جان.....! میری جان رومت پلیز
دیکھو وہ گناہ، وہ غلطیاں تمہاری تب کی تھی جب تم

ڈیر قارئین! السلام علیکم!

اللہ پاک ہمیشہ آپ پر مہربان ہو۔ آپ خوش رہیں (آمین)۔

پچھلے ماہ رمضان رحیم سدا سائیں کی جو مستوط آپ نے پڑھیں، حالات جس طرح تیزی سے سدھرے، واقعات جس انداز میں سٹے زندگی جس میں طمنائیت سے مسکرائی۔ آپ نے سمجھ لیا اس کہانی کا اختتام بھی ہو گیا۔ عموماً کہانیوں کے اختتام اسی انداز میں ہوا کرتے ہیں مگر یہ کہانی اس طرح ختم نہیں ہوتی۔ میں اللہ سے اسے مزید لکھنے اور بہتر اور بھرپور لکھنے کی درخواست گزار ہوں۔ مجھے لگھتے ہوئے اب آٹھ سال ہونے والے ہیں۔ اس عرصے میں اس انوکھی کیفیت سے میں کبھی ہم کنار نہیں ہوئی جو رحمن سدا سائیں کے دوران مجھ پر آشکار ہوتی رہی ہیں۔ میں حیران ہوں اس ناول کو جتنے گریز، ڈر، خوف اور ہچکچاتے ہوئے آغاز کیا تھا، وہ مجھ سے اختتام پذیر کیوں نہیں ہو رہا؟ پہلے میں نے خود لکھا۔ پھر مجھ سے یہ لکھوایا گیا۔ اس کے بعد میں خود اس کو لکھنا چاہتی ہوں۔ مکمل آمادگی، خوشی اور رضا کے ساتھ۔ یہ تین حصے ہو گئے ناول کے۔ ان میں میری کیفیات اگر الگ تھیں تو ناول کے رنگ بھی اتنے ہی بدلے ہوں گے یہ لازمی بات ہے۔ ایک بات میں نے جانی ہے اس دوران..... کہ اس کائنات میں سب سے مشکل اور دلچسپ مطالعہ انسان ہے۔ بے حد پرت دردت شخصیت ہوتی ہے انسان کی..... یہاں انسانی نفسیات و احساسات کی ہی اہمیت ہے۔ یہاں جینز (عادت و فطرت جو قدرتی طور پر نسل در نسل منتقل ہوتی ہے) کا خصوصی ذکر ہے۔ اس میں بھی شک شبہ نہیں ہے کہ زندگی ازل سے اپنے واقعات حالات اور کہانی کو دہرا رہی ہے۔ وہ مکافات عمل بھی ہو سکتے ہیں۔ آزمائش بھی۔ یہ کہانی حال کی کہانی ہے یہاں تک..... ماضی کا حصہ نہیں بنی مگر ہم مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں ظاہری بات ہے تصور ہی ہوتا ہے اور تصور انسان شعوری یا لاشعوری طور پر ہمیشہ حسین ہی باندھتا ہے میں نے بھی حسین تصور باندھا ہے جس میں کھونا گم ہونے کے مستحق ہوں گے تو اپنے اس ناول کی کہانی کے کرداروں کے ہمراہ ہوتے ہیں اس خواہش دعا اور امید کہ ساتھ کہ واقعی ہمارا مستقبل ایسا ہو۔ امن و شانتی سے بھرپور آمین۔ دعا میں یاد رکھیے گا۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی ناصر ہو۔ اللہ پاک میرے والدین بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کو اپنی پناہ اپنی عافیت میں رکھے، عمریں دراز فرمائے۔ نیکی کی ہمت و توفیق کے ساتھ۔

وسلام ام مریم

پوری طرح شیطان کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔
معافی ضرور مانگو۔ توبہ کرو مگر یہ نہ سوچا کرو کہ اللہ
معاف نہ کرے گا اور یہ بھی نہ سوچا کرو کہ اللہ سزا
دے رہا ہے اس کے برعکس یہ خیال پختہ اور یقین
کامل کرو کہ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ
دے کر بھی آزماتا ہے اور نہ دے کر بھی آزماتا ہے،
جیسے غیر بھابی کو، جیسے تمہیں..... جیسے بریہ بچو کو، جسے

لا ریب بھابی کو۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ اسے بہلا
رہا تھا۔ اس کی وحشت دھیرے دھیرے قرار پانے
لگی اس کا اضطراب ڈھلنے لگا۔ سسکیاں ہچکیوں میں
بدلیں پھر ہچکیاں بھی دم توڑنے لگیں وہ یونہی اس
کے ساتھ لگی نیم دراز ہو گئی۔

عبدالہادی نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوما،
تب اس نے نڈھال انداز میں آنکھیں کھول کر

اے لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔ اے عبدالبہادی کی مسکان حوصلہ افزا لگی، امید دلاتی ہوئی اسے وہ رب کا سب سے خوبصورت انعام محسوس ہوا۔ ایسا انعام جس کے ذریعے وہ اس سے سارے کام کروا رہا تھا۔ اس کا دل انوکھے سکون سے لبریز ہو گیا دوبارہ آنکھیں موندنے سے قبل وہ آسودگی سے مسکرائی تھی اور عبدالبہادی کے اندر جنموں کا قرار اترتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”بیٹی مبارک ہو۔ اللہ ہمیشہ خوشیوں سے نوازے ہماری بچی کا نصیب اچھا کرے آمین۔“

لاریب نے جیسے ہی عبدالغنی کا سہارا لیے گھر کے اندر قدم رکھا ان کی کب سے بے قراری سے منتظر غیر لک کر آگے آئی تھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاب اور گیندے کے پھولوں سے گندھا مالانما ہار بے حد محبت سے لاریب کے گلے میں ڈال کر اسے دوسری جانب سے خود سہارا دیا تو ماما جو ساتھ ہی کھڑی تھیں مسکراتے ہوئے سائیڈ پر ہو گئیں۔

لاریب نے جواب میں مسکرا کر محبت آمیز شکر بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اور یونہی سہارا لیے اندر کمرے میں آگئی عبدالغنی نے اسے آہستگی سے بستر پر لٹایا تو عمیر نے پشت پر تکیے رکھ دیے تھے۔۔۔

بچی کو عمیر نے پیار کرنے کے بعد اس کے پہلو میں لٹا دیا جو سکون آمیز نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے۔ بالکل آپ جیسی.....“

عمیر کے لہجے میں محبت کا سمندر جیسے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لاریب کے چہرے پر نقاہت بھری تھکی تھکی مسکان تھی۔ رنگت زردی کی جانب مائل۔

”آپ بیٹھے آئی.....! میں چائے بنا کر لاتی ہوں لاریب سوپ لاؤں آپ کے لیے.....“ وہ رک کر مسترا نہ نگاہوں سے لاریب کو تنکے لگی

لاریب نے سرکونی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں! ابھی دل نہیں کر رہا۔“ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ عمیر پلٹ گئی تو لاریب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

”عبدالعلی اور عبدالغنی نظر نہیں آرہے ہیں.....؟“ ام جان اس سوال پر مسکرا رہی تھیں پھر نرمی سے گویا ہوئیں۔

عبدالعلی ٹیوشن گیا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے بھیجا ہے چھوٹی دلہن نے ہزار منت کے بعد۔ کہہ رہا تھا۔ آج والدہ ہماری ڈول کو گھر لے کر آئیں گی میں گھر پہ رک کر انتظار کروں گا۔ عبدالواحد کچھ دیر پہلے ہی سویا ہے۔“

”کیوں فکر کرتی ہو بیٹی! یہ بچی بہت نیک ہے تم سے زیادہ ہی محبت کرتی ہے بچوں سے۔ سچ پوچھو تو تم.....“

ممی نے مسکراتے ہوئے کھلے دل سے عمیر کو سراہا تھا۔ جو چائے کے لوازمات سمیت اندر آئی اور جھینپ کر مسکرا دی۔

”نہیں آئی! لاریب اس لیے پوچھ رہی ہیں بچوں سے یوں کبھی الگ نہیں ہوئیں۔ اب تین چار دنوں بعد گھر آئی ہیں تو.....“ وہ نرمی سے وضاحت دے رہی تھی۔ لاریب نے بے ساختہ تقاخر آمیز مسکان سے اسے دیکھا تھا۔

”بالکل ٹھیک..... ممی اس سے قبل کبھی ایک آدمی کی دو بیویوں کی ایسی انڈر اسٹینڈنگ دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔ کیوں عبدالغنی!“ وہ شرارتا پوچھ رہی تھی عبدالغنی نرمی سے مسکرا دیا۔

”یہ رب سونے کا کرم ہے مجھ پر۔“ اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

”مجھ پر بھی رب سونے کی عنایات اتنی زیادہ ہیں عبدالغنی کہ اکثر شرمندہ ہونے لگتی ہوں۔ میں اس قابل کہاں تھی جتنا وہ مجھے نواز رہا ہے۔ سب سے بڑا کرم آپ، پھر

ہماری اولاد..... ایک کے بعد ایک نعمت اور رحمت.....
جب وہ کمرے میں عبدالغنی کے ہمراہ تنہا ہوئی
اس کے ہاتھ تھا۔ مگر آبدیدہ ہو گئی تھی۔ عبدالغنی کچھ
نہیں بولا بس اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔
عبدالغنی اس بچی کا نام رکھ دیں ناں اب.....
وہ جھک کر بچی کو پیار کر رہی تھی اسے سراٹھا کر
دیکھنے لگی۔

”تم بتاؤ جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔“ عبدالغنی کی
مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”پھر وہ رکھ دیں گے.....؟“ لاریب کے سوال
نے عبدالغنی کو متحیر کر ڈالا۔

”کیوں نہیں میری جان آپ بتاؤ تو.....“

”اتباع.....!!!“ نام اس کی زبان سے نکلا
تھا۔ اور عبدالغنی اپنی جگہ ساکت ہو کر اسے تکتا رہ
گیا۔ حیرانی..... حیر..... استعجاب کیا کچھ نہ تھا۔ اس
کی نظروں میں۔

”میں جانتی ہوں اگر عیسیٰ کی بیٹی زندہ جہنم لیتی تو وہ
یہی نام رکھتی اس کا۔ خدا کے کاموں میں مداخلت کی
مجال نہیں ہے عبدالغنی! مگر میں عیسیٰ کو یہ مان، یہ خوشی دینا
چاہتی ہوں۔ آپ منع نہیں کریں گے پلیز!“

اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ بے حد ملتی ہو کر کہہ
رہی تھی۔ آنکھیں جانے کس احساس کے تحت بے
تحاشا نم تھیں۔ عبدالغنی کچھ نہیں بولا بس مسکرا دیا
گزرنے والے ماہ و سال نے لاریب میں جو
تبدیلیاں کی تھیں ان میں سب سے قابل تحسین اور
تفاخر آمیز تبدیلی نہ صرف عیسیٰ کو اس کی حیثیت اور
اہمیت قبول کرنا بلکہ اس کی محبت میں ہر گزرتے دن
کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ عبدالغنی کے ایکسڈنٹ اور
پھر بعد میں صحت یابی کے بعد جس دن اس نے خود
عیسیٰ کو دلہن کا روپ دے کر عبدالغنی کو پوری آمادگی کے
ساتھ اس کے حوالے کیا تھا۔ اُس روز عبدالغنی یہی

سمجھ رہا تھا۔ وہ خود پہ ضبط کر رہی تھی۔ اسے کھونے
سے خائف اور اللہ کے ڈر کے باعث انصاف کے
تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ مگر گزرتے وقت نے
قدم قدم پہ عبدالغنی کو یہ احساس بخشا تھا کہ ان
سارے احساسات کہ ہمراہ اک احساس محبت کا بھی
ہے۔ وہ محبت اللہ کی ہے یا پھر عیسیٰ کی..... بس وہ صحیح
طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں رہا
تھا۔ کہ لاریب کا دل بہت وسعت سمیٹ لایا۔ وہ جو
اس کی جانب کسی کا دیکھنا بھی برداشت نہیں کر سکتی
تھی۔ عیسیٰ کی پریشانی کے دوران پھر جب دونوں بار
اس کے ہاں مردہ بچوں کی ولادت ہوئی تو اس نے
عیسیٰ کی دلجوئی کے خیال سے عبدالغنی کو مستقلاً عیسیٰ کے
ساتھ کر دیا تھا کئی کئی مہینوں تک۔ خود اپنی رضا و مرضی
سے عبدالغنی اگر خود اس کے کمرے میں بھی آتا تو وہ
اس سے اتنا اصرار کرتی اور عیسیٰ کے خیال رکھنے کی اتنی
نصیحت کرتی کہ بس وہ اسے دیکھتا رہ جاتا۔

”کیا ہوا عبدالغنی! میری بات بری لگی یا.....“

اس کی مہیب خاموشی کو پا کر وہ ہراساں ہو گئی۔

”لاریب..... میری جان!“ عبدالغنی نے نرمی
و عاجزی سے کہا اور اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر
عقیدت مندانہ نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔

”مجھے برا لگ سکتا ہے؟ میں تو بس شکر سے لبریز

ہو گیا ہوں۔ دکھ بھی ہوا اپنی سوچ پر کبھی یہ خیال
میرے دل میں تھا تمہاری شدت پسندی کے باعث
کہ دو شادیاں کر کے برا پھنسا ہوں۔ سکون کو ترسوں
گا۔ عمر بھر..... اور پھر عنایت فرمانے والے رب نے
اتنا کرم کیا۔ ایسی عنایت کی بارش برسائی کہ آج تک
اس سوچ پہ نادم ہونے سے فرصت نہیں۔ اس وقت
بھی ایسے ہی احساسات تھے۔“

بچی کسمسا کر روئی تو عبدالغنی یکدم خاموش ہو کر
متوجہ ہوا اور اسے تھپکنے لگا مگر وہ چپ ہونے کے

بجائے رونے کی رفتار بڑھانے لگی۔ عبدالغنی نے گھبرا کر لاریب کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنی والدہ کے پاس آنا چاہ رہی ہے۔ شاید بھوک بھی لگی ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے تو پھر برائے کرم اس کی والدہ ماجدہ کو بلا دیجیے۔ یہاں سے تو شاید ہی ان تک آواز پہنچ جائے۔ اب کے اس کا لہجہ و انداز گفت و محسن بم تھا۔ مگر عبدالغنی کے لیے پوری طرح نا فہم جمی اس نے انجمن آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ جو سکراری تھی اطمینانیت اور آسودگی کے ساتھ۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ وہ پریشان کھڑا تھا۔ لاریب دھیرے سے ہنس دی تھی۔

”غیر کو بلائیں بھئی وہی فیڈ کروائے گی اسے اس لیے اس کی ماں میں نہیں میرے۔ ویسے تو اس گھر میں ہمارا کچھ بھی بانٹنا ہوا نہیں ہے عبدالغنی! مگر یہ جی.....! یہ صرف غیر کی ہے اور سن لیں یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ میں آپ سے بھی جانت نہیں لے رہی پھر مشوارے کی کیا گنجائش.....“ اس کا مدھم لہجہ دو ٹوک اور حتمی تھا۔ عبدالغنی گنگ ہونے لگا جب کہ وہ اسی قدر بے سکون تھی۔

”لاریب تم.....“

عبدالغنی.....! مجھے معلوم ہے میں جذباتی نہیں ہو رہی ہوں۔ یہ فیصلہ صرف دل کا فیصلہ بھی نہیں ہے، میں نے یہ فیصلہ سال پہلے کیا تھا۔ جب میرے بچے کو جنم دیا اور محروم رہ گئی۔ اس کا دکھ صرف اس کا نہیں تھا۔ آپ گواہ ہیں میں ہر لمحہ اس کے دکھ میں شریک رہی ہوں۔ تب میں نے چند ماہ کے عبدالواحد کو اسے دینا چاہا مگر ایسا نہیں کر پائی۔ ہاں میں نے خدا سے تب ہمت اور حوصلہ ضرور مانگا تھا۔ اور دعا بھی..... کہ وہ مجھے اولاد سے نوازے تو میں وہ اولاد غیر کو دے دوں گی مگر اس سے پہلے ہی اللہ نے غیر کو پھر امید دے دی۔ دوسری بار بھی وہی دکھ دے دیا تو میں

نے جانا عبدالغنی! وہ مجھ سے کہیں اللہ کے نزدیک ہے جمی تو اسے آزما رہا ہے۔“ وہ اب رو رہی تھی۔ عبدالغنی گم صم بیٹھا تھا۔ معاوہ سنبھلا اور اس کے نم گال تھپکے۔

”تم پریشان مت ہو اللہ بہتر نوازنے والا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں عطا فرمانے والا۔ عبدالغنی کا لہجہ و انداز بوجھل تھا۔ لاریب نے ہلکی بھری اور نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں عبدالغنی! اللہ بہتر نوازنے والا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے عطا فرمانے والا..... عبدالغنی مگر اللہ وہ ہے جو کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر۔ غیر کی آزمائش دے کر واپس ہوئی ہے مجھے وہ اپنی نعمتوں سے اتنی فراخ دلی سے نواز رہا ہے، تو مجھ سے سوال بھی کرے گا ان نعمتوں کے متعلق عبدالغنی! اللہ نے حکم دیا ہے مسکین کو کھانا کھلانے کا یہ کھانا وہ خود بھی چاہتا تو کھلا سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ کام اپنے بندوں کے سپرد کر دیا کیوں.....؟ مقصد ان سے نیکی کروانا ہے۔ وہ قر بانی کا حکم دیتا ہے۔ ایثار کرنے کو کہتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے غنی ہے۔ جسے چاہے بانٹ دے نعمتیں، جسے چاہے دے، جسے چاہے بھوکا رکھ دے، روز قیامت وہ بھوکے سے سوال نہیں کرے گا وہ پیٹ بھرنے والوں سے ضرور پوچھے گا۔ تیرے پاس گنجائش سے زیادہ تھا۔ تو نے میرے بندے کا خیال کیوں نہ رکھا۔ آپ سمجھیں عبدالغنی.....! یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔“

وہ مسلسل بولتے ہانپ گئی تو چپ کر گئی۔ عبدالغنی ہنوز چپ تھا۔ اس کی خاموشی کے ساتھ پہلے تھیر تھا۔ پھر غیرت یعنی اس کے بعد اس کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی، پھر آسودگی اور سکون کے ساتھ تشکر بھی اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔ کچھ کہے بغیر اس نے جھک کر لاریب کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔

”تمہارا جذبہ قابل قدر ہے لاریب! جزاک

”ہم کہاں جا رہے ہیں اہل! ماموں کے گھر؟“ بریرہ اسے مونہ پہنا رہی تھی جب چھ سالہ عبداللہ نے اچانک سوال کیا تھا۔ بریرہ نرمی سے مسکرا دی۔

”جی میری جان میرے پسر! ماموں کے گھر جا رہے ہیں۔ چلیں جا کر اپنے بابا جانی سے کہیں وہ بھی آجائیں۔“ بریرہ نے اسے جوتے پہنا کر بیڈ سے اتارنا چاہا تو وہ خود ہی چھلانگ لگا کر نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ ”وہاں بھی اک اور ڈول آئی ہے۔ ہماری امن جیسی؟ مجھے دادو نے بتایا ہے۔“ اس کی آنکھیں اس پل اشتیاق آمیز احساس نے کتنی روشن کر دی تھیں۔ وہ ہارون اسرار اور بریرہ دونوں کا عکس تھا۔ جب ہی اس کی خوبصورتی ایسی تھی کہ راہ چلتے لوگ بھی اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ البتہ مزاج بہت نازک تھا۔ بہت زیادہ جیسا کبھی بریرہ کا تھا، جیسے بعد میں ہارون کا ہو گیا تھا۔“

”جی بیٹے! دادو نے بالکل ٹھیک بتایا ہے آپ کو۔“ بریرہ اب امن کی جانب متوجہ ہوئی جو سو رہی تھی۔ وہ اسے سوتے سے جگائے بغیر ہی کپڑے بدلوانے میں مصروف ہو گئی۔

”دادو یہ بھی بتا رہی تھیں وہ والی ڈول کچھ زیادہ ہی انوسٹیٹ اور فیسٹیٹک ہے اماں..... اگر وہ امن سے زیادہ کیوٹ ہوئی تو ہم امن سے چیخ کر لیں گے۔ وہ والی لے آئیں گے خود۔ امن دیے بھی مجھے زیادہ اچھی نہیں لگتی۔ ہر وقت چیختی ہے۔“ جوش و خروش سے کہتا اس کا لہجہ آخر میں کچھ بے زاری سمیٹ لایا تھا۔ جسے اندر داخل ہوتے ہی ہارون نے سنا اور بے اختیار ہنسنے لگا۔

”حد ہو گئی ہے بر خوردار آپ سے بھی۔ آپ کی اس فرمائش کو اور بھی کسی احسن طریقے سے پورا کیا جا سکتا ہے۔“ اس نے جھک کر عبداللہ کو اٹھا کر اس کا ماتھا۔ چوما اور پھر گلا کھنکار کر بریرہ کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

”کیا خیال ہے بیگم صاحبہ! شہزادہ ولی عہد کی خواہش پوری کر دیں۔ اس طرح تاریخ بھی دہرائی جائے گی، بڑے خوبصورت انداز میں؟“ بریرہ نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا پھر جھپک کر مسکرا دی تھی۔ ”سچ پوچھیں تو میرے دل کی بات کہہ دی آپ نے۔ میرا بھی بڑا دل کر رہا تھا۔ ابھی سے بھائی اور لاریب کے کانوں میں بات ڈالنے کو۔ آپ مئی سے بات کریں۔ میرا نہیں خیال وہ منع کریں گی۔ رنگ جو ہم پہنا رہے تھے۔ بچی کو وہ نسبت کی بھی رنگ ہو جائے گی۔“ اس کو جوش و خروش یکا یک دیکھنے کے لائق ہو گیا۔ گلابی گال دہکنے لگے۔ آنکھوں میں موجود روشنیاں بے تحاشا بڑھ گئیں۔ ہارون اسے دیکھتا رہ گیا مبہوت ہو کر۔

”یہ میرے نہیں آپ کے بیٹے کی دل کی خواہش ہے محترمہ! جو بہر حال ہمیں عزیز ہے۔ وہ متمم انداز میں گویا ہوا تھا۔ بریرہ کا جوش و خروش مزید بڑھ گیا۔ مئی سے بات ہونے کی صورت۔ مئی اس خیال پر مسکرانے لگی تھیں البتہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ صاف لگتا تھا۔ انہیں یہ بات پسند آئی ہے۔

”بس تو پھر آپ چلیے ہمارے ساتھ۔ سمجھیں عبداللہ کی نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔“ ہارون کے فیصلے پر مئی اسامہ کو ناپا کر قدرے ملول ہوئی تھیں، جو ارسل احمد کی علاج کی خاطر مستقل انگلینڈ میں قیام پذیر تھا۔ ارسل احمد بہتری کی جانب مائل تھا۔ بہتری بہت آئی تھی الحمد للہ! مگر اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ برداشت نہیں کر پار ہی تھیں۔

مصرف ہو گئی جب ہارون نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”کوئی قرض نہیں ہے۔ محبتیں قرض نہیں ہوتی پگلی!“ اور لاریب ٹھنڈا سا لٹ بھر کے رہ گئی۔

”اف اماں.....! یہ ڈول تو ہماری امن سے کہیں زیادہ فینسی نینک ہے دیکھیں اس کی رنگت بالکل پنک ہے۔ باربی ڈول جیسے بال ہیں اماں مجھے یہی ڈول چاہیے۔ آپ امن ماموں کو دے دیں بس۔“ عبداللہ کی اپنی الگ رٹ تھی۔ پہلے تو وہ پچی کو گود میں لینے پہ بھند تھا۔ جس سے بڑی مشکل سے اسے رد کا گیا۔ جب بریرہ نے پچی کو گود میں لیا وہ تب سے ساتھ چپک کر بیٹھا اس کے ننھے ننھے ہاتھ گال اور آنکھیں چھو چھو کر دیکھتا ہوا چپک کر رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ بھی دے دیا بریرہ مسکرا مسکرا کر وہ ساری باتیں دہرانے لگی جو گھر سے آنے سے قبل کرتا رہا تھا۔ جسے سنتے سب کے لبوں پر بے ساختہ مسکان اتر آتی تھی۔

”بھئی لاریب اور بھائی.....! دونوں سن لیں یہ اتباع زبانی کلامی نہیں واقعی عبداللہ کی ہونی چاہیے۔ ہم جھولی پھیلا کے آگئے ہیں باقاعدہ تیاری کے ساتھ۔“ اس نے اپنا پاؤں کھول کر ڈائمنڈ رنگ نکالی جو وہ اس ارادے سے ساتھ لائی تھی۔ یکدم ہر جانب خاموشی چھا گئی ام جان بابا جان اور مکی کے ساتھ صرف بریرہ اور ہارون ہی مسکرا رہے تھے۔ لاریب نے حیران ہو کر عبدالغنی کو دیکھا جو ہچکچاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”پلیز بھائی انکار نہیں۔ میرے بیٹے نے بہت چاہا ہے۔ مانگا ہے۔ ہم انشاء اللہ بہت محبت سے رکھیں گے ہمیشہ۔“ بریرہ اس خاموشی پہ گھبرا کر بولی اور لاریب کا ہاتھ ہاتھی انداز میں تھا۔ ما۔

”بیٹے بچپن کے طے کیے رشتے ناتے بڑے ہونے پہ بچوں میں.....“

جس وقت وہ لوگ ڈھیروں مٹھائی فروش کے ساتھ عبدالغنی کے گھر پہنچے تھوڑی دیر قبل ہی علیزے اور عبدالہادی بھی وہاں آئے تھے اور اتباع کو گود میں لیے لاریب فیصلے میں گم بیٹھی تھی۔ اس کے احساسات عجیب ہو چکے تھے۔ دل بھرا رہا تھا۔ اور شاکی بھی ہوا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی کو عبدالہادی نے ہی محسوس کیا تھا۔ اور اس کے احساسات کو سمجھ کر غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ چونک پر متوجہ ہوئی اور نرم نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ کتنے شکوے اس پل چل رہے تھے۔ اسے کی آنکھوں میں۔

”گود تو میری بھی خالی تھی ناں عبدالہادی! نامراد تو میں بھی تھی۔ پھر لاریب نے یہ سخاوت اور فیاضی صرف غیر کے لیے کیوں دکھائی؟ کیا اس کے لیے یہ گھر کی بات تھی.....؟ یا ان کا دکھ سا نبھاتا تھا۔ اور میں..... میں جو لاریب کی گہری سہیلی تھی۔ راز داں تھی اس سے سب سے قریب تھی۔ اسے میرا خیال کیوں نہ آیا۔ وہ جیسے کسی بھی پل رونے کو تیار تھی۔ عبدالہادی عجیب مشکل میں گرفتار نظر آنے لگا۔ اسے سمجھ نہ آئی اس پل ایسا کیا کرے کہ علیزے نہ صرف سنبھل جائے بلکہ اسے صبر بھی آ جائے۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگنا شروع کی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ علیزے میں ہنور جذباتیت تھی۔ وہ ابھی بھی کسی بھی حد تک بے وقوفانہ حرکتیں کر جاتی تھی اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ یہاں سب کی خوشیوں کے موقع پر علیزے کوئی بد مزگی نہ کر دے۔ اس نے پوری شدتوں سے رب کو دل ہی دل میں پکارنا شروع کر دیا۔

”اتنا تکلف..... بھائی حد ہو گئی۔ آپ تو قرض پہ قرض چڑھاتے جا رہے ہیں ہم پر۔“ لاریب ان کے ساتھ آنے والے لوازمات کو دیکھتی احتجاج میں

”اُم جان ہم سب ہی اللہ سے دعا مانگیں گے کہ اللہ ہمارے بچوں کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے۔ آپ سمجھ لیں یہ میری شدید خواہش ہے۔ ہم بڑی آس لے کر آئے ہیں۔ یہ صرف عبد اللہ کی ہی نہیں ہارون اور مئی کی بھی خواہش ہے۔“ اُم جان کے سمجھانے پر وہ تیزی اور بے حد لجاجت سے کہتی آس مندانہ نظروں سے انہیں نیکنے لگی تو اُم جان کے ساتھ بابا جان بھی مسکرا رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بچے! ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بسم اللہ کر لیں مگر باپ سے پوچھ لیں پہلے۔“ بابا جان نے رضا مندی دی تو جیسے ہر جانب سکون بکھر گیا۔ عبد الغنی کا اندھے اچکار ہے تھے۔

اگر بابا جان اور اُم جان کو اعتراض نہیں تو پھر میرا اعتراض کہاں سے نکلے گا۔ یہ والدائیں تشریف رکھتی ہیں، ان کی اصلاح بھی لے لیں۔“

عبد الغنی نے مسکراتے ہوئے بیڈ پہ بیٹھی لاریب اور صوفے پہ بچی کو گود میں لیے عبیر کو دیکھا۔ جس کا چہرہ کل بے حد منور و تابندہ نظر آ رہا تھا، جب لاریب نے اُم جان اور بابا جان کی موجودگی میں بچی اس کی گود میں دی تھی۔ اس کے گلے لگ کر رونی بچی کو چومتی اس کے ہر انداز، ہر احساس سے شکر ٹپکتا تھا۔

”آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لاریب! مگر یہ ایسا احسان ہے جس کا اجر آپ کو میرا پ دے سکتا ہے۔“ اس کا گلا بھراتا رہا مگر وہ بولتی ہی رہی تھی۔

”خیریت کا وسیلہ ہو اللہ میری بچیوں کے اتفاق و سلوک اور محبت میں برکت عطا فرمائے، آمین۔“

اُم جان نے دونوں کو لپٹا کر پیار کرتے کہا۔ اس فیصلے کو بریرہ نے بھی سراہا تھا۔ اور ہارون نے بھی، اسامہ نے بھی مئی نے بھی..... بس علیز سے رہ گئی تھی جو بے حد خاموش تھی اور لاریب اس کی خاموشی سے لے کر افسردگی تک کو محسوس کر چکی تھی۔

”والدائیں نہیں والدہ..... وہ تشریف رکھتی ہیں محترمہ! ان سے پوچھیں۔ انہیں یہ رشتہ منظور ہے؟“ لاریب جو علیز سے کو تک رہی تھی ماحول میں واپس آ کر بر جستگی سے بولی۔ سب ہی ہنس پڑے تھے۔ ”ہاں جی والدہ صاحبہ! دو بارہ سے دست بدست گزارش کریں کیا.....؟“ بریرہ نے رخ عبیر کی جانب پھیر لیا عبیر جو پہلے ہی شرمارہی تھی اس بات پہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔

”بجو..... پلیز شرمندہ نہ کریں۔ میں کچھ کہنے کی جرات کیسے کر سکتی ہوں جب بابا جان اور اُم جان اور انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے“ وہ خفیف سی مسکان کے ساتھ بولی بھی پھر جھک کر اتباع کو چوما اور بے حد محبت سے بولی۔

”بلکہ سچ پوچھیں تو میں اپنے رب کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ آج سے بیس سال بعد پیش آنے والا مرحلہ بھی اس نے ابھی پننا دیا۔ مجھے اپنی بیٹی کی خوش بختی پہ ذرا سا بھی شبہ نہیں رہا۔“ اس کے لہجے کا اطمینان اور اس سکون ایسا تھا۔ کہ جس پر فخر کیا جاسکتا علیز سے کو اس پہ رشک آنے لگا۔

”بے شک! مگر کیا پتا تم بھی میرے بیٹے کا پرو پوزل رد کر دیتیں۔ یا میں اپنے بیٹیوں کے لیے شہزادے ہی تو ڈھونڈتی ہیں۔“ بریرہ نے ہنستے ہوئے شگفتہ انداز میں کہا اور انگوٹھی کا کیس مئی کو تھما دیا کہ وہ بچی کو پہنا دیں۔ مئی مسکراتے ہوئے آئی تھیں۔

”اس میں کیا شک کہ ہمارا عبد اللہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں ہے۔“ عبیر نے بے حد محبت سے کہتے عبد اللہ کو پیار کیا جو اتباع اس کی گود میں ہونے کی وجہ سے اب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ”یہ تو ابھی سے دیوانہ ہو رہا ہے، بڑا ہو کر پتا نہیں کیا کرے گا۔“ مئی نے عبد اللہ کو ہنوز اتباع میں گھس پا کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ جو ضد کر رہا تھا۔ کہ انگوٹھی مئی

نہیں وہ پہنائے گا۔ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

”دیکھ لیں، یہ ابھی سے اپنا کام خود انجام دے رہا ہے۔ اس کی محبت پر شک نہیں ہونا چاہیے۔“ ہارون کے فقرے نے محفل کو کچھ اور زعفران زار کر دیا۔

”اللہ نصیب اچھے کرے، آمین۔“ مئی نے دعا دی تھی۔ سب نے یک زبان آمین کہا۔

”والدہ کیا یہ عبداللہ لے جائے گا، ہماری اتباع گڑیا کو.....؟“ عبدالعلی جو کب سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ تشویش میں مبتلا ہو کر بولا۔ اس میں شک نہیں تھا۔ اس کو عبداللہ کا اپنی بہن پر اتنا التفات ظاہر کرنا، توجہ دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ابھی نہیں بیٹے! ڈونٹ وری!“ لاریب نے اسے پچکارا مگر وہ پیر پٹختے لگا۔

”میں کبھی بھی نہیں دوں گا اپنی گڑیا! اس کی بھی تو ہے نا بہن! ہم نے تھوڑا مانگی۔“ وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔ سب حیران ہو کر مسکراہٹ دباتے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”لو بھئی عبداللہ صاحب! اتنا آسان نہیں ہے یہاں سے دلہن لے جانا۔ جی دار اور اکھڑا بھائی بھی ہے ایک اس کا.....“ ہارون شگوفہ چھوڑ کر خود ہی ہنسنے لگا۔

”بھئی آپ سب لوگ اتنی جلدی آمادہ ہو گئے۔ رشتہ دیا تھا۔ تو لینے کی بات بھی کر لیتے۔ لڑکا تو ہمارے پاس بھی تھا۔ آپ کے لڑکے سے ماشاء اللہ بڑا ہی ہے۔ پھر یہ تو زیادتی ہے ناں۔“ لاریب نے اس مذاق کو طول دیا تھا۔ مگر تب سے بامشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے علیزے مزید خاموش نہیں رہ سکی۔ جی بھی بھڑک اٹھی تھی۔

”فارگا ڈسک! ختم کریں یہ سارا سلسلہ، اور خبردار..... اب کوئی عبدالعلی کی بانٹ شروع نہیں کرے گا۔ اس پر کسی اور کا بہر حال کوئی حق نہیں ہے۔ بھوکا تو بالکل نہیں۔“ وہ اتنی سختی، اتنی سفاکی اور

تلخی سے بولی تھی کہ سب کے مسکراتے خوش باش چہرے یکدم تاریک پڑ گئے۔

”لیزے.....!“ عبدالہادی نے بے اختیار اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔۔

”علیزے بیٹے!“

”گڑیا!“ ام جان عبدالغنی بے ساختہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی جانب آئے مگر وہ کسی کی بھی طرف متوجہ نہ تھی۔ اس نے جھپٹنے کے انداز میں کچھ فاصلے پر موجود عبدالعلی کو بھیج کر سینے سے لگا کر بانہوں میں بھیج لیا۔

”یہ میرا ہے، صرف میرا۔ اس سے سب سے زیادہ میں محبت کرتی ہوں۔ اس..... اس پر سب سے زیادہ حق بھی میرا ہے۔“ آنسو گالوں پر اترتے عبدالعلی کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ ہچکیوں سے روتی تھی اور اس دیوانگی میں عبدالعلی کو بار بار چومتی تھی۔ جو حراساں و بیکل نظر آنے لگا تھا۔ عبدالہادی گہرا سانس بھر کے رہ گیا جبکہ عبدالغنی اور بابا جان کے ساتھ باقی سب بھی حیران پریشان اور ششدر تھے۔۔ معا عبدالغنی سنبھلا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”ہاں..... یہ عبدالعلی تمہارا ہے، صرف تمہارا حق ہے اس پر۔“ علیزے نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں اٹھا کر غیر یقینی سے اسے دیکھا پھر یونہی روتے روتے ہنسی تھی۔

”آآ آپ سچ کہہ رہے ہیں بھائی! کبھی مکر میں گے تو نہیں ناں؟“

عبدالغنی نے نم آنکھوں کے ساتھ سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ اطراف میں ابھی بھی سوگوار جاہد سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

دھک کی گنتی جانتا ہوں میں

سکھ نہ گننا آوے

میں ناشکر امیرے مالک!

ایک توفیق دلا دے

سکھ گننا سکھلا دے

نوٹنے لگا۔ علیزے اور شدتوں سے رو پڑی۔

”بس۔ میں ضبط نہیں کر سکی عبدالبہادی! میں

برداشت نہیں کر پائی! عبدالعلی سب سے زیادہ مجھ

سے قریب تھا۔ میں نے بچو سے کہیں بڑھ کے لاڈ

اٹھائے اس کے۔ جب سے شادی ہوئی تھی

میری۔۔۔ میں تب سے ایک بیٹی کی خواہش مند تھی۔

میں اس طرح عبدالعلی کو اپنا بیٹا بنانا چاہتی تھی

عبدالبہادی! مگر بچو۔۔۔“

”وہ محض ایک مذاق کی بات تھی لیزے! وہاں

کوئی یہ رشتہ طے نہیں کر رہا تھا۔ کم آن۔“ عبدالبہادی

نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکا۔

”اتباع کا بھی تو عبد اللہ سے ہو گیا ناں۔

عبدالعلی کا بھی ہو جاتا۔ بس مجھے ڈر لگا تھا۔ اور ذرا

سوچیں۔۔۔۔۔ اگر ہمارا بیٹا یا بیٹی ہوتی تو ہم۔۔۔۔۔“

لیزے! لیزے! میری جان! صبر سے کام لو، اللہ

بہتر ہی کرے گا۔“ عبدالبہادی نے اسے بازوؤں

میں سمیٹ لیا۔ وہ گھٹ گھٹ کر روئے گئی۔

”نہیں ہوتا، اب نہیں ہوتا ہے عبدالبہادی! مجھے

کیوں یہ لگتا ہے کہ اللہ کو میرا وہ عمل پسند نہیں آیا۔

عبدالبہادی اگر۔۔۔۔۔ اگر میں اس وقت اپنے بچے کو نہ

مارتی تو۔۔۔۔۔ تو اب وہ کتنا بڑا ہوتا؟ عبدالعلی جتنا ہی

ناں؟“ وہ سسکی، عبدالبہادی سنائے میں گھر گیا۔

”عبدالعلی میں اپنے اسی بچے کو دیکھتی رہی ہوں

میں ہمیشہ عبدالبہادی! جسے میں نے خود مار ڈالا۔ اس

کی آہ و بکاہ میں شدت آنے لگی۔ عبدالبہادی کے

آس پاس سرد ہوا میں سنسنار ہی تھیں۔

”مجھے بتائیں عبدالبہادی! میں کیسی ماں تھی؟

جس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی جان لے

ڈالی؟ ماں تو ایسی نہیں ہو سکتی ناں؟“ اس کی

آنسوؤں سے دھندلاتی آنکھوں میں غصہ کی

سرخیاں اور وحشتیں اتر رہی تھیں۔ عبدالبہادی کے

بستر پر وہ داہنی کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔

گال کے نیچے داہنا ہاتھ تھا۔ جو آنکھوں سے پھسلتی

نہی کے باعث بھینکتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر قبل ہی

عشاء کی نماز ادا کی تھی۔ دوپٹہ ایسے ہی نماز کے انداز

میں لپٹا ہوا تھا۔ گلابی دوپٹے میں وہ خود بھی بے تحاشا

گلابی ہو رہی تھی۔ کھانا اس نے برائے نام ہی کھایا

تھا۔ عبدالغنی اور ام جان کے بے تحاشا اصرار کے

باوجود گلے میں انکا آنسوؤں کا گولہ کچھ اور حلق سے

اترنے ہی نہ دیتا تھا۔ پھر دل بھی تو آمادہ ہو۔ وہ تو

بس بھرایا ہوا تھا۔ بے تحاشا رونا چاہتا تھا۔ دروازے

پر آہٹ ہوئی مگر اس نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت

نہیں کی۔ عبدالبہادی ہاتھ میں موجود ٹرے

چھوٹی میز پر رکھتا سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کی

سنجیدگی کی مظہر نظریں علیزے پر ٹھہر گئی تھیں۔ مگر کچھ

بولا نہیں تھا۔ علیزے نے خود پر قابو پانا چاہا مگر دل کا

بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جب اس کی کھٹی کھٹی

سسکیاں باقاعدہ ہچکیوں میں ڈھلنے لگیں تب

عبدالبہادی خود پر ضبط کھو کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

”لیزے۔۔۔۔۔ لیزے! کیوں کر رہی ہیں

ایسا؟“ وہ بے حد عاجز ہوا تھا۔ جیسے۔ اس کے اس

دکھ کا کیا علاج تھا۔ بھلا اس کے پاس۔

”میں جانتی ہوں بہت خفا ہیں آپ! جیسی تو

بات بھی نہیں کر رہے مجھ سے۔“ اس نے اک اور

دکھ سامنے رکھا۔ عبدالبہادی کچھ اور عاجز ہوا۔ بہت

توجہ سے۔ بہت لگاؤ سے اس کے گال پونچھے۔

”میں خفا نہیں ہوں لیزے! مجھے تو بس یہ دکھ ہے،

میری بہادر لیزے کو کیا ہو گیا تھا۔؟“ وہ دکھ سے جیسے

پاس الفاظ ختم ہو گئے۔ وہ کیسے اسے حوصلہ بندھاتا۔
 ”اُم جان کہا کرتی تھیں عبدالہادی! اپنے بچے تو
 ڈاؤن بھی نہیں کھاتی۔ میں کیسی ماں تھی جس نے خود.....“
 ”لیزے!“ عبدالہادی تڑپ اٹھا۔ اس کے
 ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھا مگر اس کی وحشتوں میں کمی
 آنے کے بجائے اضافہ ہونے لگا۔

”خدا مجھے اگر معاف کر بھی دے گا عبدالہادی تو مجھے
 وہ معصوم ننھی جان کبھی معاف نہیں کرے گی جسے.....“
 ”لیزے! چپ ہو جاؤ پلیز! ایسے مت سوچو۔“
 عبدالہادی نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ
 دیے۔ وہ سرتاپا کانپتی اور سکھتی رہی۔

”یہ سب جب ہوا تمہارے حواس سلامت نہیں
 تھے۔۔۔ تمہاری سوچوں پر تمہارا اختیار نہیں تھا۔ پھر یہ
 بھی تو سوچو..... اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ یہ راستی
 جواب تمہارے ذہن و دل کو حاصل ہوئی۔ وہ نہیں
 ہو سکتی تھی کبھی۔ جو شدتیں عاجزی و انکساری کی رب
 سے توبہ کی طلب کی تمہیں اب عنایت ہوئیں اس
 گناہ، اس لغزش کے بغیر نہیں مل سکتی تھیں۔ لیزے
 ایسا گناہ جس سے توبہ اور نیکی کی توفیق مل جائے
 باعث رحمت ہو سکتا ہے۔ تم مثبت سوچو۔ اللہ سے
 اچھی توقع باندھو۔ اللہ سے توبہ کرو مگر نا اُمیدی کو پاس
 نہ پھٹکنے دو کہ وہ تمہاری توبہ کو قبول نہیں فرمائے گا۔
 پلیز، میری جان میری بات کو سمجھو۔“

وہ کتنی دیر اسے زری سے آہستگی سے سمجھاتا، قائل کرتا رہا
 تھا۔ یہاں تک کہ وہ دھیرے دھیرے قرار پانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”علیزے بہت بدل گئی ہے۔ ہے ناں
 عبدالغنی!“ عبدالغنی نے سوئے ہوئے عبدالعلی اور
 عبدالاحد کو کروٹ بدلو کر لحاف درست کیا اور جھک
 کر دونوں کی پیشانیاں باری باری چوم رہا تھا۔ جب
 لاریب کے سوال پر گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا

تھا۔ اور کچھ کہے بغیر ہونٹ بھیج لیے۔
 ”اس کی زندگی میں جو بحران آیا تھا، وہ شاید
 ساری عمر ساتھ چلنے والا ہے۔ بہت گہرے اثرات
 مرتب ہوئے ہیں اس پر۔“ خاصی تاخیر سے دلگیری
 سمیت بولا تھا۔ اس کا انداز بتاتا تھا۔ وہ علیزے کے
 ہر اضطراب سے آگاہ رہا ہے، لاریب کی اسے تکتی
 نظروں میں عقیدت سمیٹنے لگی۔

”مجھے آج اس کی آنکھوں کا شکوہ بھی نظر آیا ہے
 لاریب! جب وہ بہت گم صم ہو رہی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ
 ہم اسے بروقت نہیں سمجھ سکے۔ ہم یہ پٹی علیزے کو بھی
 دے سکتے تھے۔ ناں۔“ وہ متاسف تھا۔ ملول تھا۔ بے
 پناہ رنجیدہ، لاریب بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”عبدالغنی!“ وہ مضطرب ہوئی۔
 ”اگر ایسا آپ کا کوئی خیال تھا۔ تو آپ حکم
 کرتے۔ ایسی بات تو میں نے سوچی بھی نہیں کہ
 آپ کو انکار کر دوں۔ عبدالغنی..... ویسے بھی..... غیر
 تو دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔ خدا نخواستہ علیزے کے
 ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔ اُمید کا در کھلا ہے۔ اللہ
 بہتر عطا فرمانے والا ہے۔“ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ
 رسان سے رکھے وہ کتنے پیارے، من موہنے انداز
 میں سمجھا رہی تھی۔ عبدالغنی آہستگی سے مسکرا دیا۔

”بیشک اللہ عطا فرمانے والا ہے سب سے بہتر۔
 میں اور شدت سے دعا کروں گا اب اس کے لیے۔“

”اور میں بھی۔“ لاریب نے ہنستے ہوئے کہا،
 پھر اس کا سہارا لے کر لیٹتے ہوئے اسے محبت سے
 تکتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

”ہر گز رتے دن کے ساتھ مجھے اپنی خوش بختی کا
 یقین سوا تر ہو رہا ہے۔ آپ کا ہر روپ پہلے سے
 زیادہ پیارا اور دلنشیں ہے۔ سب سے پہلے میں نے
 آپ کو ایک بیٹے اور بھائی کے روپ میں دیکھا۔ جو
 قابل رشک تھا۔ پھر آپ میرے محبوب بن گئے۔ جو

بہت کٹھور ثابت ہو۔ اقدم قدم پر رلاتا تھا۔ مگر تھا۔
 بھی عزیز۔۔۔ اس کے بعد شوہر کے روپ میں آئے
 تو ہر شکوہ مٹا ڈالا۔ باپ بنے تو شفقت و محبت کا
 لازوال سمندر ثابت ہوئے۔ دو بیویوں میں اعتدال
 اور انصاف۔۔۔ اللہ اللہ! یہ محبت، عقیدت اور عشق
 میں کیوں تبدیل نہ ہوتی۔ مجھے اپنا آپ سب سے
 خوش نصیب لگتا ہے۔ عبدالغنی مجھے فخر ہے کہ آپ
 جیسا شریک حیات میرا نصیب ٹھہرا ہے۔“

”الحمد للہ! ثم الحمد للہ!“ عبدالغنی کے چہرے
 کے ہر نقش سے ہر انداز سے انکساری چھلکنے لگی۔

”ایسے نہ کیا کرو لاریب!“ وہ عاجز تھا۔ سراپا عاجز۔
 ”کیوں۔۔۔؟“ میرا دل کرتا ہے تو کہتی ہوں۔“

لاریب ٹھنکی تھی۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا۔

”چلو پھر ایسے کیا کرو۔ اللہ کی تعریف ہے کہ اللہ
 نے بعد الغنی کو نیکی کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ کی تعریف
 ہے کہ اللہ نے یہ احسان فرمایا۔ اے اللہ! تو صراطِ مستقیم
 پر قائم رکھنا، آمین۔“ اس نے صبح کی تولاریب مسکرا
 مسکرا کر سر اثبات میں بلانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آج میرا بیٹا بہت خوش تھا۔ ماشاء اللہ! اللہ اے
 ہمیشہ یونہی شاد و آباد رکھے۔“ ہارون نے سوتے ہوئے
 عبداللہ کو لا کر بستر پر لٹایا اور پیشانی پر بکھرے بال
 سمیٹ کر بوسہ دیا۔ پھر جھک کر امن کو پیار کرنے لگا۔

”آپ خوش نہیں ہیں؟“ بریرہ وضو کرنے جا رہی
 تھی۔ آستین اوپر کرتے تھم کر اسے تکتے لگی۔ انداز میں
 خفیف سی شرارت تھی۔ ہارون سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گہرا
 طمانیت بھرا سانس اندر کھینچا پھر آہستگی سے بنس دیا۔

”میرا تم پوچھیں۔ مجھے لگا وقت کچھ سال
 پیچھے چلا گیا ہے۔ ہم نے آج ہی بریرہ صاحبہ کو فتح کیا
 ہے۔ اب میرے بیٹے نے کارنامہ انجام دیا ہے۔“
 بریرہ نے چونک کر اور بہت دھیان سے اسے دیکھا۔

ہارون کی مسکراہٹ تروتازہ تھی۔ وہ ہر لحاظ سے آسودہ
 نظر آتا تھا۔ مگر جیسے بریرہ کی تشفی پھر بھی نہ ہو سکی۔

”اک بات بتائیں گے ہارون!“ وہ خاص
 سے زیادہ جھکی، ہارون کا حیران ہونا فطری تھا۔
 گزرے ہوئے ماہ و سال میں اس نے اتنا مان بریرہ
 کو دیا تھا۔ اتنی محبت دی تھی کہ ہر رنج و غم گویا بھلا دیا
 تھا۔ ہر تشنگی مٹا دی تھی، ہر ازالہ کر دیا تھا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں ہارون؟
 میرے دل میں یہ سوال کاٹنا بن کر چبھتا ہے
 ہر وقت؟“ اس کی آنکھوں کی سطح غم ہو رہی تھی۔
 ہارون آہستگی سے مسکرایا۔ بچوں پر کبھی درست کیا
 تھا۔ پھر اس کی جانب پلٹ کر اسے دونوں بازوؤں
 سے تھا۔ مگر نرمی سے اپنے مقابل کر لیا۔

”کتنی بار پوچھو گی یہ سوال آخر بریرہ!“ اس کی
 مسکان میں نرمی کے ساتھ ملامت کا بھی رنگ تھا۔ یہ
 ملامت خود ملامتی کی تھی۔ بریرہ نے لانی پلکیں اٹھا کر
 غم آنکھوں سے اسے دیکھا اور سرد آہ بھری۔

”بات یہ نہیں ہے ہارون صاحب کہ مجھے یقین
 نہیں آپ کی بات کا۔۔۔۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ دل کا ملال
 نہیں جاتا میری وجہ سے۔“

”جو کچھ ہوتا تھا۔ ہو چکا ہے بریرہ! ہو جانے
 والے عمل پر پچھتاوا رہنا چاہیے کہ آئندہ غلطی سے
 روکتا ہے۔ مگر یہ ملال آنے والے وقت کی خوشیاں
 نگل لے۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے اور وہ خیال، وہ بات
 جو باعث رنج و ملال ہو اسے فراموش کر دینا بہتر۔۔۔۔۔
 تم جانتی ہو بریرہ! تب اگر غلط تم تھیں تو ٹھیک میں بھی
 نہیں تھا۔ ہم دونوں میں سے اگر کوئی ایک بھی
 اعتدال پر ہوتا تو بگاڑ اتنا کبھی نہ بڑھتا۔ خیر۔۔۔۔۔ یہ
 سوچ کر پریشان نہ ہوا کرو کہ میں نے تمہیں معاف
 نہیں کیا۔ اللہ گواہ ہے بریرہ! تم سے علاوہ زندگی میں
 کسی اور سے اتنی محبت ہی نہیں ہو سکی۔ تمہاری دوری،

تمہاری لا تعلقی و بے نیازی نے ہی پاگل کر دیا تھا۔ مجھے کہ ایک غلط قدم اٹھالیا۔ پھر اس کا پچھتاوا لے ڈوبا مجھے، لیکن الحمد للہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں چاہتا ہوں، اب ہم خوشگوار بھرپور زندگی گزاریں۔ ایسی زندگی جس میں کوئی تشنگی نہ ہو۔

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“ بریرہ جو بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔ ہارون ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا پھر گہرا سانس بھرا تھا۔

”میں نماز پڑھ لوں۔“

”شیور، مگر ڈیسرٹ وائف! آج میری اک خواہش پوری ہوئی۔ اک پھر ادھوری رہ گئی۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں موجود کسک کا احساس بریرہ کو چونکا کے پھر سے اس کی جانب متوجہ کر گیا تھا۔

”میں کبھی نہیں ہارون!“ اس کی استفہامی نگاہوں میں اضطراب بھی اترنے لگا۔

”عبدالعلی.....! بلاشبہ عبدالغنی کا دوسرا عکس ہے۔ ماشاء اللہ! اتنا پیارا بچہ ہے اور تمہیں پتا ہے میں اول روز سے ہی عبدالغنی کا اسیر ہو چکا تھا۔ لاریب کا سب سے بڑا حامی بھی میں بنا تھا۔ یہ بات آج تک صغیرہ راز ہے کہ می کو اس کے حق میں ہموار کرنے والا میں تھا۔“ وہ مسکرایا تھا۔ بریرہ بے ساختہ مسکرا دی۔ اس مسکان میں بھائی کے لیے فخر بھی تھا، انبساط بھی۔

”آپ تو عبدالعلی کی بات کر رہے تھے۔“ اس نے بغور ہارون کے تاثرات جانچے۔ گویا بات کا سرا جوڑنا چاہا۔ ہارون نے سرد آہ بھری تھی۔

”سچ پوچھو تو عبدالعلی کی نسبت میں اپنی بیٹی امن کے ساتھ چاہتا تھا۔ میری خواہش ہے بریرہ! ماضی کو دھرایا جائے۔ ہماری بیٹی وہاں اور ان کی بیٹی یہاں آ جائے۔ عبدالعلی سے حقیقتاً مجھے بہت انسیت محسوس ہوتی ہے۔“ ہارون نے بلا جھجک دل کی بات کہہ دی تھی۔ بریرہ کے سچ چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

”اللہ ہماری بیٹی کے لیے بہتر کرے گا ہارون! عبدالعلی کے متعلق ہم ایسا نہ ہی سوچیں تو مناسب ہے۔ اس کا مدہم لہجہ غیر مبہم تھا۔ ہارون نے بڑی طرح سے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور یونہی تکتا رہا۔ انداز ایسا تھا۔ جیسے بات کی تہہ تک پہنچنے کا متمنی ہو۔

”مگر کیوں بریرہ! ہماری بیٹی کیا کسی سے کم ہے؟ ہمیں پورا حق حاصل ہے اس کے لیے اچھا سوچنے اور انتخاب کرنے کا۔“ اس کا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی احتجاجی ہو گیا تھا۔ بریرہ خاموش رہی اور اضطرابی کیفیت میں ہونٹ کچلتی دوسری جانب دیکھتی بڑی دقتوں سے مسکرائی۔

”پلیز اب یہ نہ کہنا ادلے بدلے کی شادیوں کے مسائل.....“ ”یہ نہیں ہے معاملہ ہارون!“ وہ سخت عاجز ہوئی۔ ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر صوفے پر بٹھا دیا۔

”تو جان ہارون! وہ وجہ بتا دو پھر جس کی بنا پر آپ منع کر رہی ہیں۔ یقین رکھو اگر معقول ہوئی تو کبھی دوبارہ ذکر نہیں کروں گا اس بات کا۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ اقرار تھا، بریرہ نے یوں گہرا سانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جیسے شکست تسلیم کر لی ہو۔ وہ ہارون کو جانتی تھی۔ وہ ابھی بھی ضد کا پکا تھا۔ ہاں قول و فعل میں تضاد نہیں رکھتا تھا۔ جو زبان پر وہی عملاً ظاہر کرتا۔ بناوٹ و تصنع اور دکھاوا نہیں تھا۔

”علیزے کو دیکھا تھا۔ آپ نے.....؟ ہارون وہ کرائس جو کچھ سالوں پہلے ہمارے آشیانوں کو طوفان کی زد پر بکھیر کے رکھ گیا تھا۔ وہ دیکھنے میں بظاہر پھر سے ٹھیک ہوا لگتا ہے۔ آشیانے آباد ہو گئے ہیں۔ معمولات درست ہیں، لیکن ہارون.....! علیزے بالکل ٹھیک نہیں ہو پائی.....“ اس کی آواز بوجھل ہوئی گلا بھرانے لگا۔ ہارون کے چہرے پر تغیر پھیلا تھا۔ وہ ساکن بیٹھا رہ گیا۔

”السلام وعلیکم! صبح بخیر زندگی!“ بستر پر ڈھیلے سے انداز میں دراز آنکھیں موندے سر پڑی تھی۔ جب عبدالہادی نے اس کے چہرے پر پڑا کبلی سر کا کر زندگی سے بھر پور آواز میں اس پر سلامتی بھیجی تھی۔ علیز سے نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کی شدت گریہ اور شب بیداری کی گواہ تھی۔ عبدالہادی کے دل پر گرا بوجھ بڑھنے لگا۔

”علیکم السلام!“ اس کی آواز بھی اس کی آنکھوں اور ذہن کی مانند بوجھل تھی۔ کہنیوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر اس نے اٹھنا چاہا تو عبدالہادی نے مقصد سمجھتے ہوئے خود اسے سہارا دیا تھا۔ ہاتھ کمر میں ڈال کر اسے بیٹھنے میں مدد دی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ اس کی نگاہوں میں تشویش کے ساتھ اضطراب بھی پھیل رہا تھا۔

”میں بیمار تھوڑی ہوں عبدالہادی!“ وہ دکھ سے ٹوٹنے لگی۔ عبدالہادی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ وہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر کچر کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی جب عبدالہادی نے بیڈ کراؤن پر پڑا اس کا سرخ نگینے جڑا، بے حد اسٹائش سا کچر اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ یونہی غیر محسوس انداز میں اس کی کیئر کا عادی تھا۔ اس کی محبت اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی جنبش سے بھی علیز سے لے آتشکار ہوا کرتی تھی۔

”لیزے! اپنے گھر چلتے ہیں۔“ بیڈ پر وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ علیز سے نے لائی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور سرکوشی میں جنبش دینے لگی۔

”میں کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہوں عبدالہادی! پلیز منع نہیں کیجیے گا۔ پھر تو آپ مجھے اتنی دور لے جائیں گے کہ یہاں کسی کی شکل دیکھنے کو بھی ترسوں گی۔“ وہ جیسے پھر سے رونے کو تیار تھی۔ عبدالہادی بوکھلا کر رہ گیا۔

”میرا دل گواہی دیتا ہے ہارون! علیز سے پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں ابھی بھی غلط ہے۔ وہ اپنی ہر کمی، ہر ناخوشی میں اپنے ساتھ ساتھ ابھی بھی مجھے مورد الزام ٹھہراتی ہے اور ایسا غلط بھی نہیں کرتی۔ ہارون.....! وہ کسی اور پہ بھی نہیں چلاتی، مجھ پر برہم ہوتی ہے۔ عبدالعلی..... مجھے جتنا بھی عزیز ہو۔ جتنا بھی پیارا ہو مگر میں اس پر حق نہیں جتاننا چاہتی تو اس کی وجہ وہ ازالہ سمجھ لیں، جو میں کرنے میں مصروف ہوں۔ لیز سے کی اولاد نہیں ہے۔ مگر وہ خواہش مند تو ہے۔ عبدالعلی کو وہ جس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں وہ نظر پہچانتی ہوں۔ میری خواہش ہے، میری دعا بھی..... اللہ اسے جلد صاحب اولاد کرے۔ بیٹی کی رحمت سے نوازے، ہارون عبدالعلی ہمارا نہیں..... لیز سے کا بیٹا بننا چاہیے۔“ بات مکمل ہونے سے قبل اس کی آنکھیں ٹپ ٹپ آنسو برسانے لگی تھیں۔ ہارون جو ساکن بیٹھا تھا۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے اس کے شانے پر اپنا بازو دراز کر کے اس کا سراپے کا ندھے سے ٹکا کر تھکنے لگا۔

”بس اتنی سی بات؟ کم آن بریرہ! دل پر بوجھ نہ لو۔ علیز سے صرف تمہاری بہن نہیں ہے۔ وہ میری بھی بہن ہے۔ اللہ گواہ ہے اس میں اور لاریب میں مجھے کبھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اچھا کیا تم نے میرا دھیان اس جانب دلایا۔ ورنہ حقیقتاً میں ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔ ڈونٹ یو وری سویٹ ہارٹ! تمہارے ساتھ میری بھی دعائیں شامل ہو گئی ہیں۔ علیز سے کی اس خواہش کی تکمیل میں۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔ بریرہ نے نم آنکھیں ہاتھ سے رگڑتے ممنون و مشکور نظروں سے دیکھا اور بوجھل دل سے مسکرا دی تھی۔ ہارون نے اس کا گال سہلا کر نماز پڑھنے کا اشارہ کیا۔ بریرہ جائے نماز اٹھا کر بچھا رہی تھی۔ ہارون بستر کی جانب بڑھ گیا۔

”لیزے۔۔۔ لیزے میری جان! ایسا سمجھتی ہو مجھے؟ میں نے تمہیں کہا بھی ہے۔ اگر تم نہیں جانا چاہتی ہو تو نہیں لے کر جاؤں گا تمہیں۔ یقیناً کیوں نہیں میری بات کا؟“ وہ عاجز ہو کر پوچھ رہا تھا۔
علیزے اسے بغور دیکھتی رہی۔

”مگر میں آپ کو وہاں تنہا بھی نہیں بھیجوں گی۔ وہ وہیں ہے نا چڑیل!“ اس کا انداز یکدم تبدیل ہوا۔
اب چتون تکیے تھے۔۔۔ عبدالہادی ایک لمحے کو حیران ہوا پھر بے ساختہ بے اختیار ہنستا چلا گیا تھا۔
”واؤ۔۔۔۔۔ امیزنگ! اب لگی ہو میری بیوی! میری لیزے!“ وہ اسی طرح ہنس رہا تھا۔ علیزے نے اسے گھورا۔ پھر خفگی سے منہ پھلایا۔

”خبردار جو میرا مذاق اڑایا ہو۔۔۔“
”یار۔۔۔۔۔ توبہ کرو۔ مذاق کہاں اڑا رہا ہوں۔ تعریف کر رہا ہوں۔“ بامشکل ہنسی روک کر وہ شرارت سے بولا۔ علیزے کو مزید غصہ آیا۔
”ایسے کرتے ہیں تعریف!“ وہ خفگی سے ترخ کر بولی تھی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ بھول گیا۔ تعریف کا انداز تو اپنا دوسرا ہے۔ ٹھہرنا بھی کرتا ہوں۔“ وہ اس کے چہرے پر سر جھکا انداز بے باکی کا تھا۔ علیزے نے شپٹا کر اسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”نیمز سے زیادہ رومینک ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بوکھلائی ہوئی نظر آنے لگی۔ رنگت دہک کر گلابی ہو رہی تھی۔ عبدالہادی نے لطف لیا تھا۔ گویا۔
”تم کبھی نہیں بدل سکتیں لیزے! ابھی تک اتنا ہی شرماتی ہو مجھ سے، جیسے۔۔۔۔۔“

”اچھا بس، ذرا غیر بھابی سے ناشتے کا تو کہیں، بھوک لگ رہی ہے مجھے۔“ وہ اس کی شرارت و شوخی سے چمکتی آنکھوں سے نگاہیں چراتی گریزاں کی بات بدل رہی تھی۔
عبدالہادی کی نظروں میں ہلکی سی خفگی لہرائی اور معدوم ہو گئی۔

”اب تو ذرا جلدی لے جانا پڑے گا تمہیں وہاں۔ اپنے والدین کے گھر آ کے محترمہ نے پابندیاں بڑھا دی ہے۔ وہاں کچھ نہ کچھ تو ہماری مرضی چلے گی ناں۔“ وہ صاف چھیڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود علیزے کو تپ چڑھ گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بہت خوب! جیسے اس سے پہلے تو آپ ہمیشہ بہت شریف رہے ہیں۔ مرضی کبھی چلائی ہی نہیں۔“
عبدالہادی کا قہقہہ بے ساختہ اور بلند تھا۔ علیزے کو اپنی حماقت کا احساس ہوا تو صرف چہرہ ہی نہیں، جل اٹھا تھا۔
وہ خود بھی خفت سے دوہری ہونے لگی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں خود ناشتہ لاتی ہوں، حد ہے۔ اتنا ہی احساس ہے آپ کو میرا۔“ وہ صاف راہ فرار ڈھونڈ رہی تھی۔ عبدالہادی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔
”نہ۔۔۔۔۔ نہ یار من! یہ تکلف نہ کرو۔ یہ خادم کس لیے ہے۔ خود پیش کرے گا ناشتا کرے میں سجا کر۔“
وہ سر ایا عاجز تھا۔ مگر شرارت ہر انداز سے نپکتی تھی۔
”کوئی ضرورت نہیں اس خدمت خلاق کی۔ سب یہی سمجھیں گے اتنے ہی فرمانبردار ہیں آپ میرے۔“ منہ پھلا کر وہ نروٹھے پن سے بولی اور پیر بیڈ سے لٹکا کر اپنے جوتے تلاش کرنے لگی۔

”کیا حرج ہے سمجھنے میں۔۔۔۔۔؟ کیا میں نہیں ہوں آپ کا خیال رکھتا؟“ وہ ہنوز اسی شریر انداز میں گویا ہوا تھا۔ علیزے نے اب کی بار اسے عاجزانہ انداز میں دیکھا۔

”عبدالہادی پلیز! تنگ نہ کریں مجھے۔“ وہ بے بس نظر آ رہی تھی۔

”او کے مادام! جو حکم۔“ وہ مسکرایا اور اس کا راستہ چھوڑا۔

”تم منہ ہاتھ دھوؤ میں غیر بھابی سے کہتا ہوں ناشتے کا۔“ عبدالہادی کو اس کی طبیعت کا خیال آیا تو پھر ٹوکا۔
”ان کی چھوٹی سی بچی ہے عبدالہادی! وقت

بے وقت زحمت دینا مناسب نہیں لگتا۔ دوبارہ پوچھ گئی ہیں ناشتے کا مجھ سے، میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔“ وہ نرمی سے وجہ بتا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، پھر میں مدد کر دیتا ہوں۔“ عبدالہادی اس کے ساتھ ہی دروازے کی جانب بڑھا تو وہ جھجک کر رُک گئی۔

”نہیں عبدالہادی! یہ ہمارا گھر نہیں ہے ناں! یہاں بابا جان اور ام جان اور باقی سب کیا سوچیں گے۔“ وہ متذبذب تھی۔ عبدالہادی آہستگی سے مسکرانے لگا۔

”اچھا ہی سوچیں گے۔ مطمئن ہوں گے کہ ان کی بیٹی کو بہت اچھا بہت خیال رکھنے والا شوہر ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، وغیرہ وغیرہ۔“ اس کا شوخ و شنگ انداز بے حد شرارتی تھا۔ علیزے سر تا پا دھک سی گئی۔

”شرم کریں کچھ، پھر تو بالکل نہیں لوں گی آپ کی مدد۔“ وہ جس طرح چلبلا کر کر بولی عبدالہادی کو اور بھی بننے کا موقع مل گیا تھا۔ علیزے جھلا کر باہر نکل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”عبدالہادی چلے گئے؟“ آنگن میں اتری دھوپ میں وہ ام جان کے پاس تخت پر بیٹھی تھی۔ کچھ فاصلے پر عبیر بیٹھی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف سبزی بنا رہی تھی۔ ام جان تسبیح پڑھتے اونگھ رہی تھیں جبکہ لاریب تنکے کے سہارے نیم دراز اپنے پاس بیٹھے پرنز کے ٹکڑے جوڑتے عبدالاحد کو دیکھتی تھی۔ وہ کھیل میں پوری طرح گم تھا۔ کبھی جب ٹکڑا صحیح نہ جڑتا تو جھنجھلا کر سارے ٹکڑے پٹخ دیتا۔ لاریب مسکراتی اور اس کی ہیلپ کرنے لگتی۔ کچھ فاصلے پر اتباع کی کاٹ تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی عبیر نے اسے فیڈ کرا کے سلا یا تھا۔ لاریب نے عبیر سے سبزی بنانے کا کہا تھا۔ مگر وہ مانی نہیں تھی۔

”نہیں..... بھئی! ابھی آپ کے لیے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں۔ بس آرام کریں۔ ساری زندگی

انسان کو کام ہی کرنا ہوتا ہے۔“ اس کے لہجے و انداز میں محبت تھی۔ پیار تھا۔ ام جان دونوں کی یکجہالت کا یہ مظاہرہ دیکھ دیکھ کر ڈھیروں خون بڑھتا محسوس کرتیں مسکرائے جاتی تھیں۔ وقت نے کیا کیا کچھ نہ دکھلایا تھا۔ مگر اب طمانیت ہی طمانیت تھی الحمد للہ، سوائے علیزے کی ایک کمی کے۔ جس کے لیے وہ شدتوں سے دعا گورہا کرتیں۔ لاریب کے سوال پر علیزے جو خود بھی غنودگی میں جا رہی تھی۔ آنکھیں کھول کر اُسے تنکے لگی۔

”ہاں۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔ جس سے لاریب کی تشفی نہیں ہوئی۔ اسے صاف لگ رہا تھا۔ علیزے خفا ہے اس سے۔“

”کہاں.....؟ مطلب وادی.....؟“

”نہیں، ابھی کچھ دنوں میں جائیں گے۔ میں ساتھ جا رہی ہوں ان کے۔“ علیزے کا انداز مدہم تھا۔

”اچھا فیصلہ ہے۔“ لاریب نے سراہا تھا۔ وہ خالی نظروں سے اسے تنکے لگی۔

”مگر میں سب سے بہت دور ہو جاؤں گی۔ یہ سوچ کر دل بہت گھبراتا ہے۔“

”بہت پیسہ ہے ماشاء اللہ! عبدالہادی بھائی کے پاس۔ چاہنا تو ہفتہ بھر بعد بھی چکر لگا لینا۔ نو پرابلم میری جان!“ لاریب نے تسلی دی تھی۔ عبیر تائیدی انداز میں مسکرانے لگی۔

علیزے نے گہرا سانس بھرا۔ ”وہ بھی یہی کہتے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“ لاریب مسکراتی اور اسے دیکھا۔ وہ خاموش رہی۔

”اتنا بڑا محل نما گھر، ڈھیروں ملازم۔ علیزے بالکل ملکہ بن کر رہو گی تم۔“ لاریب نے پھر اسے بہلانا چاہا۔ علیزے اب کے خفا نظر آنے لگی۔

”مال و دولت، جاہ و شہم سب کچھ نہیں ہوتا ہے لاریب! تم تو جانتی ہو گی اس بات کو۔ دل آباد رکھنے کو، ہمیں حقیقی خوشیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس کا

انداز خفیف سی چہن لیے ہوئے تھا۔ لاریب کو یقین ہوا وہ واقعی بہت خفا ہے اس سے۔ جیسی خاموش کی خاموش رہ گئی۔ پھر اسی شام جب وہ لاریب کے ہی کہنے پر اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں چھوڑنے آئی تو لاریب نے واپس پلٹتی علیزے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔“ اس کے چونک اٹھنے پر لاریب نے نرمی سے مسکرا کر کہا تھا۔ علیزے کچھ نہیں بولی۔ البتہ اس کے بستر کے کنارے ٹک گئی تھی اور ہونٹ بچھے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اللہ گواہ ہے علیزے! اس گھر میں میرا پہلا قلبی تعلق عبدالغنی سے استوار ہوا تو اگلا بندھنے والا تعلق تم سے تھا۔ تم نہیں جانتی مگر رب جانتا ہے۔ تمہارا ہر دکھ، ہر اضطراب میں نے اپنے دل پر سہا اور محسوس کیا ہے۔ جن دنوں تم لا پتا ہو گئی تھیں۔ عبدالغنی راتوں کو سو نہیں پاتے تھے۔۔۔ اور میں..... مجھے لگتا تھا۔ یہ دکھ صرف ان کا نہیں ہے۔ میں بھی اتنی ہی بے قرار رہا کرتی تھی۔ ہماری دعاؤں کا مرکز صرف تم قرار پا گئی تھیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے لیزے جن سے محبت کی جاتی ہے ان سے غفلت نہیں برتی جاتی۔ ہمیشہ اس دل نے تمہارا بھلا چاہا ہے۔ کل جو کچھ ہوا۔ اس نے تم سے زیادہ مجھے اضطراب بخشا ہے، یہ یقین کر لو تم۔ میں یہ بات قبل از وقت کہنا نہیں چاہتی تھی، مگر مجھے لگ رہا ہے تم بدگمان اور خفا ہو رہی ہو مجھ سے۔ لیزے..... عبدالعلی ہمیشہ سے تمہارا تھا۔ تمہارا ہی رہے گا۔ یہ تو بس ایک فارمیٹی سمجھ لو کہ میں اسے نبھا رہی ہوں۔ اللہ ہم سب کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشے۔ تم بیٹی کی ماں بنو اللہ کرے۔ آمین۔ علیزے تو میں عبدالعلی کی دلہن بنانا چاہوں گی اسے۔ بتاؤ انکار تو نہیں کرو گی تم؟ آخر اتنی لینڈ لارڈ ہو گئی ہو اور ہم بچارے

عام سے رہن سہن والے، عام لوگ۔“ لاریب کا انداز شگفتہ تھا۔، متہمس تھا۔ اس کے باوجود علیزے کے چہرے پر خوشی کی کوئی کلی نہیں چٹکا سکا۔ لاریب نے بے حد حیران ہو کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب اور بے بسی کو پا کر بے چین ہونے لگی۔

”کیا ہوا علیزے! کیا میری کوئی بات بری لگی تمہیں؟“ وہ سہم رہی تھی۔ خائف ہوئی جاتی تھی۔ اپنے تئیں تو اس نے اسے خوش کرنا چاہا تھا۔ مگر۔

”کون جانے لاریب..... قسمت میں کیا لکھا ہے۔ عبدالعلی ماشاء اللہ سے سات سال کا ہو گیا ہے۔ ادھر ہمارے ہاں ابھی تک کوئی امید نہیں۔ عمروں کا اتنا فرق بچوں میں وہی ہم آہنگی نہیں ہونے دیتا۔ مجھے لگتا ہے میری یہ خواہش.....“

”افوہ! علیزے اللہ کے گھر سے نا اُمید نہیں ہوتے۔ اللہ ضرور نوازے گا تمہیں تم دیکھ لینا۔ ہماری سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور عمروں کے فرق کی کیا بات کی تم نے..... اپنے بھائی اور میری عمروں کے تفاوت کو کیوں بھلا دیا؟ پورے دس سال بڑے ہیں محترم مجھ سے اور جہاں تک بات عبدالعلی کی ہے۔ تو چند رہ سال کا بھی فرق پڑ جائے۔ میں اسے جرات نہیں دوں گی ہمارے فیصلے سے انحراف کرنے کی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟“ اس کی بات کاٹ کر لاریب نے اسے اپنے گلے سے لگا کر اتنی محبت سے، اتنے پیار سے عہد باندھا تھا۔ کہ علیزے کی آنکھیں اس محبت پر نم ہونے لگی تھیں۔

”مگر لاریب! بچوں پر زبردستی نہیں ہونی چاہیے جو بندھن دلوں کی خوشی کا باعث نہ ہو۔ اس کا.....“

”ایسا کیوں سوچتی ہو علیزے تم؟“ ہم مثبت کیوں نہ سوچیں۔ اللہ مہربانی فرمائے گا۔ بس اب ہر فکر جھٹک دو۔ خوش رہا کرو۔“ لاریب نے محبت سے اس کا گال تھپکا تھا۔ وہ جو جھل انداز میں مسکرا دی۔

”پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگا، بگو عبدالعلی سے اسن کا.....“
 ”بھابی ایسا نہیں کریں گی عزیزے! جہاں تک میں
 سمجھی ہوں۔ وہ بھی تمہاری خواہش پہنچاتی ہیں۔ وہ کبھی
 تمہاری خواہش کے راستے میں نہیں آئیں گی۔“ لاریب کا
 لہجہ اتنا یقین تھا۔ کہ عزیزے کا دل خفت و ملال سے
 بھر گیا۔ اس نے ایکدم سے ہونٹ بھیج لیے تھے۔۔

”پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے! کل کتنی بدتمیزی
 کر دی ان سے۔ کس قدر ہرٹ ہوئی ہوں گی
 وہ.....“ اس کا انداز خود کلامی کا تھا۔ چہرے پر گہرا
 تاسف و تفکر در آیا تھا۔ لاریب ایکدم سے ہنس دی۔
 ”تو تم انہیں منالو، انہیں بتا دو تم سے غلطی ہو گئی
 ہے۔ لیزے بات دل میں رکھنے سے رشتوں میں
 دوریاں اور دراڑیں پڑتی ہیں۔ کلیئر کر لینے سے
 رشتے نہ صرف پختہ ہوتے ہیں بلکہ ان کا مان بڑھتا
 اور سلامت رہتا ہے۔ اور مان سلامت رہنے
 چاہیے۔ ورنہ دوریوں کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک
 سکتا۔ کیونکہ جب مان ختم ہوتے ہیں تو رشتوں میں
 موجود محبت دھیرے دھیرے دم توڑنے لگتی ہے۔ ہم
 ایک دوسرے سے جس طرح جڑے ہیں، ہمیں
 جڑے رہنا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے میں اتباع اور
 عبدالعلی کے بعد عبدالاحد کا بھی رشتہ طے کرنے کا
 سوچ رہی ہوں اور اس کے لیے میرا خیال اسامہ
 بھائی کی بیٹی کا ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟“ وہ مسکرا کر پوچھ
 رہی تھی۔ عزیزے ایکدم ہنسنے لگی۔

”حد ہو گئی ہے، مجھے لگ رہا ہے میرے سامنے
 چھبیس سالہ لاریب نہیں پچاس سالہ خاتون بیٹھی
 ہے۔ جو رشتوں کے جوڑ توڑ میں لگی ہے اولاد کے۔“
 لاریب نے اس کا ہنسی میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر
 بھرپور آسودگی کے ساتھ بولی تھی۔

”اگر یہ کام ابھی نبٹ جاتے اللہ کے حکم سے تو
 ہم بچوں کے جوان ہونے پر اس ذہنی آزمائش سے

نہ صرف خود بچ جائیں گے بلکہ بچوں کی جلدی
 شادیاں کر کے ان کی خوشیاں دیکھ سکیں گے انشاء اللہ!
 خاص کر عبدالعلی کی شادی تو میں جلدی کرنا چاہوں گی۔
 آخر وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ تم ہرگز بھی تب بہانے نہیں بناؤ
 گی کہ ابھی بیٹی چھوٹی ہے تمہاری یا تعلیم مکمل
 نہیں ہوئی۔“ وہ آرام سے بات کرتے یکدم ٹپکھی ہوئی
 تھی۔ عزیزے پہلے تو ہونٹ ہوئی تھی پھر اس کی شرارت
 سمجھ کر خود بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ان کے جانے کی سب تیاری مکمل تھی۔ سب
 کچھ معمول پر تھا۔ کہ ایک دم سب کا سب دھرا رہ
 گیا۔ عبدالہادی عین وقت پر کسی ضروری کام سے
 نکلا تھا۔ عزیزے کو اپنا انتظار کرنے کا کہہ کر..... واپس
 لوٹا تو عزیزے کو عین صحن کے درمیان بے ہوشی کی
 حالت میں پا کر زمین آسمان اس کی نظروں میں گھوم
 گئے تھے۔ عزیزے اچھی بھلی تھی جب وہ گھر سے گیا
 گیا، ایک دم سے اسے کیا ہوا یا اس پر کیا ہوتی یہ وہ
 سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے اٹھا کر بستر پر منتقل کرتے
 عبدالہادی نے گھر پر ہی اسے ہوش میں لانے کی ہر
 ترکیب آزما کر دیکھ لی مگر کوئی فائدہ نہ ہوتے پا کر
 زمین اس کے قدموں تلے سے سرکنے لگی تھی۔
 عزیزے کو گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے
 جاتے ہوئے اس نے بہت گھبراہٹ زدہ انداز میں
 یہ بات عبدالغنی کو فون پر بتا دی تھی۔ عبدالغنی تب کالج
 میں تھا۔ اسے بھی جیسے زمان و مکان بھول گئے
 تھے۔۔۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ خود بھی ہاسپٹل کی
 جانب بھاگا تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ عبدالعلی کو
 اسکول سے لینے کا وقت ہوا چاہتا ہے اور بچہ اس
 انتظار میں پریشان بیٹھا ہوگا۔

(لفظ لفظ مہکتے اس ناول کی

اکلی قسط ماہ مئی میں ملاحظہ فرمائیے)

مہنگوا اپنے آنکسن میں

”سکون میں سے نہیں آپ نے مہنگوا یہ سوائے بھابی۔ میں آپ کو سے لئی اپنی لہی 7
آپ کو چاہیے تھا مجھے اپنا ہونے کا احساس دیتیں۔ مجھے رونے سے منع کرتیں، ہونے بکھرے
سے بچاتیں۔ مگر آپ نے تو ایسے رتی ایکٹ کیا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور

زندگی کی حقیقتوں کو عیاں کرتا ایک مہکتا افسانہ

کیا بنا رہی ہو؟ مومنہ کچن میں کھڑی راستہ بنا
رہی تھی جب پیچھے سے کلثوم بھابی آ چکی۔ وہ ابھی
ابھی بازار سے لوٹی تھی ابھی ہاتھوں سے سامان اتار
بھی نہیں تھا کہ کچن سے آتی خوشبوؤں نے اسے کھٹکا
کے رکھ دیا جو وہ ادھر دوڑی چلی آئی۔
بریاں بنا رہی ہوں۔ ساتھ راستہ بھی۔ فریج
سے دہی نکالتے ہوئے مومنہ نے آرام سے جواب
دیا تو کلثوم اپنی جگہ سے اچھل کر رہ گئی۔
”کیا؟“

”کیوں کیا ہوا؟“ مومنہ حیرانگی سے اسے
دیکھنے لگی۔
”کارنروالے ڈبے میں چاول پڑے تھے تم
نے وہ نکال لیے؟ کلثوم کی حیرت میں عجیب طرح کی
سختی آنے لگی۔

ظاہر ہے۔ اس ڈبے کے سوا اور کہیں بھی تو
چاول نہیں تھے، پھر وہی سے نکالنے تھے تا۔“ مومنہ
نے اپنی دانست میں بالکل صحیح جواب دیا۔
اور جو صبح میں نے گوشت منگوا یا تھا وہ بھی ڈال

”ہاں مگر دوسروں کی چیزیں چوری کر کے



حواس یافتہ ہو رہی تھی کہ خوشبو بھی اسے زہر سے کم نہ لگی۔

”تم اچھا نہیں کر رہی مومنہ۔“

”میرے خیال میں بریانی بنا کر میں نے کچھ برا نہیں کیا۔“ اس نے تنک کر جواب دیا تو کلثوم کو آگ لگ گئی۔

”اگر تم یہی بریانی افتخار کے گھر بناتی تو میں بھی دیکھتی کہ وہ تمہیں کیسے کھانے دیتا۔“ لب ولہجہ ہی نہیں کلثوم کی آنکھیں بھی شرارے اگل رہی تھیں۔

”وہ حساب کتاب رہنے دیں بھابی، ابھی تو میں نے یہ بریانی اپنے جیتے جاگتے باپ کے گھر بنائی ہے..... مجھے کھا لینے دیں.....“ بے حد سہولت سے کہہ کر وہ کھانے کے برتن لگانے لگی۔

نہیں کھاتا۔ کلثوم کا لہجہ آگ برساتا ہوا تھا۔

”واٹ ڈیو مین۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

مومنہ جیسے کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی تھی۔

”میں نے یہ چاول تمہارے لیے نہیں اولیں کے دوستوں کی جوکل دعوت ہے اس کے لیے رکھے ہوئے تھے اور یہ گوشت آج رات کے کھانے کے لیے تھا۔ تم نے انہیں ہاتھ کیسے لگایا؟“ کلثوم کو اتنا غصہ آ رہا تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا کہ بریانی کا دیگچہ اٹھا کر اس پر الٹ دے۔

”مجھے بھوک لگی ہے جب ہی بریانی کا پروگرام بنا لیا۔“ بالکل ٹھنڈے ٹھار انداز میں اس نے کہا اور ساتھ ہی چاولوں کا دم اتار دیا۔ چاولوں کی خوشبو سارے کچن میں پھیل گئی تھی مگر کلثوم غصے سے اتنی

”اور ہاں آپ بھی ہاتھ منہ دھو کر ٹیبل پہ آجائیں میں کھانے لگانے لگی ہوں۔ اپنے لہجے میں زمانے بھر کی نرمی بھر کے اس نے کہا تو شرارے اگلتی آنکھوں کے ساتھ کلثوم نفی میں گر دن ہلانے لگی۔

یہ تم اور تمہارے بچے کھاؤ جو اپنے گھر سے بھوکے ننگے آئے ہیں مجھے ضرورت نہیں ان کھانوں کی۔ بے حد مشعل سی وہ پیر پختی ہوئی باہر نکل گئی..... مومنہ کے چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ جب سے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر آئی تھی۔ گھر کی فضا میں تبدیلی سی آنے لگی تھی وہ سب محسوس کر رہی تھی۔ بھائی باپ کا رویہ ویسا ہی تھا مگر کلثوم بھابی کا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا اسے لگا وہ اس کے آنے پر خوش نہیں ہیں لیکن جب بھائی اور باپ خوش تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ تو بھلا کلثوم کے رویے کی اسے پرواہ کیوں ہوتی اور اس کی یہی لا پرواہی ادھر کلثوم کو بہت کھٹکا کرتی تھی جس کا اظہار وہ گاہے بگا ہے کرنے سے نہ چوکتی آخر بیٹھے بٹھائے یہ نند صاحبہ ان کا سکون برباد کرنے جو آگئی تھی۔

کلثوم کو تو وہ تیز طرار اور کافی ہوشیار اور چالاک نند پہلے ہی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر جب سے وہ مسلسل اس کے سر پر سوار ہونے کے لیے بوریا بستر باندھ کر لے اور غیر متعین وقت کے لیے آن پکی تو کلثوم کو اپنی راتوں کی نیند حرام ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔

اپنے شوہر اور سرسرا کا ہر وقت مومو، مومو کا راگ الاپنا، مومو کے آگے پیچھے پھرنا، اس کی جی حضوریوں کرنا، اسے تسلیاں دلا سے دینا، اسے

خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ بجٹ متاثر کر کے خواہ مخواہ اسے اور اس کے بچوں کو شاپنگ کرانا، ہوٹلز میں کھانا کھلانا اور راتوں کو اسپیشلی اس کے لیے آسکریم لانا، یہ سب دیکھ کر کلثوم کا بی پی ہائی ہو جاتا، دل بند ہونے لگتا..... ایسے میں اسے مومنہ کا یہاں آنا زہر سے بھی برا لگتا اور دوسری طرف مومنہ جو اپنے شوہر سے لڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے آئی تھی اب باپ اور بھائی کی محبتوں کے سائے میں خوب عیش و آرام سے رہ رہی تھی۔ وہ اور اولیس دو ہی بہن بھائی تھے امی کی وفات کے بعد ابو نے ان کا ماؤں کی طرح خیال رکھا تھا اور ایک ماں کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کو بہت نازوں سے پالا تھا انہوں نے دونوں کو کسی بھی چیز کی کمی ہونے نہیں دی تھی۔ دنیا کی ہر چیز ان کے سامنے لا کر ڈھیر کر دی۔ دونوں میں کبھی فرق محسوس نہیں کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہی، انہوں نے بنا کسی اعتراض کے خاموشی سے ان کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور اب بھی جتنی پنشن لاتے دونوں میں برابر تقسیم کرتے ایسے میں مومنہ اس گھر، اس گھر کی چیزوں اور گھر کے افراد پر رعب نہ جھاتی تو اور کیا کرتی۔

یہ گھر اس کے باپ کا ہے۔ یہی مان اس کے لیے کافی تھا۔ وہ جو چاہے کرے، جو چاہے بھرے، کوئی دوسرا کیوں پوچھے۔

افتخار یعنی اس کے شوہر کے ہاں اس کی ماں کی چیخ تھی۔ نندوں کے الگ روتے پٹنے تھے اور ابھی دو بیٹے کو بیٹھی تھیں..... افتخار کی عازم سی جاب تھی۔ جس سے گھر کا خرچہ چلانا ہی اتنا مشکل تھا کجا کے کچھ سنبھال کر رکھنا۔

چار سال شادی ہو گئے تھے مگر ابھی تک وہ

”بھابی میرے لیے بھی چائے بنا دیجئے گا۔
رات کو وہ ڈرامہ دیکھ کر پانی پینے کی غرض سے پن
میں آئی تو وہاں کلثوم کو چائے بناتے پایا۔
”آئی ایم سوری۔ دودھ بہت لم ہے، صرف
اولیس کے لیے ایک کپ چائے بن سکے گی۔
کلثوم نے سہولت سے معذرت کرنا چاہی تو اس کی
پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

”میں نے بھی صرف ایک ہی کپ پینا ہے۔“
”ایک کپ چائے کے لیے بھی دودھ کی
ضرورت ہوتی ہے۔“ کلثوم کا لہجہ ترش ہوا تھا۔
”آپ بھائی کی چائے مجھے دے دیں۔“
”آئی ایم سوری ان کے سر میں درد ہے میں
ان کے لیے ٹیبلٹ بھی لینے جا رہی ہوں۔“ کلثوم
کپ میں چائے نکالنے لگی۔
اس چائے میں دودھ کچھ زیادہ ہی ہے۔
آپ ایسا کریں اس میں ایک کپ پانی ڈال کر
اسے دو کپ بنادیں۔

”مشورے کا شکریہ۔ مگر میں ایسا نہیں کر
سکتی۔ اور دیے بھی اگر تمہیں اس وقت کچھ پینے کا
دل چاہ رہا ہے تو پانی پی لو۔
”مجھے چائے پینی ہے۔“ وہ ذرا سا بگڑی۔
”تو پھر ایسا کرو یہ دیکھی یہ چینی یہ پتی سب
حاضر ہیں تم اپنے لیے قہوہ بنا لو۔ اس کے پاس بھی
مشوروں کی لائن تھی۔

”میں نے قہوہ نہیں چائے پینی ہے۔“
”پھر اپنے باپ سے کہو کہ تمہیں دودھ لا کر
دے اس وقت۔“

”میرے خیال میں، میں اگر انہیں اس وقت
بھی کہوں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ آرام سے
اٹھ کر دودھ لا کر دیں گے۔ مگر میں ایسا نہیں کروں

وہاں ایڈجسٹ نہ ہو پائی تھی۔۔۔ افکار سے اکثر الگ
رہنے کی فرمائش کرتی تھی مگر افکار اس کی بات
سے کئی کتراتا تھا جب ہی وہ اسے اور اس کے گھر کو
ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے چلی آئی کہ باپ کے گھر
اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کھانا پینا سونا جاگنا کہیں
روک ٹوک نہ تھی۔ ساتھ اپنے دونوں بچے بھی
لے آئی کہ ابواچھے سے اسکول میں پڑھوائیں گے
ان کی پڑھائی لکھائی کا خرچہ وہ باآسانی اٹھالیں گے
۔ جب ہی ادھر آ کر وہ بے حد پرسکون ہو گئی تھی۔ مگر
کلثوم بھابی کا رویہ اسے ذرا ذرا سا بے سکون کرنے
لگا کیوں کہ وہ خواہ مخواہ اس کے ابو اور بھائی اور اس
کی زندگی میں خلل ہو رہی تھی۔

”تم کلثوم کو بھی بلاؤ پھر اکٹھے کھانا کھاتے
ہیں۔ وہ بچوں کو لے کر ٹیبل پر آئی تو سب سے پہلے
ابو کے منہ سے یہ سننے کو ملا۔“ چھوڑیں ابو میں نے
انہیں کہا ہے مگر انہیں بھوک نہیں۔“ اس نے فوراً
برا سامنہ بنا کر جواب دیا تو انہوں نے چونک کر
اسے دیکھا تھا۔

”کیوں بھوک نہیں ہے؟“
”مجھے کیا پتا۔“ دیے بھی وہ ابھی بازار سے
لوٹی ہیں تو یقیناً وہاں سے کچھ کھا کر ہی آئی ہوں
گی۔
”نہیں، وہ باہر کی چیزیں نہیں کھاتی۔“
”چھوڑیں ابو، انہیں کھانا ہوا تو وہ آجائیں گی۔
آپ آرام سے کھائیں۔ وہ پتی۔
”مگر بیٹا۔ کلثوم.....“

”ابو کیا آپ چاہتے ہیں میں بھی کھانا نہ
کھاؤں؟“ اس نے گھور کر اپنے باپ کو دیکھا تو وہ
چپ سے ہو گئے اور وہ سر جھٹک کر کھانا نکالنے
لگی۔

پورا کپ لے لو اور ساتھ میں ٹیباٹ لینا نہ بھولنا۔
اولیس اس سے کہتے ہوئے فریق سے پانی نکالنے
لگا۔

اودھینک پو بھائی چائے پی کر شاید درد میں کچھ
کمی آ جائے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کلثوم سے
چائے کا کپ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔
اولیس میں نے یہ آپ کے لیے بنائی ہے۔۔
کلثوم نے بے بسی سے اولیس کو دیکھا تو اولیس نے
ملامت سے اسے گھورا۔

”اگر مومنہ نے پی لی تو سمجھ لو میں نے پی
لی۔“

”جی۔“ جی دل نہ چاہتے ہوئے بھی کلثوم نے
مومنہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مومنہ فاتحانہ نظروں
سے اسے دیکھتی کپ پکڑنے ہی لگی تھی کہ کپ
وہیں درمیان میں گر گیا۔

”اندھی ہو کیا دیکھ کر نہیں پکڑ سکتی۔“ کلثوم بگڑ
تو پڑی تھی۔

”ایکسیوزی یہ کپ آپ کے ہاتھ سے چھوٹا
ہے میرے ہاتھ سے نہیں۔“

اس نے بھی بنا لحاظ کیے ترکی بہ ترکی جواب دیا
تو کلثوم کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے
لگی۔

”اچھا لڑکس بات پر رہی ہو تم لوگ، تم نئی
چائے بھی تو بنا سکتی ہو۔ کلثوم ایسا کرو ابھی مومنہ
کے لیے ایک کپ چائے کا اور بنادو۔“

”میرے اپنے سر میں درد ہو رہا ہے اولیس
مومو پلیز اپنے لیے کچھ بنانے لگو تو ایک کپ
میرے لیے بھی بنادینا۔ میں اپنے کمرے میں ہی
ہوں۔“ کلثوم کے بھی اسی وقت سر میں درد جاگ
اٹھا وہ پیشانی مسلتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
”دیکھا دیکھا اولیس بھیا کس قدر چالاک ہے

گی کیوں کہ مجھے یقین ہے یہ جو آپ کہ ہاتھ میں
چائے کا کپ ہے یہ با آسانی میں پی سکتی ہوں۔“
اس نے اتنے آرام سے کہا کہ ایک پل کے لیے
کلثوم کو ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ
واقعی مومنہ کے ہاتھ میں چلا گیا ہو مگر اگلے ہی لمحے
اس نے سر جھٹکا اور کپ یہ گرفت اور مضبوط کر لی۔
”خوش فہمیوں سے نکل آؤ بی بی اور یاد رکھو اب
یہاں تمہاری وہ حیثیت نہیں ہے جو شادی سے
پہلے تھی۔“

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے بھابی۔ آپ بھول
رہی ہیں کہ میرے باپ اور میرے بھائی کو مجھ
سے کس قدر محبت ہے۔“

”تو تم اس محبت کا نا جائز فائدہ اٹھانے کی
کوشش نہ کیا کرو۔ کلثوم نے سختی سے اسے
ڈپٹا۔“ میرے باپ بھائی میرے جو بھی نخرے
اٹھائیں میرے لیے وہ جائز ہیں۔۔۔۔۔“ کلثوم کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے بے حد ترشی
سے کہا تب ہی کچن میں اولیس آ گیا۔

”کلثوم میں نے تمہیں پانی کے لیے بھیجا تھا
یار۔“

”لا رہی ہوں دراصل میں آپ کے لیے
چائے بھی بنانے لگ گئی تھی۔ کلثوم نے فوراً چائے کا
کپ اس کے سامنے کرتے ہوئے کن آنکھیوں سے
مومنہ کی طرف دیکھا۔

”اولیس بھائی میرے سر میں بھی درد ہے آدھی
چائے مجھے بھی مل سکتی ہے؟“ مومنہ کن پٹی
دباتے ہوئے بہت اذیت سے بولی تو کلثوم مڑ کر
اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اُف کتنی ڈرامہ باز لڑکی
ہے یہ۔ ابھی تو ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اس سے تو تو
میں میں کر رہی تھی۔ اور ابھی فوراً سردرد کا بہانہ بنا
لیا۔ اس نے مجلس کر سوچا۔ ارے آدھا کیوں

آپ کی بیوی۔ ابھی تو مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ دودھ ختم ہو گیا اب بھلا میں کیسے چائے بناؤں۔“

اگر تمہارے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے تو میں ابھی جا کر دودھ لے آؤں۔

”رہنے دیں بھائی۔ اب صبح ہی چائے پی لوں گی۔ اور ٹیبلٹس میرے پاس ہیں ابھی جا کے لیتی ہوں۔ وہ بظاہر بڑی ملامت سے بولی تھی۔

وہ بے بھی وہ چائے پینے یا لینے تھوڑی آئی تھی۔ بس پانی کی غرض سے آئی تھی۔ کلثوم کو وہاں پا کر اپنی اہمیت جتاننا آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن افتخار اسے لینے آیا تھا۔ مگر اس نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا باب بھائی نے اسے ذرا سا سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ہنسنے لگی۔

”میں آپ پر بوجھ ہوں نا، جب ہی آپ مجھے اتار پھینکنا چاہ رہے ہیں“

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔“

”ایسی ہی بات ہے ابو۔ ورنہ آپ مجھے کیوں افتخار کے ساتھ جانے کو کہتے“

وہ اپنی جگہ بے حد روہانسی ہو رہی تھی۔۔۔

تم اس کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو مومنو۔ ایک طرح سے وہ بیچارہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ ابھی دو بہنیں بیانی ہیں، ماں کا علاج ہو رہا ہے۔ ایسے میں وہ کیسے ایک نیا گھر انورڈ کر سکتا ہے اور ماں بہنوں کو چھوڑ کر کیسے الگ ہو سکتا ہے؟“

”بہانے کرتا ہے یہ، سب بکو اس ہے یہ، اصل میں وہ چاہتا ہی نہیں کہ میں بھی خوش رہوں۔“

”مومنہ تم حالات سمجھنے کی کوشش کرو، کچھ ہی عرصے میں افتخار اپنی بہنوں کو بیاہ دے گا، پھر جو بھی کمائے گا تم لوگوں لوگوں کے لیے ہی ہوگا پھر نیا

گھر بھی بن جائے گا اور تمہیں کوئی پرالہم بھی نہیں ہوگی۔“ مومنہ نے سمجھانا چاہا۔

”آپ تو خاموش ہی رہیں۔ میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں میں سب اچھی طرح جانتی ہوں اور دیے بھی آپ جس مقصد کے لیے کہہ رہی ہیں اسے بھی میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ ادھر کلثوم کے بولنے کی دیر تھی ادھر وہ اس پر چڑھ دوڑی کلثوم نے خفگی سے اسے گھورا۔

”کیا مقصد ہو سکتا ہے میرا؟“

”رہنے دیں میری زبان نہ ہی کھلوائیں تو بہتر ہے۔“ اس نے سر جھٹکا تو کلثوم کو پتنگے لگ گئے۔

نہیں بہتر ہے کہ تم اپنی زبان کھول ہی دو۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ میرا کیا مقصد ہے۔

”کلثوم..... اویس نے کلثوم کو تنبیہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ درمیان میں نہ بولیں یہ جس دن سے آئی ہے میرا سکون برباد کر کے رکھا ہوا ہے۔“ آج کلثوم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

”سکون میں نے نہیں آپ نے میرا برباد کیا ہوا ہے بھابی۔ میں اپنے گھر سے لٹی پٹی نکلی تو آپ کو چاہیے تھا مجھے اپنا ہونے کا احساس دیتیں۔ مجھے رونے سے منع کرتیں، ٹوٹنے بکھرنے سے بچاتیں۔۔۔ مگر آپ نے تو ایسے ری ایکٹ کیا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور زبردستی اس گھر میں اٹھ آئی ہوں غیروں کی طرح ٹریٹ کیا آپ نے مجھے۔“ وہ تو پہلے ہی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ اب موقع ملا تو کیسے گنوا دیتی۔ اپنے دل کے تھپھولے پھوڑنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

”ایکسیوزمی محترمہ تم لٹ پٹ کر آئی کب؟“

جان بوجھ کر تم نے اپنا گھر چھوڑا، خوانخواہ ادھر

اے ہی سمجھائیں تو بہتر ہوگا۔“ کلثوم ترکی بہ ترکی جواب دیتی انھی اور نخوت سے سر جھٹکتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

”مجھ سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بھائی جان۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔“ وہ بھی غصے سے انھی اور باہر نکل گئی اور وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

”کون اے سمجھائے۔ یہ اپنا گھر خود تباہ کر رہی ہے۔ بھائی خود کو پہلے سے زیادہ کمزور محسوس کر رہا تھا۔

”بے وقوف ہے بہت.....“ باپ کے چہرے سے ندامت جھلک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دن کے بعد پورے ایک ماہ تک افتخار نے نہ خود کال کی اور نہ لینے آیا جہاں مومو سکون میں تھی وہاں کلثوم کا سکون مکمل پر باد ہو چکا تھا۔ مومو گھر میں مہارانی بنتی پھرتی تھی اور وہ سارا دن گھر کے کام کاج نمٹانے میں لگی رہتی، جب فارغ ہوتی تو نہ نہ کرتے بھی ان دونوں کے درمیان کسی نہ کسی بات پر بد مزگی ہو جاتی جس کی وجہ سے کلثوم شدید ٹینشن میں آ کر جیسے گھر کے سب ہی افراد سے بے زاری محسوس کرنے لگی تھی۔

مومنہ جیسے اس کے حواسوں پر مسلط رہنے لگی تھی اور کلثوم کا سکون ختم ہوتا جا رہا تھا۔ مومنہ پہلے کی طرح اب بھی گھر پہ حاوی ہی تھی۔ باپ بھائی پہلے ہی اس کی آنکھ کا دیا تھے مگر اب تو جیسے مومنہ کا تسلط ان پر کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا تھا اور یہ دیکھ کر کلثوم کے پاس سوائے کڑھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اس دن بھی کلثوم کو بازار جانا تھا جب ہی وہ

آ کر داویلہ کیا، کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے سب غلط ہو رہا ہے۔ اور ایسے میں تم ٹوٹی بکھرتی کیسے..... یہ سب تو تم ڈھونگ رچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ صرف اور صرف باپ اور بھائی کی ہمدردی بنورنے کی خاطر۔“ کلثوم کہاں ادھار رکھنے والی تھی جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

”زبان سنبھال کے بات کریں بھابی.....“

”مومو بیٹا کیا ہو گیا تمہیں..... کچھ تو خیال کرو۔“

”مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ابوا انہی کو میرے یہاں رہنے سے زیادہ تکلیف ہے۔ جب ہی تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی ہیں کہ مجھ سے الجھیں اور پل میں باہر کریں۔“

”یہ چھوٹی سوچ صرف تمہاری ہو سکتی ہے بی بی۔ ورنہ میں تو تمہیں پچھلے آٹھ سالوں سے یونہی برداشت کر رہی ہوں۔“

”دیکھا، دیکھا ابو..... بھائی دیکھ لیا آپ نے..... یہ کیا کہہ رہی ہے۔ انکے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ سن رہے ہیں آپ.....“ وہ پھر کر باپ بھائی کو دیکھنے لگی۔

”انہیں کیا دکھانا اور سنانا چاہ رہی ہو کیا ان کی آنکھیں اور کان نہیں ہیں.....؟ تمہیں کیا لگتا ہے یہ اپنی بہن بیٹی کی حرکتوں سے انجان بیٹھے ہیں نہیں جانتے سمجھتے جو آج تک تم کرتی آرہی ہو۔“

”اسٹاپ اسٹاپ کلثوم..... کیا ہو گیا ہے؟ تم دونوں کو..... بند کرو یہ زبان درازی۔ پہلے ہی ہم کتنے پریشان بیٹھے ہیں اور اوپر سے تم دونوں لڑنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں.....“

تف ہے تم دونوں پر.....“

”ایکسیوز می اولیس آپ کو یہ پریشانی میری وجہ سے نہیں اپنی لاڈلی بہن کی وجہ سے ہے۔ آپ

کمرے میں آرام کرتے اولیس کے پاس چلی گئی مگر اولیس پہلے سے بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔
”یار آج کا پروگرام رہنے دو کل لے چلوں گا۔“

”پلیز اولیس آپ پچھلے ایک ہفتے سے یونہی کہہ رہے ہیں مگر پھر ہر روز ہی کل کا کہہ دیتے ہیں آج تو آپ چلے چلیں۔“

”سوری یار قسم سے آج تو بہت تھکن ہو رہی ہے پر اس کل ضرور لے چلوں گا۔“

”ذرا سی کنپٹی دباتا وہ بولا تو کلثوم چپ سی ہو گئی تب ہی ایک طرف سے مومنہ چلی آئی۔

”بھائی، بھائی کہاں ہیں آپ؟“

”جی بٹا کیا بات ہے؟“ اولیس فوراً سیدھا ہوا۔

”بھائی دیکھیں نا میرے بچے کتنا تنگ کر رہے ہیں مجھے۔ پلیز آپ انہیں آگس کریم تو کھلا لائیں۔“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مومنہ۔“

”میں نے آپ کو نہیں بھائی کو کہا ہے۔“ کلثوم

کے بولنے کی دیر تھی مومنہ تڑخ سے بولی۔

”مومنہ آپ چلو میں آتا ہوں۔ اولیس فوراً اٹھ

کھڑا ہوا۔

”آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ مومنہ نے

اولیس کی کلائی پکڑ لی۔

”ہاں چلو۔“ وہ کلثوم سے نظریں چراتا مومنہ

کے ساتھ چل پڑا۔ کلثوم کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا

اور آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

”اولیس یہ آپ اچھا نہیں کر رہے؟“ رات

کو اس نے خفگی سے اولیس سے شکایت کی۔

”کیا؟“ اولیس سونے کی تیاریوں میں تھا۔

”آپ مومنہ کو مجھ سے بہت فوقیت دیتے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے کلثوم۔“

بالکل ایسی ہی بات ہے اولیس۔۔۔۔۔ وہ جب سے یہاں آئی ہے میری تو جیسے اس گھر میں اور آپ کی نظروں میں کوئی اہمیت ہی نہیں رہی جب دیکھو مومنہ، مومنہ کرتے رہتے ہیں۔ کھانا پینا، گھومنا گھرنا سب مومنہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“

اس وقت اسے ہمارے سہارے کی ضرورت ہے۔“ اولیس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”غلط۔۔۔۔۔ اولیس بہت غلط کہہ رہے ہیں

آپ۔ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے اپنی بے وقوفی اور کم

عقلی کی وجہ سے کر رہی ہے اس وقت ہمیں بجائے

اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے اسے سمجھانا چاہیے کہ

اس کا گھر ہی اس کے لیے اہم ہے آپ لوگوں کی

بے جا محبت اور ہمدردی، اس کی زندگی کو برباد کر کے

رکھ دے گی اور ہو سکتا ہے افتخار بیزار ہو کر ہمیشہ کے

لیے اسے چھوڑ دے۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔“ اولیس کا لہجہ کچھ کمزور

ساتھا۔

”ایسا بھی ہو سکتا ہے اولیس کوئی مرد کہاں

تک عورت کی بے جا ضدیں برداشت کر سکتا ہے۔

مانا کہ افتخار ابھی نیا گھر بنانے کی پوزیشن میں نہیں

ہے مگر یہ بھی تو ہے کہ وہ جو بھی کما رہا ہے بے جا

اڑا نہیں رہا ہے اپنی گھر کی عورتوں کے تحفظ کے

لیے وہ سب کچھ جمع کر رہا ہے اور یہ صرف ایک دو

سال ہی کی تو بات ہے افتخار کی بہنوں کی شادیاں

ہوتے ہی وہ گھر بھی تو مومنہ کا ہو جائے گا اور

ویسے بھی آپ کو وہ وقت بھولا نہیں ہوگا جب میں

بیواہ کر آئی تو اس گھر پر مجھے مومنہ کی اجاداری ایک

آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میرے دل میں بھی علیحدہ گھر

کی ہڑک جاگتی تھی اور تب میں بھی چوری چوری

آپ کو اپنے گھر کا کہتی رہتی تھی مگر تب آپ نے

میری کوئی بات نہیں سنی تھی کیوں کہ آپ کو بھی اپنی

شکر یہ بھابی رات آپ کی باتوں نے مجھے قتل دی۔“

”کون سی باتیں کیا تم نے میری اور اولیس کی.....؟ کلثوم شرمندہ ہوئی وہ مسکرائی۔

”ہاں میں نے نہ صرف وہ سب سن لیا ہے بلکہ

ان باتوں کو اپنے دل میں بھی اتار لیا ہے جو فارمولہ آپ بتا رہی تھیں وہ میری زندگی سنوارنے کے لیے کافی ہے اس کے لب و لہجہ میں نہیں انداز میں بھی اک اطمینانیت سی تھی۔ اولیس نے مسکرا کر اپنے ابو کو دیکھا جن کے چہرے پر اطمینان سیابکھڑ گیا۔

بھابی کبھی کبھی ایک بہت بڑا لچر سر پرست گزر جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک دو جیل جیسے دل میں اندر اتر جاتے ہیں۔ اس نے ممنون لہجہ میں کہتے ہوئے کلثوم کو دیکھا تو کلثوم نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

وہ شکر یہ کہہ رہی تھی کلثوم نے مسکراتے ہوئے ساتھ لگا لیا۔

”تم بہت سمجھدار ہو مومنہ، مجھے امید ہے تم اسی سمجھداری کے بل بوتے پر اب اپنے گھر کو ہی گھر سمجھو گی اسے ہی بناؤں گی، سنوارو گی اور وہیں خود بھی مہکواں گی اور اپنے آئین کو بھی مہکاؤں گی۔“

کلثوم کے لہجے میں چھپی محبت کی خوشبو کو مومنہ نے اچھی طرح محسوس کیا اللہ بے شک ہر چیز پر قادر ہے پتا نہیں کیسے کلثوم کی باتوں کو کچھ اس طرح سے روشنی بنا کر مومنہ کے دل میں بکھرے اندھیروں کو دور کر دیا کہ ہر سو جیسے خوشیاں سی بکھری محسوس ہونے لگیں تھیں اور اب افتخار مومنہ کی محبت بھری کال ریسیو کرنے کے بعد جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار کسی بھی لمحے گھر پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆☆

بہن اور ابو عزیز تھے آپ ان کو کسی بھی صورت کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے تھے انہیں کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جب ہی تو میں سنبھل گئی اور صبر کیا اس گھر کو پالنے کی خاطر آپ کا ساتھ دیا۔ دل سے۔

مومنہ کی شادی ہونے کا انتظار کیا اور پھر جیسے ہی مومنہ کی شادی ہو گئی یہ گھر مجھے اپنا گھر لگنے لگا میری یہاں انیسیت بڑھنے لگی، مجھے اسی گھر سے محبت ہونے لگی اب یہی گھر مجھے میری جنت لگتا ہے.....“ کلثوم ایک جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی اور باہر کھڑی مومنہ حق دق سی کھڑی تھی کہ اک ذرا سی بات اس کے دماغ میں نہیں آ پا رہی تھی کہ عورت کا گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے اور اسے ہی اپنا گھر بنانا ہوتا ہے۔

وہ تو ”صرف“ آج ہی گھر پر چھائی ہوتی ہیں۔ ”کل“ تو ان کا کسی اور کے گھر میں ہوتا ہے اس میں برا ہی کیا ہے جو تھوڑا انتظار کر لیا جائے، آخر کلثوم بھابی نے بھی تو اس کی شادی کا انتظار کیا ہے اور اگر وہ بھی کر لے تو.....؟ اور پھر اس کے بعد کا سوچ کر اس کا دل دماغ ہلکا ہوتا چلا گیا۔

جب ہی تو صبح ہی صبح وہ اپنا سوٹ کیس لیے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”ارے مومنہ کدھر..... کدھر جا رہی ہو.....؟“ کلثوم سب کے لیے چائے لیے باہر آئی تو حیرت سے پوچھنے لگی۔

”گھر..... اپنے گھر۔“

”کیا؟؟؟“ سب نے چونک کر اسے دیکھا، وہ سر ہلانے لگی۔

”ہاں مجھے اپنے ہی گھر جانا ہے، جو گھر صرف میرا ہے اور میں نے ہی جا کے اسے بنانا ہے۔ اور

ناولٹ

شمع حقیظ

میں ہار کی

مہینہ بھر بعد جب چچی گھر لوٹیں تو آفتاب کے پاؤں پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔ ان کا وہ اظہار
تشکر اتنا اچانک تھا کہ آفتاب ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے سرعت سے چچی کو اپنے قدموں سے
اٹھا کر کھڑا کیا اور بستر پر لٹاتے ہوئے سمجھانے لگا، لیکن چچی اس کے احسانوں پر اتنی.....

زندگی کی ابھی ڈور کو سلجھاتا، ایک خاص ناولٹ جس کا انجام آپ کو چونکا دے گا

دل کا عارضہ چچی کو کب لاحق ہوا؟ کوئی نہیں جانتا۔ بس اس دن بیٹھے بٹھائے سینے پر ہاتھ رکھ کر جو





جھکیں تو مانو فرش ہی چھو نے لگیں۔ پاس بیٹھی عفت کی دادی نے ہڑبڑا کر تھاما اور گھبرا کر صدا کی دیں تو چچی لڑھک کر تخت سے نیچے جا گریں۔ انہیں کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ آنا فانا ڈپنسری کا ڈاکٹر بلایا گیا جو آتے ہی ان کا مرض بھانپ گیا اور کسی پیشہ ور ڈاکٹر کے کورے سے لہجے میں بولا۔ ”خاتون کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ انہیں کسی بڑے اسپتال میں جلد از جلد داخل کروادیں۔“

محلے بھر میں یہ خبر بجلی بن کر گری، چچی اور دل کا دورہ..... بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ تو بڑے حوصلے والی عورت تھی اور با حوصلہ لوگ بھلا دل چھوڑا ہی کب کرتے ہیں۔ لیکن انہونی ہو گئی تھی۔ چچی کے دل نے مزید رنج و غم سہنے سے انکار کر دیا تھا اور اتنا اچانک کیا تھا کہ سب سکتے میں تھے۔

یہ کوئی آج کی بات نہ تھی، محلے میں بسنے والا ہر فرد، چچی کے دکھ سکھ میں شامل رہا کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس محلے کی سب سے پرانی نکلیں تھیں۔

جانے کب ان تین کمروں والے گھر میں آکر آباد ہو گئی تھیں۔ انہوں نے سراج چچا کی ہمراہی میں وہاں بہت سے خوشیوں بھرے دن گزارے تھے اور اب بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کر زندگی کے باقی ایام گزار رہی تھیں۔ اسی گھر کی دہلیز پر جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر، بڑی کھٹنایوں سے طے کیا تھا اور اب تلک زندگی کی سختی کو خوش اسلوبی سے جھیل رہی تھیں۔

ان کے شوہر، سراج، پولیس کے محکمے میں عام سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ محنتی اور قابل انسان تھے، اور اسی قابلیت کے طفیل سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی پا چکے تھے۔ اپنی کم گوئی اور بردبار طبیعت کی بنا پر ان کا اپنے ڈپارٹمنٹ میں بڑا رعب و دبدبہ تھا اور وہ رعب داب چچی پر بھی تسلط جمائے

رکھتا تھا۔ وہ شوہر کے سامنے یوں مؤذب رہتیں جیسے ان کے ماتحت کام کرنے والا کوئی ادنیٰ سپاہی.....

چچا سراج، چچی سے بے حد محبت کرتے تھے ان کی وہ محبت آپس کے احترام و عزت کو بھی بڑھائے رکھتی تھی۔ چچا سراج بیوی کی ہر حاجت و ضرورت کا خیال رکھتے اور انہیں ایک پر آسائش زندگی دینے کے خواہشمند تھے لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ ملازمت کے چند سال بعد ہی بحرموں کے خلاف ایک پولیس مقابلے میں، کسی انجانی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ حکومت نے ان کی اس ناگہانی موت کو وطن دوست سپاہی کی موت قرار دیا اور جرم کے خلاف جہاد کرنے کے صلے میں میڈل سے بھی نوازا تھا، ساتھ کچھ نقد رقم، بطور امداد، بیوہ کے حوالے کی جو ان دنوں اپنے معذور بچے کے ساتھ بے یار و مددگار زندگی جینے پر مجبور ہو گئی تھی۔“

چچی کی زندگی کا ایک تاریک پہلو ان کے بیٹے واجد کی پیدائش بھی تھا۔ وہ ایک معذور بچہ تھا، جس نے دنیا میں آکر والدین کی تمام خواہشات اور خوشیوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ دونوں اولاد کے تمنائی تھے، پر اللہ ان کی آزمائش لینے پر آمادہ تھا۔

شادی کے بعد سات سال انہوں نے اولاد کے حصول کے سلسلے میں ٹونے ٹونے کرتے گزارے تھے۔ پھر طویل انتظار کے بعد جب چچی کو اپنی سونی گود بھرنے کے آثار نظر آئے تو وہ جیسے خوشی سے دیوانی ہو گئیں۔ اللہ کو بالآخر ان پر رحم آ ہی گیا تھا، سو دونوں میاں بیوی آنے والے وقت کے خوش آئند تصور میں گم رہنے لگے۔ اولاد کی عظیم نعمت سے بڑھ کر انہیں اللہ سے اور بھلا کیا چاہیے تھا۔ ان کی اداس اور تنہا زندگی میں صرف یہی ایک کمی تھی جو اب پوری ہونے جا رہی تھی۔

چچا سراج کی خوشی کا رنگ ڈھنگ ہی نرالا تھا۔

وہ آنے والے بچے کے لیے ابھی سے ہی تیاری و خریداری کرنے لگے تھے۔ انہوں نے صرف چند دنوں میں کھلونوں اور کپڑوں سے الماری بھر ڈالی تھی۔

کہتے ہیں مرد کو اپنی نسل کو پروان چڑھتا دیکھنے کی خوشی سب سے زیادہ ہوتی ہے اور پھر وہاں تو سات سال بعد امید بندھی کھی سو سراج چچا کے ہونٹوں پر ہمہ وقت مسکراہٹوں کے دیپ جلتے اور وہ سن ہی سن میں بیٹے کی چاہ میں دن گننے لگے تھے۔ اب وہ چچی کا بے حد خیال رکھتے، انہیں غذا سے لے کر پرسکون نیند تک چچی کا بے حد دھیان رہتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا وارث صحت مند اور خوبصورت پیدا ہو۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب واجد میاں کو دنیا میں آنا تھا۔ دائی ماں کو گھر پر ہی بلوایا گیا تھا۔ اس نے کئی گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے بعد تھک ہار کر چچا کو ڈاکٹر نی بلا لانے کا کہا کیونکہ چچی کی حالت غیر تھی۔ کیس پیچیدگی اختیار کر گیا تھا۔ سراج چچا بے حساب گھبرائے انہوں نے ڈاکٹر بلا لانے کے بجائے بیوی کو اسپتال لے جانا مناسب سمجھا، جہاں فوری آپریشن کے بعد واجد پیدا ہوا۔ وہ بڑے سر اور لاغر دھننی وجود کا حامل ایک عجیب الخلقیت بچہ تھا جو آنکھ، ناک، کان رکھنے کے باوجود عام انسان سے بہت مختلف تھا۔ اس کے ہونٹ بھڑے اور موٹے تھے، آنکھیں بناوٹ میں قدرے ٹیڑھی اور بھینگا پن لیے ہوئے تھیں، ناک دبی ہوئی اور دائیں یا میں کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی جبکہ بازو چھوٹے اور ٹانگیں کچھ زیادہ لمبی تھیں۔ رہی سہی کسر ان بالوں نے پوری کر دی تھی جن سے بچے کا پورا بدن ڈھکا ہوا اور سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اس پر معصومیت سے انگوٹھا چوسنے کی ادا دیکھنے والوں پر خوف سا طاری کر دیتی تھی۔

وہ بچہ مکمل طور پر ایب نارمل اور بے چارگی کی تصویر تھا۔ ایسے بچے کو پالنا اور زندگی کی دوڑ میں شامل کرنا ناممکن تھا۔ واجد جیسا بد شکل وجود اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی خود کو سنبھالنے سے قاصر تھا۔ وہ بچہ آنے والے وقت میں نا صرف مسائل میں اضافے کا سبب بنتا بلکہ لوگوں کے درمیان عبرت کا سامان بن کر رہ جاتا۔ دنیا یقیناً اس کے وجود سے خوف کھاتی اور یہی خوف بھری نظریں اور تبصرہ کرتی زبانیں بچے کے والدین کا کلیجہ چھلنی کرنے کا سبب بھی بنتیں۔ وہ ان حالات کا سامنا نہ کر پاتے اور ذہنی اذیت کا شکار ہو جانے والے تھے۔

اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر نے سراج چچا کو اپنے کمرے میں بلوا کر ساری صورت حال سمجھائی اور آنے والے وقت کی نزاکت کا احساس دلا کر اس امر پر مجبور کیا کہ بچے کو موت کا انجکشن دے کر اس دنیا سے نجات کا اجازت نامہ سائن کر دیں کیونکہ ان کا بچہ زندگی جیسے کے لائق نہیں تھا۔

ڈاکٹر کے منہ سے اتنی سفاکانہ باتیں سن کر سراج چچا کی روح کانپ اٹھی۔ بنیادی طور پر وہ ایک دین دار آدمی تھے۔ اللہ کے کام میں ایسی دخل اندازی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ پھر جو بچہ قدرت کی دی ہوئی مہلت پوری کر کے جیتا جاگتا اس دنیا میں آیا تھا اسے ایک موت بھرے انجکشن سے واپس کیسے بھیج سکتے تھے؟ وہ جیسا بھی تھا، اب ان کی اولاد اور ان کا نصیب تھا، پھر وہ اُسے کیسے ٹھکراتے؟

انہوں نے ڈاکٹر کی تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بچے کو پالیں گے اور علاج بھی کرائیں گے۔ ڈاکٹرز کے بورڈ نے انہیں سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی اور صاف الفاظ

میں بتایا کہ ایسے پیدائشی معذور کا علاج بے سود رہے گا۔ کیونکہ بچہ جسمانی ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی مکمل طور پر اپنا ج تھا اور آئندہ زندگی میں بھی اس کے صحت مند ہونے کا چانس زبردنی صد تھا۔ ایسی زندگی کو کانٹوں پر گھسینا عقل مندی نہیں تھا۔ اللہ نے گوشت کے ایک بے ترتیب لوٹھڑے میں جان ڈال دی تھی لیکن دنیا میں اسے زندہ رکھ کر تماشا بنانا کسی طور مناسب نہ تھا کجایہ کہ پالا پوسا بھی جاتا۔

ڈاکٹرز کے مجبور کرنے پر بھی چچا رضا مند نہ ہوئے۔ انہوں نے بیوی سے مشورہ کرنے کی اجازت مانگ لی۔ وہ جانتے تھے ان کی بیوی سات سال بعد ملنے والی اس اولاد زینہ کے لیے از حد جذباتی تھی۔ نو ماہ اپنی کوکھ میں پلتے وجود کو محسوس کر کے آنے والے خوش آئند وقت کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اس نے وہ دن گن گن کر کاٹے تھے۔ آپریشن کے بعد ہوش میں آنے پر چچی کو بیٹا ہونے کی خوشخبری سنا دی گئی تھی لیکن یہ نہ بتایا گیا تھا کہ بچہ عجوبہ روزگار تھا۔

صورت حال بے حد حیرت انگیز اور دل شکن تھی۔ سراج چچا کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے بیوی کو اعتماد میں لینا چاہتے تھے۔ چچا کی ضد پر ڈاکٹرز نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ حیران تھے کہ آخر سامنے کی بات اس شخص کو بے کیوں نہ پڑ رہی تھی۔ وہ ایک معذور اور عجیب مخلوق کو زندگی دینے پر بضد کیوں تھا؟ لیکن ڈاکٹرز یہ ہرگز نہ جانتے تھے کہ اولاد کا ہونا، نہ ہونے کے غم کو ختم کر کے ایک بے اولاد شخص کو جو سکون دیتا ہے وہ سکون دنیا کی دولت اور ہر آسائش سے بڑھ کر انمول ہوتا ہے۔

شاید سراج چچا بھی اس انمول احساس کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ بچہ بے ترتیب لوٹھڑا سی، مگر ایک خوش کن احساس ضرور تھا۔ اس نے اپنی آمد سے ان

کے دل کی دھڑکن کو باپ بننے کی نوید سنا کر بے ترتیب ضرور کیا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد اس کی معصوم سی روتی بلکتی آواز نے کانوں میں جلت رنگ کے جو سر اتارے تھے وہ روح کو بہت اندر تک سرشار کر گئے تھے اور وہی سرشاری انہیں اس کے قتل سے روک رہی تھی۔

چچا سراج صدیوں کی تھکن لیے بیوی کے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے بڑے سہاؤ سے انہیں اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی لیکن چچی کے اوسان خطا ہو گئے۔ بچے کی حقیقت جان کر وہ جیسے سکتے کی کیفیت کا شکار ہو گئیں۔ ان کے سندر سپنے اتنی بھیانک تعبیر لائیں گے؟! ایسا انہوں نے سوچا تک نہ تھا۔ وہ دل تھام کر رہ گئیں۔ آنکھیں اشکوں سے دھندلا گئیں اور لب پر فریاد مچل اٹھی۔

”خدا یا، ہم سے یہ کیسا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا میں تُو نے ہمیں یہ بچہ عطا کیا۔ اس سے بہتر بے اولاد کی کا دکھ تھا۔ کم از کم میں دکھیا ری کسی کنارے پر تو تھی۔ اب میری سونی گود بھر کے کیا پھرا جاڑے گا میرے اللہ، کیا یہ ظلم نہ ہوگا؟ کیا میں اس بچے کے بغیر رہ سکوں گی۔ جسے میں نے سات سال کی منت مرادوں کے بعد پایا۔ وہ بچہ جس کے لیے ہر لمحہ خواب دیکھے، وہ عجوبہ روزگار ہے تو کیا ہوا..... وہ ہے تو میرا، میری روح، میرے جسم کا ٹکڑا۔ پھر اسے کیسے مار ڈالوں..... کیسے ماروں یا اللہ.....“

”نہیں“..... وہ چیخ اٹھیں۔ نہیں سراج صاحب، میرے بچے کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا، وہ جیسا بھی ہے ہمارا ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے، اسے تحفظ دیں گے، اگر میرے اللہ نے اسے زندہ پیدا کیا ہے تو اسے زندہ رہنا چاہیے..... ہم کون ہیں ایک زندہ روح کو موت کا پیام دینے والے..... ارے یہ صرف اس کا کام ہے، وہ جب تک چاہے گا،

اسے زندہ رکھے گا۔ ڈاکٹرز کو سمجھائیے سراج صاحب! کیا والدین اپنی ہی اولاد کا خون کر سکتے ہیں.....؟ نہیں، انہیں بتائیے دنیا میں آنے والا ہر انسان کسی نہ کسی مقصد کے تحت پیدا کیا جاتا ہے اور اپنے مقصد کے پورا ہونے تک اسے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ اپنے فرض کی انجام دہی کے بعد ہی اسے دنیا سے رخصت ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ کیا ہوا اگر میرا بچہ عام بچوں سے مختلف ہے، ارے وہ زندہ ہے تو یہ خدا کی مرضی ہے، وہ کب تک سانس لے گا..... یہ بھی اللہ کی مرضی ہے۔ اس کی موت کا ذمہ دار صرف اللہ ہے۔ جب وہ اسے موت دینا چاہے گا، دے دے گا پھر ہم ڈاکٹرز کی بات کیوں مانیں.....؟

”نہیں سراج صاحب! ہم اپنے بچے کو موت کا ٹیکہ نہیں لگوائیں گے۔ یہ گناہ ہے..... گناہ عظیم ہے.....“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں، ان کی حالت قابل رحم تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا، سو سراج چچا نے بیوی کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔

یوں واجد میاں، والدین کی محبت میں پرورش پانے لگے تھے۔ چچی نے دن رات ایک کر دیا۔ اپنی ساری توانائی اور مہربانیاں بچے پر کر دیں، وہ واجد جیسے ناکارہ وجود کو یوں سنبھالتیں، جیسے کسی بیش بہا خزانے کو سنبھالا جاتا ہے۔ واجد ان کی عمر بھر کی پونجی تھا۔ کیا تھا اگر دنیا کی نظر میں بے مول تھا۔ ان کے لیے وہ ہر چیز سے بڑھ کر تھا کیونکہ وہ انہیں ”بے اولادی“ کی تہمت سے دور لے گیا تھا۔

لیکن حقیقت جھٹلانے والی چیز نہ تھی۔ یہ سچ تھا واجد دہنی اور جسمانی معذور اور خوفناک وجود کا حامل تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک تماثلے کے طور دیکھا کرتے تھے، دور کھڑے رہ کر وہ چچی کی ہمت و محنت کو داد دیتے، پاس جانے میں خوف مانع تھا جو کسی عفریت کو دیکھ کر دل میں ایک کراہیت کے ساتھ ابلتا

تھا حالانکہ چچی اسی ڈراؤنے وجود کو بڑی محبت سے بانہوں میں سمیٹا کرتی تھیں۔ ان کی محبت کا انداز سچ سچ حیرت انگیز تھا۔ چچی واجد کو نہلاتی دھلاتی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھیں، یہ ان کی محنت توجہ و لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ واجد ہنوز زندہ اور صحت مند تھا، وہ اپنی ماں کو خوب پہچانتا تھا۔ چچی کی صورت دیکھتے ہی قلقاریاں مارنے لگتا لیکن وہ قلقاریاں باریک آواز میں گونجتی چینیوں کی صورت درود یوار ہلانے لگتیں، وہ ہنستا یا روتا تو سننے والے کانوں میں انگلی ڈال لیا کرتے کہ اس کی آواز کان کے پردے کو نیزے کی آئی بن کر چبھتی محسوس ہوتی تھی۔

چچی اپنے بچے میں اس طرح لگن ہوتیں جیسے وہ ایک خوبصورت تندرست بچہ ہو۔ جانے مامتا کا وہ کون سا روپ تھا کہ انہیں واجد کا بالوں بھرا بھیا تک وجود بھی گلاب کے پھول سا نوخیز اور خوبصورت لگتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ چچی ہار مانے بنا واجد کو پالیتی پوتی رہیں اور یوں پندرہ سال کی طویل مدت گزر گئی۔ پندرہ سال بعد بھی واجد ایک ڈھیلا ڈھالا لڑکا ہوا وجود تھا۔ لمبی ٹانگیں بے جان اور سوکھی لکڑی جیسی سخت تھیں۔ ان اکڑی ٹانگوں پر چھوٹا موٹا سادھڑ بے حد عجیب لگتا۔ بدن پر اگتا کالا رُواں اسے جانور ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتا، پھر بھی وہ لو لے اور مر گھلے وجود کی طرح کبھی اپنے بستر اور کبھی کرسی پر ڈھلکا رہتا۔ ایسے میں اس کا بڑا سا بے ہنگم سر شانوں پر گرا ہوتا اور موٹے بھدے ہونٹوں سے بہتی رال دیکھنے والے کو ابکائی لینے پر مجبور کرتی تھی۔ واجد قد میں خاصا اونچا ہو گیا تھا۔ اس کا لاغر وجود چچی کے سامنے سر اٹھاتا دکھائی دیتا لیکن وہ عورت صبر و ایثار کی مورت بنی بیٹے کی خدمت کیے جا رہی تھی اور واجد ماں کی ساری توانائی جیسے اپنے اندر جذب

کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

گزر رہے وقت نے چچی کو بوڑھا اور کمزور بنا ڈالا تھا۔ ایسے میں سراج چچا کی ناگہانی موت نے غم کا ایسا پہاڑ توڑا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھوکھلی ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی مشکلوں سے عبارت تھی۔ شوہر کی معمولی سی مینشن میں گزر اوقات ممکن نہ رہی تو چچی نے سلائی مشین سنبھال لی اور محلے بھر کے کپڑے سینے لگیں۔ حالانکہ واجد جیسے معذور کو سنبھالنا کل وقتی کام تھا۔ وہ پندرہ سال کا ہو کر بھی کسی نومولود سے کم نہ تھا۔ چچی کی زندگی حوادث کا شکار تھی پھر بھی وہ زندگی کی گاڑی کو دھکیلے جا رہی تھیں۔

اس دن وہ زینت کا گرتا پورا کر کے واجد کو کھانا کھلانے بیٹھیں تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، چکرا کر گریں اور سردیوار سے جا ٹکرایا۔ شدت کی ضرب نے لہو کو بہنے کا بہانہ دے دیا۔ ایسے میں اچانک آفتاب اُدھر چلا آیا تھا۔ وہ بھی اسی محلے کا رہائشی تھا اور چچی کی بہت عزت کرتا تھا۔ چھوٹی بہن کا جوڑا جلدی سی دینے کا سندیسہ لانے والا آفتاب انہیں زخمی دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر چچی کو سنبھالا تو اچانک واجد آفتاب پر پل پڑا۔ وہ بچہ جو ہمہ وقت سناکت اور بے جان مورت کی طرح پڑا رہتا تھا، آج نہ جانے کس احساس کے تحت اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور بازوؤں میں آفتاب کی گردن جکڑ لی تھی۔

حملہ بے حد اچانک تھا۔ آفتاب بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے واجد کے مڑے مڑے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس بار وہ آفتاب کی گردن میں بالوں بھری بانہوں کا گھیرا مزید تنگ کر چکا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آفتاب اس کی ماں کو شاید کوئی نقصان پہچانے کی سعی کر رہا تھا۔ ایسے میں واجد

کی نفرت کا انداز حد سے تجاوز کر رہا تھا اور وہ اظہار آفتاب کی گردن توڑنے کے در پر تھا۔

خوف اور گھبراہٹ آفتاب کے سر پر سوار ہو گئے۔ لمحہ بھر کو اسے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ پھر جانے کس احساس کے تحت اس نے خود کو سنبھالا اور پوری قوت سے واجد کی سوکھی بانہوں کا گھیرا توڑ کر اس کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ کوشش خاصی مہنگی ثابت ہوئی۔ واجد ایک جھٹکے سے اچھل کر کرسی سے فرش پر گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آہیں کراہیں پل بھر میں جیسے آسمان چھوٹنے لگیں تھیں۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح ڈکڑا رہا تھا۔ اسے تڑپتا پا کر چچی نے اپنی دریدہ حالت کو پس پشت ڈالا اور تیزی سے اٹھ کر واجد کو سنبھالنے لگیں، جو کسی زخمی پرندے کی طرح اچھل رہا تھا، کو در رہا تھا۔

آفتاب اس افتاد پر اب تلک پریشان و ہراساں کھڑا تھا جب چچی کی با آواز بلند رونے کی صدا کانوں میں پڑی تو گھبرا کر آگے بڑھ آیا اور بوکھلاہٹ سے بولا۔

”کک..... کیا ہوا چچی، آپ کیوں رونے لگیں.....؟ پلیز..... دیکھیے میں نے اسے دھکا نہیں دیا، صرف خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن لیکن لگتا ہے شاید وہ..... وہ مر رہا ہے۔“

”ارے تیرے منہ میں خاک نامراد! میرے بچے کے لیے کیسی بدفالیں بول رہا ہے۔ مریں اس کے دشمن۔“ چچی نے کلس کر آفتاب کو کوسا اور پھر سینے پر دو ہتھ مار کر رونے لگیں۔ آفتاب کے حواس مزید اڑ گئے، وہ کچھ اور قریب آکھڑا ہوا تھا۔

”آخر آپ..... چچی آپ رو کیوں رہی ہیں.....؟“

”ارے تو کیا روؤں بھی نہیں... دیکھ تو کیسے

دہرا ہوتا جا رہا ہے میرا بچہ، نہ جانے کہاں چوٹ پڑی ہے بے چارے کو جو اس سے کبھی نہیں جا رہی۔“ انہوں نے واجد کا لڑکا وجود اس کے آگے کیا تو آفتاب خوف سے یکدم پرے کھسک گیا۔

”مم..... میں کیسے دیکھوں چچی؟ واجد..... بہت خوفناک ہے، مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔“

”آئے ہائے..... چچی نے ممتاز کے غلبے سے چور ہو کر واجد کو سینے میں بھیج لیا۔ ایسا نہ کہو آفتاب! کم سے کم ایک ماں کا دل تو نہ توڑو۔“

”نہیں، میرا وہ مطلب نہیں تھا چچی میں، میں کیا کروں، دراصل مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ جیسے اپنی صفائی دینے کی کوشش میں تھا.....

”ہائے میرے اللہ، کیسے تڑپ رہا ہے بے چارہ، ضرور میرے بچے کو کوئی گہری چوٹ لگی ہے۔“ وہ بے قراری سے واجد کا بدن ٹٹولنے لگیں جواب بھی ایک سانس میں ہائے ہائے کیے جا رہا تھا۔ بولنا اس کو آتا نہ تھا، بس حلق سے آوازیں نکالے جا رہا تھا اور وہ آوازیں اتنی بے ربط اور دلدوز تھیں کہ کانوں کو ناگواری کا احساس دینے کے باوجود سیدھی دل میں اتر رہی تھیں۔

”ارے مبر کر میرے بچے..... ذرا سا مبر کر لے، پہلے دیکھ تو لوں تجھے کہاں چوٹ لگی ہے.....“ چچی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے جیسے واجد کو تسلی دی۔ لیکن وہ چلائے جا رہا تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت ڈھلک رہے تھے۔

”چچی، بہتر یہی ہے ہم اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔“ آفتاب نے خود کو سنبھال کر اس بار کوئی معقول بات کہی تھی۔

”نہیں۔ ڈاکٹر کیا کرے گا مولا؟ وہ آپ ڈر کے واجد سے دس قدم دور کھڑا ہو جائے گا، علاج

کہاں کرے گا، میں آپ ہی دیکھ لوں گی اپنے بچے کو۔ پتا نہیں ایسا کیا ہوا ہے جو آج اس قدر داؤد بنا جائے ہوئے ہے۔ ان کی پریشانی چہرے سے عیاں تھی۔

وہ واجد کے بالوں بھرے بدن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ جلد ہی انہیں اس سوجن کا احساس ہو گیا جو اس کی پسلیوں پر ابھار کی صورت نمودار ہو چکی تھی۔ آفتاب کے دکھیلنے پر واجد الٹ کر کرسی کے ہتھکے پر گر ا تھا۔ غالباً وہیں سے اس کی پسلیوں پر گہری چوٹ آئی تھی اور وہی چوٹ اسے بے اوسان کر رہی تھی۔ چچی نے یہ مشکل اسے ٹھنڈا کیا اور واجد کے شانت ہوتے ہی چوٹ پر ہلکی سی سکاٹی کر کے دوا لگا دی۔ پھر کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگا کر ٹھکتی رہیں۔ اب اسے قرار تھا لیکن وہ ماں سے جدا ہونے پر قطعاً آمادہ نہ تھا۔ سو چچی بدستور اس کا سر گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ واجد کسی شیر خوار بچے کی طرح انگوٹھا منہ میں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ہی مرکز پر نگاہ نکالے پڑا تھا۔

آفتاب کے دل میں پہلی بار ہمدردی اور رحم کے جذبات جاگے تھے۔ دل رحم سے بھرا تو آنکھیں خود بخود نم ہو گئی تھیں۔ کتنا قابل رحم تھا واجد اور اس سے کہیں زیادہ اس کی بوڑھی ماں، جو دن میں جانے کتنی بار اس کی خاطر خود کو اذیت کے سمندر سے گزارتی تھی۔ وہ خود بھی زخمی تھی..... چکرا کر جو گری تھیں تو دیوار لگنے سے سر پھوٹ گیا تھا۔ آفتاب نے دیکھا ان کے ماتھے پر خون نکل کر اب کالی لکیر کی صورت بن گیا تھا۔ وہ اپنی حالت بھلا کر کیسے اپنے بچے کی فکر میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ واجد اتنا بڑا ہو جانے کے باوجود اب بھی خود کو سنبھالنے سے قاصر تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ماں کی آزمائش بھی بنتا جا رہا تھا۔

کرے گا اور انہیں اپنی ذات سے تحفظ کا نرم احساس فراہم کرے گا۔ یہ سوچی آفتاب کی زندگی کا رشتہ بدل گئی تھی۔

اب وہ اکثر چچی کے گھر پر نظر آیا کرتا تھا۔ ان کے چھوٹے موٹے کام سے لے کر ہر اس معاملے کو دیکھنے بھالنے لگا تھا، جو چچی کے لیے کسی مشکل کا باعث ہوتا۔ اللہ کو رحم آگیا تھا جب ہی تو آفتاب ایک فرشتہ بن کر چچی کے بگڑے حالات سدھارنے چلا آیا تھا۔ وہ ان کے حالات دل کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کی اذیت محسوس کرتے ہوئے عملی مدد کا مظاہرہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ابتدا میں محلے والوں نے آفتاب پر انگلی اٹھائی، بے جا تنقید بھی کی۔ واجد کے خوفناک وجود سے دہلانے کی کوشش کی لیکن آفتاب کی ثابت قدمی دیکھ کر بالآخر اپنی اپنی راہ ہو لیے تھے۔

آفتاب خود بھی دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان تھا۔ والدین کا سایا بچپن میں ہی سر سے اٹھ چکا تھا۔ مارے باندھے تھوڑی تعلیم حاصل کی اور محنت مزدوری کرنے لگا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو گاڑیوں کی ڈیسٹنگ پینٹنگ کا کام سیکھ لیا اور ایک بڑے ورکشاپ میں ملازمت حاصل کر لی۔ یوں حالات بدلے اور آفتاب کو دیگر مالی مسائل سے چھٹکارا مل گیا۔ وہ شروع ہی سے خود مختار انسان تھا۔ اپنی مدد آپ کرنے والا۔

ایک چھوٹی بہن تھی۔ جس کی شادی پچھلے برس خالہ کے بیٹے سے بخیر و خوبی انجام پا گئی تھی۔ ورکشاپ سے آفتاب کو اچھی تنخواہ ملتی تھی سو گزر بسر سہولت سے ہو رہی تھی۔ بھائی کی تنہا زندگی دیکھ کر بہن، آفتاب کے سر پر سہرے کے پھول سجانا چاہتی تھی۔ اس کے اصرار پر آفتاب نے رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن اب اس کے دل میں چچی اور

آفتاب خاموشی سے پلٹ گیا۔ روئی اور دوا خرید کر لایا۔ اس نے چچی کا زخم صاف کر کے دوا لگائی اور انہیں واجد کے سو جانے کا احساس دلا کر آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے گھر چلا آیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے چچی کی زندگی کی مشکلات کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ ایک ادھورے اور ذہنی پس ماندہ انسان کے ساتھ زندگی کو کس انداز میں جینے پر مجبور تھیں، کیسی مشقت بھری دکھی زندگی تھی ان کی۔ کڑی دھوپ کی تمازت اور بدلتے حالات و وقت کی تبدیلی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ شوہر کا ساتھ کیا چھوٹا، زندگی بوجھ بن کر رہ گئی تھی ان کی بھی اور واجد کی بھی۔ سوتہا زندگی کا اذیت ناک دکھ واجد کے ادھورے اور ناکارہ وجود سے جڑا تھا جہاں نہ خوشی کی امید تھی اور نہ ہی بہتر اور محفوظ مستقبل کی۔

☆.....☆.....☆

اب آفتاب کی سوچوں کا محور، چچی اور ان کی بے کس تنہائی کے گرد گھومنے لگا تھا۔ یہ احساس اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ تھا یا آفتاب کی اپنی ہمدردانہ فطرت کا نتیجہ تھا کہ وہ چچی کی مدد کرنے کی بابت غور کرنے لگا تھا۔

اس نے سوچا کہ لوگ غریب اور نادار لوگوں کی کفالت کرتے ہیں، ان کے دکھ دور کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کرتے ہیں چیریٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ویلفیئر ٹرسٹ چلاتے ہیں اور اللہ کی نظر میں سرخروئی حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ بھی کیوں نہ ایسی ہی سرخروئی حاصل کرے۔ کسی کی امداد کرنا، بالخصوص اس عورت کی جو واقعی مستحق اور نادار ہو۔ کیا اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوگا۔؟

آفتاب کا دل ہر بار اثبات میں جواب دے رہا تھا، سو اس نے ٹھان لی کہ اب وہ چچی کی ہر ممکن مدد

واجد کا خیال جاگزیں ہو گیا تھا، سو خدمت کرنے کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ اس نے اپنی ذات ہی بھلا ڈالی تھی۔

صبح کام پر جانے سے پہلے وہ چچی سے ملنا نہ بھولتا۔ ان کے کئی چھوٹے موٹے کام کرتا۔ دن بھر کا سودا سلف لا دیتا..... کوئی اور مشکل درپیش ہوتی تو پورے دل اور خلوص سے حل کرتا اور واپسی پر گھر آ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد رات گئے تک چچی کے گھر پر رہتا اور کسی ذمہ دار بیٹے کی طرح ان کا ہاتھ بٹایا کرتا۔ چچی اس کے ایثار پر صدقے داری جانتی اور آنچل پھیلا کر غم آنکھوں کے ساتھ اس کی خیر مانگتی تھیں۔ کامیاب اور سکھی زندگی گزارنے کی دعا دیتے نہ جھکتی تھیں۔ بے شک اللہ کے بعد آفتاب کا سہارا بڑھا پے کی اس کٹھن زندگی میں از حد اہمیت کا حامل تھا۔

☆.....☆.....☆

ان ہی دنوں ورکشاپ کے مالک سیٹھ باقر کے والد کا انتقال ہو گیا۔ سوگ کے لیے دو دن تک ورکشاپ بند کر دی گئی تھی۔ یہ دو دن آفتاب کے لیے فراغت لے آئے تھے سو اس نے سوچا وہ فرصت کا فائدہ اٹھا کر بہن سے ملنے اس کی سسرال جائے گا۔ راشدہ بہن کر حیدر آباد چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے چچی کو مطلع کرنا ضروری تھا، سو وہ اطلاع دینے ان کے گھر چلا آیا تھا۔

اس دن چچی بے حد مصروف تھیں۔ وہ باہر برآمدے کے کچے حصے میں تل کے سامنے واجد کو کرسی پر بٹھائے نہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ واجد نہلانے کے موڈ میں نہ تھا شاید اسی لیے زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلتی پُرشور، بے ربط آوازیں گھر کی فضا کو بے سکون کر رہی تھیں اور اس کے سوکھے چڑے سے ہاتھ ماں کو نہلانے سے حتیٰ

الامکان روک رہے تھے۔ وہ جونہی ڈول بھر کر پانی واجد پر ڈالنے کی کوشش کرتیں..... واجد کے ہاتھ حرکت میں آتے اور ڈول الٹنے سے سارا پانی اطراف میں گر جاتا۔ وہ کرسی پر برہنہ حالت میں گرنے کے انداز میں پڑا تھا۔ اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ واجد کو بے ترتیب انداز میں یوں کرسی پر ہاتھ پاؤں مارتا دیکھ کر آفتاب کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ یہ احساس کہ ایک برہنہ نوجوان بکھری حالت کے ساتھ چچی کے سامنے موجود ہے، اسے اچھا خاصا زورس کر گیا تھا۔

”آپ یہ کیا کر رہی ہیں چچی؟“ آفتاب نے آگے ہو کر پانی سے بھرا ڈول ان کے ہاتھ سے لیا تھا۔

”ارے کیا کروں گی میں قسمت کی ماری۔ بس اللہ کی دی ہوئی ذمہ داری نبھانے کی کوشش میں ہوں۔ دیکھ آفتاب بیٹا، آج جانے کتنے دن بعد واجد کو نہلانے کا سوچا ہے مگر یہ لڑکا اب بھی نہلانے پر راضی نہیں۔ بے وجہ ضد کیے جا رہا ہے، سمجھ نہیں آتی اب کیا ہو گیا ہے اس کو.....؟“ وہ جیسے بے زار کھڑی تھیں، آفتاب کی سرسری نظر ایک بار پھر واجد کے برہنہ وجود پر منڈلانے لگی وہ خود کو فراموش کیے صرف ماں کا چہرہ گھور رہا تھا۔

”اگر وہ نہانا نہیں چاہتا چچی تو رہنے دیجیے نا۔ آپ کو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟“

”ارے ضرورت تو ہے بیٹا، نہلاؤں گی نہیں تو واجد کے جسم سے بو آنے لگے گی اور آج بہت دن ہو گئے ہیں اسے غسل کیے ہوئے..... لیکن دیکھو نا، آج اس کا ارادہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ مان کے نہیں دے رہا۔“

”چچی..... پھر نہلانے کا فائدہ.....؟“

”ہاں مان تو واقع نہیں رہا..... لیکن کچھ تو کرنا پڑے گا آفتاب.....“ چچی اب فکر مند نظر آ رہی تھیں

آفتاب نے بہ غور انہیں دیکھا۔ پھر بولا ”چچی، واجد اب بڑا ہو گیا ہے کیا آپ کو بُرا نہیں لگتا اسے یوں نہلانا.....؟“

”ارے بیٹا، بُرا کیا لگے گا، میرا بیٹا ہے وہ۔ بھلا ماں سے بچے کا کیسا پردہ.....؟“ چچی نے ہنس کر انجانے میں جیسے آفتاب کے ذہن پر چھائے غبار کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید الجھ گیا۔ پھر بھی چچی، واجد اب بچہ نہیں رہا، اس طرح برہنہ حالت میں کھلے بدن آپ کا اسے نہلانا۔“

”ارے یا گل ہو گیا ہے آفتاب!“ چچی نے عجلت سے اس کی بات قطع کی۔ ”اب وہ بڑا ہو گیا ہے تو کیا ہوا، میرے لیے واجد ابھی بھی ایک ننھا بچہ ہی ہے، وہ اگر خود نہانے کے قابل ہوتا تو کیا میرے سامنے اس طرح بے لباس پڑا ہوتا۔ وہ مجبور ہے بیٹا، اسے کیا خبر ماں کے سامنے ایسی حالت میں آنا ہے یا نہیں۔“

چچی کی آنکھیں بھر آئیں، آفتاب کے دل کو کچھ ہوا تھا وہ گم سم سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

”دیکھ آفتاب! واجد میری ذمہ داری ہے۔“ چچی نے اس کی خاموشی محسوس کر کے جیسے ایک بار پھر آفتاب کو سمجھایا۔ ”میں اسے صاف ستھرا نہ رکھوں گی تو اور کون رکھے گا؟ اگر وہ نہائے گا نہیں تو اس کا جسم گل سڑ جائے گا۔ تم جانتے ہونا اس کے بدن پر بالوں کی بہتات ہے سو پسینہ بھی خوب آتا ہے۔ اس لیے واجد کو صاف ستھرا رکھنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے، اگر میں خیال نہ کروں گی تو وہ بے چارہ بیمار ہو جائے گا اور اگر واجد بیمار پڑ گیا تو بتاؤ کون سنبھالتا پھرے گا اُسے۔ اب مجھ بڑھیا سے اتنا کام نہیں ہوتا نا۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں چچی، یہ سب کچھ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔“ آفتاب منہ ہی منہ میں

بدبویا تھا، ادھر چچی خاموشی سے اپنی ڈبڈبائی آنکھیں پونچھنے لگیں، پھر آفتاب کے ہاتھ سے ڈول لیتے ہوئے بولیں۔ ”لاؤ یہ مجھے دے دو، میں اسے نہلا کر فارغ ہو جاؤں، جب تک تم اندر کمرے میں بیٹھو پھر میں تمہیں بہت سے کام بتاؤں گی جو آج ہی نمٹانے ہوں گے۔“

”آپ بے فکر رہیے۔ کام بھی ہوتا رہے گا چچی لیکن یہاں سے ہٹ جائیے۔“ آفتاب نے ڈول پرے کر دیا۔ ”آج واجد کو میں نہلاؤں گا۔“

”تم؟“ وہ ہونق سی ہو کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ ”نہیں بیٹا! تم یہ کام نہ کر سکو گے، واجد ایک ضدی بچہ ہے۔ ہاتھ پاؤں مارے گا تو تم سنبھال نہ پاؤ گے۔ وہ ویسے بھی میرا عادی ہے۔ اگر تم نے نہلایا تو جانے کیسا رد عمل ظاہر کرے۔“

”وہ کچھ نہیں کرے گا چچی، میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں بھی واجد کو سمجھنے لگا ہوں، آپ صرف میری مدد کرتی جائیے۔“ جیسا بتائیں گی میں ویسے ہی اسے نہلا دوں گا، اعتبار کیجیے چچی، میں آسانی سے یہ کام کر لوں گا۔“

آفتاب نے سہولت سے چچی کا بازو تھام کر دور کھڑا کر دیا اور خود واجد کو پکارتے ہوئے نہلانے لگا۔ وہ اب بھی غسل پر آمادہ نہیں تھا لیکن آفتاب کے ہاتھ دھیرے دھیرے اپنا فعل انجام دینے لگے تھے۔ چچی، آفتاب کے اس حسن سلوک پر آبدیدہ ہو گئیں اور دلگیر ہو کر دعائیں دینے لگیں۔ وہ لڑکا جو اُن کے لیے مکمل طور پر غیر تھا، انسانیت کے تقاضے نبھاتا تھا اور بار بار احسان کر کے انہیں زیر بار کر رہا تھا۔ کتنا خیال رکھتا تھا وہ ان دونوں کا۔ دنیا شاید ایسے ہی نرم دل لوگوں سے آباد ہے۔ چچی نے بے اختیار سوچا تھا اور آہستگی سے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لی تھیں۔

پھر آفتاب نے واجد کی ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ بوڑھی ناتواں عورت کو ہر ممکن سہولت فراہم کرتا تھا۔ واجد کو کھلانے پلانے سے لے کر نہلانے تک کا ہر کام خود انجام دیتا تھا۔ نتیجتاً واجد بھی آفتاب سے کھلتا جا رہا تھا۔ وہ اسے دور سے آتا دیکھ کر خوشی سے آوازیں نکالتا، اس کا ہاتھ بے قراری سے تھام کر رال بھرے چہرے سے لگاتا اور بار بار اس کا چہرہ اس انداز سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو..... تمہی ہو میرے سچا! میرے دکھ کا علاج کرنے والے مہربان تم فرشتہ ہو جس نے میری دکھی ماں کی زندگی میں سکھ اتار دیا ہے۔ تم نہ ہوتے تو شاید وہ بوڑھی عورت ہمت ہار جاتی۔“

آفتاب اپنی خدمات سے مطمئن تھا۔ اسے وہ سارے کام کر کے تسکین بھی ملتی تھی، اب وہ خود کو چچی کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا، اسے لگتا جیسے وہ اس کی اپنی ماں ہو اور واجد اس کا چھوٹا بھائی۔ وہ کسی صلے کی تمنا کے بغیر اپنا کام انجام دے رہا تھا کیونکہ یہ اللہ واسطے کی بات تھی۔

☆.....☆.....☆

وقت ہوا بن کر اڑتا جا رہا تھا، تین سال اتنی سرعت سے گزرے مانو پر لگا کر اڑ گئے ہوں۔ آفتاب اب چچی اور واجد کی زندگی کے لیے لازم و ملزوم تھا۔ اس کا ہونا ان ماں بیٹے کے لیے زندگی کی نوید تھا۔ دونوں مطمئن اور مسرور تھے، لیکن وہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ دکھ بھری زندگی کے بعد خوشی اور سکون کے لمحے شاید چچی کو اس نہ آئے تھے۔ انہیں بہت اچانک ہارٹ اٹیک نے آلیا تھا۔ دل کا پہلا دورہ انتہائی شدید تھا۔ پورے محلے میں ہا ہا کار مچ گئی۔ چچی جیسی باہمت عورت کی تکلیف نے ہر دل کو بے سکون کر ڈالا تھا شاید۔ اسی لیے ڈاکٹر کے کہنے پر محلے والوں نے بڑی مستعدی دکھائی تھی اور

چچی کو فائٹ دل کے اسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ ادھر چچی موت و زندگی کی کشمکش میں تھیں اور ادھر واجد میاں کو سنبھالنے والوں میں صرف ایک آفتاب کی ذات تھی۔ ان کڑے حالات میں، اس نے جس جاں فشانی، خدمت گزاری اور انسان دوستی کی مثال قائم کی، اس کی نظیر نہ مل سکتی تھی۔ چچی کی غیر موجودگی میں واجد کو ایک ماں کی طرح سنبھالا اور اسے لمحہ بھر کے لیے بھی ماں کی دوری کے احساس کے قریب جانے نہ دیا تھا۔

چچی جتنا عرصہ اسپتال میں رہیں، آفتاب نے اتنے دن درکشاپ سے چھٹی لے لی تھی، واجد کو سنبھالنے اور اس کی نگہداشت کرنے میں اپنے ہر پل کو وقف کر ڈالا تھا۔

☆.....☆.....☆

مہینہ بھر بعد جب چچی گھر لوٹیں تو آفتاب کے پاؤں پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔ ان کا وہ اظہار تشکر اتنا اچانک تھا کہ آفتاب ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے سرعت سے چچی کو اپنے قدموں سے اٹھا کر کھڑا کیا اور بستر پر لٹاتے ہوئے سمجھانے لگا، لیکن چچی اس کے احسانوں پر اتنی جذباتی ہو رہی تھیں کہ بس روتی جاتی اور دعا دیتی جاتی تھیں۔ واجد جیسے لٹکے وجود، بد شکل اور بد وضع انسان کو سنبھالنا، اس کا خیال رکھنا بہت معنی رکھتا تھا اور آفتاب نے اعلیٰ ظرفی سے ان کا وہ مشکل وقت گزار دیا تھا، آفتاب کی محبت فراموش نہ کی جاسکتی تھی۔ اپنی قربانی اور بے لوث خدمت کے طفیل اب وہ چچی کے لیے بے حد اہم تھا، وہ آفتاب کے لیے جان بھی دے سکتی تھیں۔ انہوں نے آفتاب کو واجد کی طرح اپنا سگا بیٹا مان لیا تھا۔ ان کا اعتماد پہلے سے بڑھ کر تھا، اب وہ اس کی ذاتی زندگی میں چھٹی عمل دخل کر لیا کرتی تھیں۔ اس کے اکثر فیصلے ماں بن کر خود سے کر دیا کرتیں جسے آفتاب بے چوں

جہاں مان لیا کرتا تھا۔

گزرتے وقت نے جیسے مصروفیت کے جال پھیلانے تو آفتاب از خود چچی کے گھر بار سے کچھ دور ہو گیا۔ اپنی نئی شادی شدہ زندگی کی خوشیوں کے درمیان آفتاب کو وہ دوری اتنی محسوس نہ ہوئی جتنی کہ چچی کو..... وہ آفتاب کی عادی ہو چکی تھیں اور اس کی مدد کے بغیر گزارہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ چچی ایک جہاندیدہ عورت تھیں۔ وہ بدلتے وقت کی اس ادا سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں آفتاب اب شادی شدہ مرد تھا، وہ تنہا نہ رہا تھا۔ اب اس کا ایک گھر تھا، بیوی تھی اور روزمرہ کی مصروفیات تھیں پھر اس سے کس بات کا گلہ شکوہ کرنا..... واجد کو نہلانے کا کام اب بھی آفتاب کے ذمے تھا اور وہ اس ذمہ داری سے کوتاہی نہیں برتا تھا۔

کچھ مہینے اور گزرے، چچی کے روز و شب ایک بار پھر کام کے بوجھ تلے گزرنے لگے تھے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ نحیف اور کمزور ہو گئی تھیں۔ دل کی بیماری کے ساتھ محنت کی زندگی گزارنا ممکن نہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ محلے بھر کی سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کر رہی تھیں۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ واجد کی فکر تھی جو اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج تھا، ہاں آفتاب کی کچھ محنت ضرور رنگ لائی تھی، واجد اپنے بڑے بڑے بے ہنگم بالوں بھرے ہاتھوں کو استعمال کرنا ضرور سیکھ گیا تھا۔ وہ چیزیں آسانی سے گرفت میں لے کر ادھر ادھر دھکیل دیا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت غیر معمولی تھی۔ کوئی چیز ایک بار پکڑ لیتا، تو کئی گھنٹے اسے پکڑے گھورتا رہتا۔

آفتاب نے اسے مختلف کھلونوں اور رنگوں سے بھرپور تصاویر کی جانب متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ شاید یہ اسی پر خلوص محنت کا نتیجہ تھا کہ واجد جیسا نا کارہ بندہ بھی رنگین پوسٹرز اور بھالو، بلی ٹائپ

وہ چچی ہی کا اصرار تھا جو آفتاب نے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ چھوٹی بہن نے ایک اچھی سی لڑکی بھائی کے لیے ڈھونڈ رکھی تھی، جسے چچی کی منظوری کے بعد حتمی رشتہ بنا کر تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ یوں کچھ عرصے بعد ہی آفتاب کی شادی ہو گئی۔ اس کی شادی پر چچی نے ایک ماں کے دل میں، بیٹے کی شادی کے جوار مان تھے، وہ سب نکالے اور سراج چچا کی طرف سے ملنے والا منہ دکھائی کا جڑاؤ ہار آفتاب کی دلہن کو تحفے کے طور پر دے دیا تھا۔ وہ جڑاؤ گلوبند بے حد قیمتی تھا۔ آفتاب نے ہچکچاتے ہوئے انکار کیا تھا، لیکن چچی نے اسے دلہن کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ یہ آفتاب کے احسان کی قیمت نہ تھی، لیکن خصوصی محبت کا اظہار ضرور تھا۔ وہ آفتاب کو اپنے واجد سے کسی طور کم نہ جانتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شادی کے بعد آفتاب کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی تو ذمہ داری میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب اسے اپنی گھر گریہستی کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ اس کی بیوی بے حد سنجیدگی کی طبیعت کی ایک پُر خلوص اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ اس کی محبت اور وفاداری آفتاب کی زندگی کو سکون اور نشاط سے بھر گئی تھی۔

شادی کے بعد بھی آفتاب اسی طرح چچی اور واجد کا خیال رکھتا تھا۔ ان کا ہر کام بڑھ چڑھ کے کرتا، لیکن پھر بھی پہلے جیسی بات نہ رہی تھی۔ زندگی میں آنے والی تبدیلی کے بعد آفتاب کو چچی کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ نئی نویلی دلہن کو وہ سارا وقت گھر کی چار دیواری میں قید کر کے نہ رکھ سکتا تھا۔ سو سیر و تفریح بھی ہوتی اور سسرال آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔

کے کھلونوں سے خوب کھیلتا اور ان کے خال و خد کو دیر تک گھورتا رہتا تھا۔ وہ مشغلہ جب اس کے ہاتھ لگا تھا، چچی کو کام کرنے اور دھیان بنانے میں بہت سہولت ہو گئی تھی۔ واجد کھلونوں کی دنیا اور ان کے شوخ رنگوں میں کھویا رہتا اور چچی اپنی روز مرہ کی گھریلو مصروفیات نمٹاتی رہتیں، یوں پورا دن کسی ہنگامے کے بغیر گزر جاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بدن کو سردی کا احساس دلا رہی تھی، لیکن موسم سے بے خبر چچی سلائی مشین پر جھکی زاہدہ بی کا جوڑا سینے میں مشغول تھیں۔ ایسے میں اچانک سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ چچی خود کو سنبھالیں، درد بے قابو ہوا تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دھڑکن بڑھتی چلی گئی اور شدت کی تکلیف نے ان کے بدن کو اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔

اس بار دل کا دوسرا دورہ، پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دہری ہو گئیں پھر بھی خود کو گرنے سے بچا نہ سکیں، اگلی ہی ساعت چار پائی سے الٹ کر وہ فرش پر اوندھی جا پڑیں۔ انہیں تڑپا دیکھ کر واجد نے کھٹی آوازوں سے چلانا شروع کر دیا۔ چچی کے گرنے سے جو زوردار آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے واجد کو از حد خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر سارے کھلونے ہاتھ بار کے پرے پھینک دیے اور اپنی کرسی پر کسی پر کٹے پنچھی کی طرح پھڑپھڑانے لگا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے نکلتی بے ربط آوازوں کو سننے والا آج کوئی نہیں تھا۔ چچی کی حالت تشویش ناک تھی۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری تھا تاکہ ڈاکٹرز ان کی زندگی بچاتے لیکن بد قسمتی سے آج آفتاب کا سہارا بھی چچی کو میسر نہ تھا۔ وہ چند دن بیشتر بیوی کو لے کر میسے روانہ ہوا تھا۔ اس

کی بیوی امید سے تھی اور آفتاب نے بیوی کو میسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ چچی کو سسرال جانے کی باقاعدہ اطلاع دینے آیا تھا۔ بیوی کو اس کے میسے چھوڑنے کے بعد اسے بہن سے ملنے حیدر آباد بھی جانا تھا سو واپسی ہفتہ دس دن سے پہلے ممکن نہ تھی۔

آفتاب کے جانے سے چچی پر کام کا دباؤ بڑھ گیا تھا، گھر کے ساتھ واجد کی جملہ ذمہ داری ان کے سر آٹھری تھی جس کی وجہ سے وہ خود کو تھکی ہاری سی محسوس کرنے لگی تھیں۔ چکراتے سر اور دکھتی کمر کے ساتھ اگر بستر پر جا پڑتیں تو تب بھی آرام کے لمحے نصیب میں نہ تھے۔ جلد پایدیر واجد کی ہا ہا کارا نہیں اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی اور وہ بیٹے کی حاجت روائی کے لیے پھر سے سرگرم عمل ہو جایا کرتی تھیں۔ شاید یہ وہی تھکاوٹ، پریشانی اور کمزوری تھی جس نے ایک بار پھر چچی کو دردِ دل میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

دل کا دوسرا دورہ انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس دن اچانک زاہدہ بی کسی فرشتے کی صورت نمودار ہوئی تھیں۔ انہیں میلاد پر جانا تھا، سو وہ خود ہی چچی سے اپنا جوڑا لینے چلی آئی تھیں۔ لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا، وہ اوسان خطا کرنے کو کافی تھا۔ وہ اٹنے قدموں واپس دوڑیں اور آس پڑوس سے بھی کو بلا لائیں۔ محلے والوں نے مل جل کر چچی کو دل کے اسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹرز کی بھرپور کوششوں کے بعد بالآخر چچی کی زندگی بچالی گئی۔ دل کا دورہ جان لیوا ہونے کے باوجود چچی کی سانس توڑنے میں ناکام رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

چچی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھیں۔ ان کے اسپتال میں رہنے کی وجہ سے محلے بھر کے لیے

واجد کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ کوئی بھی اس کو ریلانا انسان کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ سب اس کے مر گھلے، لٹکے وجود سے خوف کھاتے اور قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ ان حالات میں واجد حد درجہ برا بیچتہ حالت کا شکار تھا۔ ماں سے دوری اور نا آشنا تنہائی نے اس کی ذہنی حالت کو بُری طرح مجروح کیا تھا۔ اس کے داویلا مچانے پر محلے کے لوگ دور کھڑے رہ کر اس بے زبان کا تماشا دیکھتے، پھر بھی اس کی مدد کو نہ بڑھتے تھے۔

واجد دو دن تک تنہا گھر میں بھوکا پیاسا رہ کر شور مچاتا رہا۔ وہ مفلوج اور ذہنی پس ماندہ تھا تو کیا ہوا..... تھا تو بندہ بشر، جسے وقت پر بھوک لگتی تھی اور پیاس بھی۔ حوائج ضروریہ سے فراغت اس بے چارے کی مجبوری بھی تھی۔ دو دن کی تنہائی میں وہ غلامت سے بھر گیا تھا۔ اطراف میں بو پھیل جانے پر محلے والے اس کی طرف سے کچھ اور غافل ہو گئے البتہ کچھ رحم دل ایسے بھی تھے جو دور کھڑے رہ کر روٹی کے چٹھ نگرے واجد کو جانور سمجھ کر اس کے آگے پھینک آتے تھے۔ واجد انہیں انھانے سے قاصر تھا، یہی تو اس غریب کی مجبوری تھی کہ وہ ماں کا محتاج تھا۔ وہ ممتا کی ماری نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالا کرتی تھی اور پانی سے بھرا گلاس منہ سے لگا کر واجد کی پیاس مٹایا کرتی تھی۔

تیسرے ہی دن واجد کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کی اُدھ مری حالت بھانپ کر کچھ لوگوں کو ترس آیا تو ہمت باندھ کر انہوں نے معذور افراد کے ادارے میں فون کر دیا، وہ آئے اور واجد کو بے دردی سے ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں ڈال کر کسی جانور کی طرح لے گئے اور اس بے چارے کی آہ و زاری کو بھلا کر معذوروں کے لیے بنائے گئے سلاخوں والے کمرے میں کسی قیدی کی طرح بھرتی کر دیا اور پھر

بے خبر ہو گئے تھے۔ چچی کے صحت یاب ہو کر گھر لوٹنے تک واجد کی حالت بے حد ابتر ہو گئی تھی۔ غیروں کے رحم و کرم پر رہ کر وہ رہے ہے اوسان بھی کھو بیٹھا تھا۔ معذوروں کے ادارے میں اس سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا تھا، وہ سلوک، جس کا واجد قطعاً عادی نہ تھا۔ اس نے ابتداء ہی سے ماں کے ریشم لہجے اور نرم رویے کو پایا تھا۔ اس کے پیار اور لمس سے ٹھنڈک حاصل کی تھی لیکن اب انتظامیہ کے چند لوگوں نے اسے اپنی چڑچڑاہٹ نکالنے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اُن کے تھپڑ اور ٹھڈے کھا کر واجد کی حالت پتلی ہو گئی تھی، وہ ماں کی طرح دل کے دورے کا مریض نہ تھا لیکن چچی کی طرح موت کی راہ دیکھنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

پورے خندہ دن بعد آفتاب اپنے شہر لوٹا تو اسے چچی کے غلیل ہونے کی اطلاع ملی تھی، وہ بھاگم بھاگ ان کے گھر پہنچا لیکن خالی گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ واجد کہیں نہیں تھا۔ محلے داروں کی زبانی اسے واجد کے ادارے میں پہنچا دیے جانے کی خبر ملی تو وہ تڑپ اٹھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے وہ واجد کو دوبارہ گھر لے آیا تھا مگر واجد لاغرا اور بد حال سا واجد گم سم اور بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی مخصوص کرسی پر گرا پڑا تھا۔ مظلم اور خوف کے گریہ احساس نے اس کی حالت مُردوں سے بدتر کر دی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے لٹکے ناکارہ وجود کی طرح کسی غیر مرئی نقطے پر نظر گارے چپ چاپ پڑا تھا۔ آفتاب نے اسے بہلانے اور پکپکارنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر وہ سہا سا وجود جانے کس اور دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر ایک جامد خموشی خاری تھی۔

ادھر چچی کے گھر آ جانے کے بعد بھی اس کی

حالت میں سر مو کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ماں کو سامنے پا کر بھی واجد بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا اس کی بگڑی حالت اور زخمی وجود دیکھ کر بنا بتائے چچی کو جیسے ہر بات کی خبر ہو چلی تھی۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کے اسپتال جانے کے بعد محلے والے واجد کی دیکھ بھال کرنے میں ناکام رہے تھے اور اس ایسی جگہ چھوڑ آئے تھے جہاں اسے جانور سمجھ کر باندھا اور پیٹا گیا تھا۔ آفتاب کو بھی اس ناگہانی وقت ہی میں شہر سے باہر جانا تھا اگر وہی موجود ہوتا تو واجد ادارے کے ظلم کہاں سہتا..... لیکن وہ تو ہونا ہی تھا۔ ماں بیٹا اس بھری دنیا میں لاوارث تھے اور لاوارثوں کو زندگی میں ٹھوکر دوں کے سوا اور بھلا کیا ملتا ہے۔

واجد کی بگڑی حالت اور گرم سم انداز چچی کے دل کو تڑپا گیا تھا۔ وہ من میں دہکتی بے بسی کی آگ میں جل کر پل پل سلگ رہی تھیں۔ واجد پر نگاہ پڑتے ہی آنکھیں ڈبڈباناے لگتی تھیں۔ کیا اسی دن کے لیے انہوں نے محنتوں ریاضتوں سے واجد کو سنبھالا تھا۔ ادھورا ہونے کے باوجود انہوں نے اسے اکلوتی اولاد سمجھ کر پالا تھا اور ریشم سی زندگی دینے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی ان کا دست شفقت واجد کے سر سے کیا اٹھا، دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ان کا لاڈلا بیٹا زندوں میں رہا تھا نہ مردوں میں، اس کا سکون و اطمینان کھو گیا تھا۔

چچی پریشان رہنے لگیں، انہیں آنے والے وقت کی چاپ سٹائی دے رہی تھی، اپنی اچانک آجانے والی موت سے خوف آنے لگا تھا، وہ بہ خوبی جانتی تھیں کہ دل کا آخری دورہ انہیں اب کی بار دنیا سے اٹھا دے گا پھر اس کے بعد واجد کا کیا ہوگا.....؟

یہ اندوہناک سوال دل کی دنیا ہلا ڈالتا تھا۔ کیا ان کے گزر جانے کے بعد وہ دوبارہ نادار اور معذور لوگوں کے بیچ جانوروں کی طرح رہ کر نفرت بھری

زندگی گزارنے کا اہل تھا؟ کیا اس کی معذوری، مجبوری بن کر اس کی زندگی کا دائرہ تنگ کرنے والی تھی؟

چچی جتنا سوچتیں اتنا ہی الجھتی جاتی تھیں۔ روح زخمی اور من بو جھل تھا۔ انہیں وہ ڈاکٹر شدتوں سے یاد آرہا تھا، جس نے واجد کی پیدائش پر ان کے شوہر سراج کو حقیقت حال سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کی تھی اور آنے والے وقت کے خطرات اور مسائل سے آگاہ کیا تھا۔ وہ وہی مسائل تھے جو آج چچی کو درپیش تھے۔

انہیں یاد تھا، ان کے شوہر سراج ڈاکٹر کے دلائل بھرے اصرار پر اپنے ایب نارمل بیٹے کو موت کا ٹیکہ لگانے پر کسی حد تک راضی ہو گئے تھے، لیکن چچی نے جی جان سے ان کی مخالفت کی تھی، انہیں آج بھی اپنے کہے الفاظ یاد تھے۔ انہوں نے گریہ زاری کرتے ہوئے کہا تھا.....

”نہیں سراج صاحب! واجد جیسا بھی ہے ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے۔ جب اللہ نے اسے زندگی دی ہے تو ہم مارنے والے کون ہیں؟ اللہ نے انسان کو اس کی زندگی کے کسی مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ دنیا میں اس کی انجام دہی کیے بغیر لوٹ کر نہ جائے گا مجھے یقین ہے یہ بچہ بھی یونہی پیدا نہیں کیا گیا، اللہ قادر المطلق ہے۔ وہ چاہے تو اسے موت دے گا۔ جب موت اور زندگی اسی کے ہاتھ ہے تو ہم واجد کو موت کا ٹیکہ لگوا کر اس کے قتل کے ذمے دار کیوں بنیں؟ یہ گناہ ہوگا سراج صاحب..... یہ گناہ عظیم ہوگا.....“

اور اللہ پر یقین و بھروسہ رکھنے والی چچی آج واجد کی زندگی کو اپنی عظیم غلطی خیال کر رہی تھیں۔ وہ فلسفہ جو انہوں نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے بولا تھا اس فلسفے کی تعبیر و تفسیر ان کے سامنے آج تک نہ آئی

تھی۔ واجد کا نا کارہ مفلوج وجود آخری مقصد براری کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا تک نہ کھا سکتا تھا پھر کسی فرض کی ادائیگی کیسے کرتا..... کیا اللہ اس جیسے لٹکے مر گھلے وجود سے بھی کوئی کام لے سکتا تھا.....؟ نہیں، ایسا ممکن نہ تھا، شاید واجد دنیا کے لیے صرف عبرت بنا کر بھیجا گیا تھا۔

چچی کا دل ٹوٹ کر رہ گیا تھا، وہ جانتی تھیں ان کی عیادت کے لیے آنے والا ہر شخص واجد پر رحم بھری نگاہ ڈالتا تھا اور اس کے مستقبل کے بارے میں چچی سے کچھ نہ کچھ ضرور پوچھتا کیوں کو کہیں نہ کہیں سبھی کے ذہن میں یہ سوال یا اندیشہ اٹکا پڑا تھا کہ چچی کی موت کے بعد واجد کا کیا ہوگا؟ بے رحم دنیا کا ایک دکھاری ماں سے اس کے معذور بیٹے کی ادھوری زندگی کا مستقبل پوچھنا اور ناامیدی کے اندھیرے کو بڑھائے جانا عبرت کا سامان ہی تو تھا۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لیے انہوں نے واجد کو پالا تھا۔ بڑا کیا تھا.....“

”نہیں.....“ وہ سوچوں سے الجھ کر بے اختیار اٹھ بیٹھیں، ان کی نظریں سامنے کرسی پر ڈھیر ہوئے واجد پر منڈلانے لگی تھیں۔

آفتاب نے بہت دنوں کے بعد آج اس کے سامنے کھلونوں کا انبار اکٹھا کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا واجد کوئی رد عمل ظاہر کرے اور اپنی چپ کے حصار سے نکلے۔ چچی نے دیکھا آفتاب ایک ایک کھلونا اٹھا کر واجد کو تھماتا اور اسے پکارتے کی کوشش کرتا، لیکن وہاں وہی جامد سی خموشی تھی۔ ایک ہی مرکز پر نگاہ ٹھہرائے کم سم حالت میں منہ سے گرتی رال کے ساتھ واجد عبرت و بے کسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

چچی کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل کے اندر جیسے برجمی سی اتر گئی تھی، وہ بستر سے اٹھ کر آفتاب کے نزدیک آئیں اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے

ہوئے رندھی آواز سے بولیں۔

”کیوں اپنا وقت اس بے چارے پر ضائع کر رہے ہو بیٹا! وہ اس وقت ایک بے جان مورتی بنا بیٹھا ہے۔ تمہاری محبت کا کوئی جواب نہیں دے گا۔“

”ارے کیوں نہیں دے گا چچی! واجد پہلے بھی کھلونوں سے کھیلتا رہا ہے، یقیناً اب بھی وہ رنگ برنگے ان کھلونوں کی طرف اپنا ہاتھ ضرور بڑھائے گا۔ ہمیں مایوسی سے دور رہنا چاہیے۔“

”نہیں آفتاب، واجد ایسا نہیں کر پائے گا۔ دنیا کے ناروا سلوک نے اس معصوم کو اندر تک سے دہلا دیا ہے۔ اب بھلا ایک ڈرا سہا وجود ان بے جان کھلونوں سے کہاں پہلے گا۔ وہ اعتماد اور محبت سے محروم ہو چکا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے چچی، مایوسی کی باتیں نہ کریں، میں پر امید ہوں۔ آپ دیکھنا واجد میری کوشش کو رائیگاں جانے نہ دے گا۔“

آفتاب نے بڑے وثوق سے انہیں آس دلائی اور رنگین کھنکھروں والا ایک جھنجھٹا اٹھا کر ہولے سے بجایا اور واجد کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کی چھن چھن کی تیز آواز ہے چونک کر واجد کی ٹھہری نظر اپنے مرکز سے ہٹ کر بچھنے کی طرف آئی تو آفتاب نے وہ کھلونا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ واجد کی پھٹی پھٹی آنکھیں بچھنے کے جھلملاتے رنگوں کو کھوجنے لگیں، اس کے ہاتھ کی گرفت اپنے کھلونے پر مضبوط ہو چکی تھی جبکہ چہرے پر پھیلے سنائے میں دلچسپی کی ہلکی سی رمت جا گئی تھی، واجد کا بدلتا تاثر اتنا واضح تھا کہ آفتاب خوشی سے دیوانہ ہو گیا، بے ساختہ پلٹ کر چچی سے بولا۔

”دیکھا، میں نا کہتا تھا واجد میری کوشش کا بھرم ضرور رکھے گا۔ دیکھیے چچی! اس نے کس طرح یہ جھنجھٹا اپنے ہاتھوں میں کس مکے پکڑ لیا ہے، اب دیر

تک وہ اس کے رنگوں کو تکتا رہے گا، واجد ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا، بس اب اسے ہماری بھرپور توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔“

چچی ابدیدہ ہو گئیں، شفقت سے آفتاب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

”اللہ تمہیں اجر عظیم دے آفتاب! تمہیں عمر خضر دے۔ ایک تم ہی تو ہو جو مجھے مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر ایسی روشنی دیکھنے پر مجبور کرتے ہو، لیکن میرے بچے، ایسی کوشش بے فائدہ ٹھہری تو؟ میرا واجد اگر اپنے آپ میں لوٹ بھی آیا تو کیا ہوگا آفتاب! وہ ایک ناکارہ وجود ہی رہے گا نا۔ میرے مرنے کے بعد اس بدنصیب کو کون سہارا دے گا۔ کون سنبھالے گا؟ میری موت واجد کے لیے عذاب کھینچ لائے گی۔“

”اوہ چچی، آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ زندگی اور موت پر اختیار صرف اللہ کا ہے۔ آپ کی عمر کتنی دراز ہے، آپ کو کیا معلوم۔ آپ موت کی بات کہہ کر مایوسی کا اظہار کیوں کرتی ہیں۔“

”میں مایوس نہیں ہوں آفتاب! لیکن تم مجھے اس طرح بہلا دامت دو۔ دل کے دوسرے شدید دورے کے بعد بھی میں زندہ ہوں تو یہ میری سخت جان ہے لیکن سچ کہوں تو اب درد کی ایک ذرا سی لہر مجھے بڑی آسانی سے موت کے منہ میں دھکیل دے گی۔ اب میری زندگی مختصر ہے آفتاب۔ موت ہر لمحہ میرے تعاقب میں ہے، لیکن میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مجھے خوف اپنے بیٹے واجد کے لیے ہے۔ میرے بعد وہ کیسے جی پائے گا۔ کاش اس کی پیدائش پر میں نے ڈاکٹر کی بات مان لی ہوتی۔ کاش واجد کو اسی وقت موت کا ٹیکہ لگا دیا جاتا تو کم سے کم آج وہ ایسے دکھ تو نہ سہتا، اس کی زندگی

اس کے لیے آزار تو نہ بنتی۔ وہ دنیا کے ہاتھوں میں کھلونا تو نہ بنتا۔“

”ایسا نہ کہیے چچی!“ آفتاب نے دکھے دل سے انہیں ٹوکا۔ واجد کی زندگی آپ کی مرہون منت ہے۔ وہ آپ کا بیٹا ضرور ہے لیکن اس کی زندگی کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ ہے۔ واجد کو کتنا زندہ رہنا ہے اور زندگی سے کتنا دکھ سکھ پانا ہے، یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ اللہ نے آپ پر صرف واجد کی پرورش کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ آپ کے بعد کوئی نہ کوئی وسیلہ متبادل کے طور سامنے آجائے گا۔ اللہ وہ سب کرتا ہے جسے ہم ناممکن سمجھتے ہیں۔ دراصل ہم بندے اللہ کی مصلحت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔“

”کرتے ہیں کوشش، کیوں نہیں کرتے بیٹا۔“ چچی نے اک گہرا سانس لے کر جیسے خود کو سنبھالا تھا۔ ”کبھی میں بھی بالکل تمہاری طرح سوچتی تھی آفتاب۔ میں بھی کہتی تھی اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی چیز بھی بے سبب پیدا نہیں کرتا۔ آنے والی روح کسی نہ کسی مقصد کے تحت دنیا میں وارد ہوتی ہے، لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں آفتاب کہ آدمی ہی آدمی کے دکھ سکھ کا سبب بنتا ہے۔ لیکن میرا واجد۔۔۔ وہ نارمل نہیں ہے۔ وہ ایک نامکمل اور مفلوج انسان ہے اور ایسا انسان کس کام کا۔ اللہ نے شاید واجد کو میری آزمائش کے لیے پیدا کیا تھا۔ میں تھک چکی ہوں آفتاب، پر میری آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب مجھ میں واجد جیسے بچے کو سنبھالنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ سوچتی ہوں میرے مرنے کے بعد اس کی زندگی کتنی عبرت ناک ہوگی۔ وہ اپنا تحفظ کیسے کر پائے گا۔ یہ سوچ مجھے اندر تک دہلا جاتی ہے۔ میں ایسا کیا کروں کہ اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ وہ سکھ سے جی سکے۔ لیکن بیٹا، یہ ممکن نہیں ہے۔ کاش میں واجد کو اپنے ہاتھ سے زہر دے سکتی، کاش میں مرنے سے

پہلے اپنے اس بچے کو مار سکتی۔“
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کی بے کسی اور لا چاری پر آفتاب کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ بھگی آنکھوں کے ساتھ چچی کو دلا سے دینے لگا لیکن اس بار اس کی ہر کوشش بے سود ٹھہری تھی۔ چچی اب کسی بہلاوے سے بہلنے والی نہ تھیں۔

دن ہوتا یا رات، چچی کے دل و دماغ سے یہ سوچ کسی آسیب کی طرح لپٹ گئی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد واجد کی زندگی عبرت سرائے دہر بن کر رہ جائے گی اور اس وقت کے آنے سے پہلے انہیں اپنے بیٹے کی زندگی کو تحفظ دینا ہوگا۔ ان کی موت کے بعد آفتاب تن تنہا واجد کو کہاں تک سنبھال سکتا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ انسان تھا۔ اس کی زندگی کے اپنے مسائل، اپنی مشکلات تھیں۔ اب کچھ ہی عرصے بعد اس کا گھر آنگن بھی ایک بچے کی قلعاریوں سے گونجنے والا تھا۔ اپنے بچے کی موجودگی میں وہ واجد کے لیے آخر کتنا وقت نکال سکتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی واجد کو پوری توجہ نہیں دے سکتا تھا۔

ان بدلتے حالات میں صرف آفتاب پر تکیہ کرنا مناسب نہ تھا۔ واجد کے مستقبل کو محفوظ بنانا از حد ضروری تھا۔ چچی کی گہری سوچیں سمندر میں پڑتے گرداب کی طرح چکرانی رہتیں، من کو بے کسی اور بے یقینی کے ہزار دسو سے ڈنک مارتے اور وہ مزید اذیت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اپنی موت سے پہلے واجد کے لیے کوئی محفوظ ٹھکانہ از حد ضروری تھا اور وہ ٹھکانا کہاں تھا، وہ نہیں جانتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ایک دن وہ انہی عذاب ناک سوچوں میں گہری بیٹھی تھیں کہ اچانک ایک اچھوتا خیال دماغ سے اٹھ کر دل میں جا گزیں ہوا تھا۔ اپنی ہی سوچ پر چچی کا وجود جیسے لرزے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیسا انوکھا

خیال سو جھاتا تھا انہیں۔ واجد سے نجات کا خیال۔ وہ گھبرا کر چار پائی پر پڑے اپنے اکلوتے مفلوج بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ جو ایک ہاتھ میں ربڑ کا بھالو اور دوسرے میں رنگین پوسٹر تھامے پڑا تھا۔ اس کی پھٹی آنکھوں میں حیرت کے رنگ تھے۔ وہ پوسٹر پر بنے سرخ دھتے گلاب کے پھول پر نظریں گاڑھے محویت کا شکار تھا۔ اس کی سخت گرفت میں پوسٹر کاغذ کے معمولی ٹکڑے کی طرح چر مرا سا گیا تھا لیکن پھر بھی واحد گلاب کے سرخ رنگ میں ایک ٹک جانے کیا گھور رہا تھا۔

چچی کی بھٹکتی نگاہ اس کے ٹیڑھے ہاتھوں پر منڈلانے لگی۔ لمبی لمبی انگلیوں والے ہاتھ بالوں کی زیادتی کے سبب کالے سیاہ دکھائی دے رہے تھے ناخنوں میں میل بھری تھی اور ہاتھ کی پشت پر جا بجا ٹپکی رال کے دھبے سفیدی کی صورت نمایاں ہو رہے تھے۔

چچی بغور واجد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا واجد اپنے خیالات کی رو میں بھٹک کر جب جھٹکے کھاتا تو ہاتھ میں پکڑی چیز بھی جھٹکے لینے لگتی تھی۔ وہی جھٹکے چچی کے دل کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کرنے لگے تھے کیونکہ وہی غیر محسوس سے جھٹکے ان کی بگڑی بنا سکتے تھے۔

وہ کچھ پل پر سوچ انداز لیے واجد کے ہاتھوں کو گھورتی رہیں پھر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اندر کمرے میں آ کر پلنگ کے نیچے سے پرانا لکڑی کا بسا کھینچا اور اسے احتیاط سے کھول کر آگے بیٹھ گئیں، کپکپاتے ہاتھوں سے دیگر کپڑوں کے نیچے سے اپنے مرحوم شوہر کی پولیس کی وردی نکال کر زانوں پر دھری۔ یونیفارم آج بھی بالکل نئے کلف زدہ کالر کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اس پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

جادو	ایم اے راحت	800/-
تیری یادوں کے گلاب	شازیہ اعجاز شازی	300/-
کالج کے پھول	غزالہ جلیل راؤ	500/-
دیا اور جگنو	غزالہ جلیل راؤ	500/-
انانیل	غزالہ جلیل راؤ	500/-
جیون جھیل میں چاند کرنیں	فصیحہ آصف خان	500/-
عشق کا کوئی انت نہیں	فصیحہ آصف خان	500/-
سلگتی دھوپ کے صحرا	عطیہ زاہرہ	500/-
یہ دیا بھنے نہ پائے	محمد سلیم اختر	300/-
وش کنیا	ایم اے راحت	400/-
درندہ	ایم اے راحت	300/-
قتلی	ایم اے راحت	200/-
بھرم	ایم اے راحت	200/-
چیون	خاقان ساجد	400/-
دھواں	فاروق انجم	300/-
دھڑکن	فاروق انجم	300/-
درخشاں	انوار صدیقی	700/-
آشیانہ	اعجاز احمد نواب	400/-
جزیرہ	اعجاز احمد نواب	500/-
ناگن	اعجاز احمد نواب	999/-

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لکھاری بہنیں اپنا ناول شائع

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

پھیرنے لگیں۔ کئی آنسو بیک وقت ان کی آنکھوں سے ڈھلک کر بوڑھے رخساروں پر لکیریں کھینچ گئے۔ دائیں جیب کے اوپر سب انسپکٹر محمد سراج نام کا کالے حروف سے لکھا بیج آج بھی آویزاں تھا۔ جانے کیا ہوا تھا کہ چچی یونیفارم پر چہرہ نکا کر بے اختیار رو پڑی تھیں۔

”اے اللہ! میں ہار گئی ہوں آج! میں ہاری اُس اذیت سے، جو آج مجھ سے سہی نہیں جا رہی۔ مجھے معاف کر دے میرے اللہ، میں اپنے بعد اپنے معذور بیٹے کو تیری بے رحم دنیا میں اکیلا چھوڑ جانے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے اپنی دی ہوئی آزمائش سے نجات عطا کر۔ میں ہاری میری مولا! میں نے جو سوچا ہے اسے کرنے کی ہمت عطا کر۔ یہ گناہ، یہ گناہ مجھے کرنا ہوگا ورنہ واجد جی کہاں پائے گا میرے بغیر۔“ ان کے اشک وردی بھگو نے لگے تھے۔ دبی دبی سسکیوں کے ساتھ چچی نے بکسے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس بار سراج صاحب کا سرکاری ریوالور نکالا تھا۔ وہ ریوالور ان کی وفات کے بعد اعزازی طور پر اس وردی کے ساتھ ان کی بیوہ کو عنایت کیا گیا تھا۔ اس ریوالور سے سراج صاحب نے کئی پولیس مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور آج..... آج اس ریوالور کو اس گھر کی کہانی کو انجام دینا تھا۔

چچی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بارہ سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ریوالور نیا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے سراج صاحب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق آہستہ آہستہ اسے لوڈ کیا تھا۔ پوری چھ گولیاں چیمبر میں بھر کر وہ کچھ دیر ریوالور کو گھورنی رہیں، یوں جیسے اپنی کھوئی ہمت کو جگا رہی ہوں۔ دل بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھیں۔ واجد کو مار کر کیا خود ان کے لیے مرنا آسان ہوگا؟ اور کیا وہ اپنے

اکھوتے بیٹے کی جان لے سکیں گی۔ کیا ایسا کر کے ان کے مسائل حل ہو جائیں گے.....؟

چچی کا رنگ زرد ہو رہا تھا جبکہ سانس کی آمد و رفت بھی بڑھ چکی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے دوپٹے سے ریوالتور صاف کرنے لگیں، اب بس ایک ٹرائیگر دبانے کی دیر تھی، گولی نال سے نکل کر شکار پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھی۔ انہوں نے پولیس کی وردی بکے میں رکھ کر اسے دوبارہ پلنگ کے نیچے دھکیل دیا تھا۔

پھر کئی خاموش لمحے تیزی سے سرک گئے، تب چچی خود کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اشکوں سے دھندلائی آنکھوں کو بڑی بے دردی سے پونچھا اور ریوالتور ہاتھ میں لیے واجد کے نزدیک چلی آئیں۔ وہ اب تلک اسی پوزیشن میں پڑا ہاتھ میں دبے پھول کی دکشی میں کھویا ہوا تھا۔ پوسٹر اس کی سخت گرفت کے باوجود ہاتھ کی لرزش سے ہل رہا تھا۔ چچی نے ریوالتور چارپائی پر رکھ دی اور واجد کو بانہوں کے حصار میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ اب ان کی آنکھیں چھماچھم برس رہی تھیں۔ اپنی موت سے پہلے انہیں واجد کی موت کا دکھ دیکھنا تھا، وہ جو وقت پیدائش ڈاکٹر سے موت کا انجکشن واجد کو لگوانے کے حق میں نہ تھیں آج خود اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ واجد جیسے ایب نارمل موزور بچے کا مزید زندہ رہنا خود اس کے لیے اذیت و مصیبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس معصوم کی اذیت کو اب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک بے مصرف انسان تھا۔ ایسا انسان جو عبرت برائے دہر کی عملی تصویر بن کر دنیا میں آیا تھا۔ اس کے ذمے اللہ کے کسی فرض کی ادائیگی لازم نہیں تھی۔ ایسے انسان کا دنیا سے کوچ کر جانا، اس کی ماں کی آنے والی موت کو بے سکون کر سکتا تھا۔ کیونکہ بیٹے کی موت کے بعد ماں کو مرنے کے لیے دل کے آخری دورے کی چنداں ضرورت نہ تھی، وہ پہلے ہی

مر جاتی۔

ماں کی بے پناہ محبت اور اس درجہ امتیازی سلوک پر واجد کھلکھلانے لگا تھا۔ آج نہ جانے کتنے دن کی دم سادھی خاموشی کے بعد اس کے موٹے موٹے لبوں پر ہنسی کا رنگ جھلملایا تھا۔ دل سے اٹھتے ماں کے پیار کو محسوس کرتے ہی اس کے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی گلاب کی تصویر کی صورت کھلا کھلا دکھائی دینے لگا تھا۔

چچی نے واجد کا رال بھرا چہرہ اپنے گداز ہاتھوں میں تھام کر اک وارنگی سے اس کا ماتھا چوما۔ پھر اس کے لمبی انگلیوں والے ہاتھ سے بھالو اور گلاب والی تصویر کا پوسٹر آہستگی سے کھینچ لیا۔ واجد نے ماں کی محبت پا کر کسی اعتراض کے بغیر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔

چچی نے دونوں چیزیں پرے پھینک دیں پھر چارپائی پر پڑے پستول کو اٹھا کر واجد کے ہاتھوں میں زبردستی پکڑا دیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے ریوالتور کی نال کا رخ انہوں نے دانستہ واجد کی طرف رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی شہادت کی انگلی ٹرائیگر پر رکھنے کے بعد جیسے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ ایک دکھی ماں کے کمزور دل کی صدا تھی جسے واجد کسی دشواری کے بغیر از خود سمجھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ماں کی کوشش کو رائیگاں نہ جانے دیا اور ریوالتور کو اپنے لمبی انگلیوں والے استخوانی ہاتھ میں لے کر غائب الدماغی سے دیکھنے لگا۔ اب اس کی پھٹی وحشت زدہ آنکھیں پستول کی ساخت اور رنگت کا بغور معائنہ کر رہی تھیں۔ چچی کچھ دیر بیٹے کو گھورتی رہیں پھر اک گہری سانس لے کر انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ ان کا مجروح دل پارا پارا تھا لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھیں۔ انہوں نے اپنے معذور بیٹے کو اس بے درد دنیا کے ہاتھوں

اذیت کا نشانہ بننے سے بچانے کی خاطر ہی ایسا فعل انجام دیا تھا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتیں تو ان کے بعد واجد کسی جانور سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور رہتا اور عمر بھر غلاظت میں لتھڑ کر اسی گندگی میں جان دے دیتا۔

چچی اپنا کام پورا کر چکی تھیں۔ ریوالور اب واجد کے ہاتھوں میں تھا۔ اب باقی کا سارا کام اس کے آڑھے ٹیڑھے ہاتھوں کی سخت گرفت اور ان غیر محسوس جھٹکوں کا تھا جس کے طفیل کسی بھی لمحے ٹرائیگر دب سکتا تھا۔ ریوالور کی نال اپنے نشانے یعنی واجد کی طرف تھی، گولی چلتی تو براہ راست واجد کو لگتی اور وہ چند سیکنڈز میں اذیت کے حصار سے نکل جاتا، جس سے بچانے کے لیے کبھی ڈاکٹرز نے موت کے ٹیکے کی صلاح دی تھی.....

آج بھی ایسی ہی موت واجد کا مقدر تھا لیکن اب وہ ایک ماں کی مجبوری تھی، اپنی زندگی ہارنے سے پہلے وہ اپنے اپناج اکلوتے بیٹے کو زندگی کے آزار سے بچانا چاہتی تھی۔ چچی نے کچھ قدم چلنے کے بعد پلٹ کر اس کا جائزہ لیا، وہ اب بھی ریوالور ہاتھ میں لیے ایک تک اسے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت جیسے زور پکڑ رہی تھی۔ وہ ریوالور جو پہلے اس کے ہاتھوں میں لڑکھڑا رہا تھا، اب واجد کے کنٹرول میں تھا۔ گزرتے وقت نے واجد کے ہاتھوں کی طاقت دھیرے دھیرے بحال کر دی تھی۔ چچی نے رخ موڑ لیا تھا، ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اپنے لخت جگر کو موت کے منہ میں چھوڑ کر وہ دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں تاکہ گولی چلنے کا انتظار کرتیں جو کسی بھی پل ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ جانے پر فائر ہونے والی تھی اور واجد کو ہمیشہ کی نیند سلانے والی تھی۔

چچی نے دروازے تک کا فاصلہ بڑی مشکلوں

سے طے لیا تھا۔ ان کا دل پھٹ پڑنے لگا تھا۔ کمرے کے دروازے پر ٹھہر کر انہوں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا۔ واجد کی نگاہ اس بار ان ہی کی جانب لگی تھی، ہاتھ میں پکڑے ریوالور کے ساتھ وہ ماں کو اندر کمرے میں جاتا دیکھ رہا تھا۔ چچی کا دل لرز نے لگا کیونکہ واجد کی پھٹی آنکھوں میں وحشت کا شاہہ تک نہ تھا بلکہ محبت کی جوت جگمگا رہی تھی، وہی جوت جو ماں کو دیکھ کر ہر بچے کے چہرے پر جھلملاتی ہے۔

چچی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے بچے کو دوڑ کر اپنے کلبے میں چھپائے لیکن اچانک اچانک ہی ان کے سینے میں وہی شدید درد اٹھا جس کی اذیت وہ اس سے پہلے بھی دو بار سہہ چکی تھیں۔ لیکن غربت نے انہیں ڈھنگ سے علاج کروانے کی اجازت ہی نہ دی تھی اور شاید اس سے پہلے، ان کی سانسیں اپنے بچے میں انکی رہتی تھیں تب ہی موت بھی، ان کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی۔ لیکن آج اسے بے رحم زمانے پر چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں موت ان کے بے حد قریب آ چکی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا لیکن جیسے ان کی جان اسی وقت اپنے بیٹے میں انکی ہوئی تھی۔ تب ہی زور کا دھماکہ ہوا اور اسی لمحے ان کا دم نکل گیا۔ ماں تھیں نہ اپنے بیٹے کو موت کی بانہوں میں جاتے ہوئے دیکھنے سے پہلے خود ہی ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ موت نے اتنی پیار کرنے والی ممتا کا بھرم رکھ لیا تھا۔ واجد اپنی ماں کے ساتھ اس بے رحم آور بے مہربان دنیا سے بہت دور آور نہ ہی، دکھ اور پریشانیاں انہیں قطرہ قطرہ کر کے ختم کر رہے تھے۔

لوگ مرتے ہیں زندگی کے لیے
موت ہے زندگی کسی کے لیے

☆☆.....☆☆

بشر ہونٹوں کی دعا

”اسرارہ اب شادی کے قابل ہو گئی ہے داؤد صاحب! آپ کچھ توجہ گھر کی طرف بھی دیں۔ میں نے ہی گھر کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔“ بڑی بھابی کی آواز پر چائے اندر لاتی شاہ نور ٹھنک گئی۔ داؤد صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ایک نظر بیگم کو دیکھا اور.....

کبھی کبھی زندگی یوں بھی مہربان ہو جاتی ہے کہ.....

ذات سے ناخوش۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ وہ تو بہت بولنے والی ذہین و فطین لڑکی تھی، مگر جب تک اُس کے بابا جانی حیات رہے تب تک۔ اُس کی ماما بچپن میں ہی اُسے اور تین بھائیوں کو چھوڑ کے اس دار فانی سے کوچ کر چکی تھیں۔ بس پھر بابا ہی تھے جنہوں نے انہیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

اُسے یاد تھا کہ وہ اُس کے لیے ہر مصیبت میں ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ اُسے کبھی زمانے کی گرم ہوا نے چھواتک نہ تھا۔ وہ اُس کے لیے سائبان تھے۔

اُن کے رخصت ہوتے ہی حالات نے اُسے زندگی کے تیتے صحرا میں نہایت بے دردی سے لا پٹھا تھا۔ بابا جانی کی ناگہانی موت نے اُسے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ اُسے تنہا چھوڑ کے جا چکے تھے۔

اُس پر ستم ظریفی یہ کہ اپنے خونی رشتوں کا وہ روپ دیکھنے کو ملا کہ جس نے شاہ نور کے ہوش اڑا دیے۔

بابا جانی کے سوئم کے دوسرے روز ہی شاہ نور کے تینوں بھائی بحث و مباحثے میں مشغول تھے اور

”دل کی مثال بھی اُس چنری جیسی ہوتی ہے جو کسی بھی رنگ میں رنگ سکتی ہے۔ کبھی محبت کے سرخ رنگ لیے خوشنما تو کبھی نفرت کے رنگ میں ڈوبی زرد اور کبھی نا اُمیدی اور بد نصیبی کی سیاہ چادر تانے ہوئے۔ تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟“

اُس نے بات کرتے ہوئے اچانک ہی سوال کر ڈالا اور شاہ نور جو اُس کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی چونک پڑی اُس نے سرد آہ بھرتے اُس کی گہری کالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچا کہ وہ تو بس دل کے زرد و سیاہ رنگ سے ہی واقف ہے۔ اسی اثنا میں گھنٹی بجی اور وہ دونوں اپنی کلاس لینے چل پڑے۔ چلتے چلتے عائش نے کہا۔ ”تمہارا جواب ادھار رہا۔“ اور شاہ نور یہ سن کر مسکرا دی۔

وہ ایسا ہی تھا شوخ، بے فکر سا، اپنی ذات میں ممکن۔ ہر کسی کی دلجوئی کرتا ہوا۔ وہ سب کا پیارا تھا۔ شاہ نور اُسے دیکھتی تو سوچتی وہ بنا ہی محبت کے لیے ہے۔ اک وہ تھی..... زندگی سے بے زار، اکتائی ہوئی، اپنی

بھابھیاں بھی اس میں پیش پیش تھیں اور زیر بحث شاہ نور کی اپنی ذات تھی۔
بڑے بھیا نے کھٹکھار کے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں میری بات سمجھ سکتے ہو۔ میں فوری طور پر اسلام آباد میں شاہ نور کو نہیں رکھ سکتا کیونکہ گھر ابھی بنا ہے اور اتنی جلدی ’سیننگ‘ نہیں ہو پائے گی اور ابھی شاہ نور کی پڑھائی کا ایک سال باقی رہ گیا ہے اور کالج کراچی میں ہے۔“ سعود بھائی نے بیوی کی طرف دیکھا جو ابرواچکا کرا نہیں خبردار کر رہی تھیں اور بولے۔
”بھائی صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ میرا تین کمروں کا فلیٹ ہے اور تین بچوں کا ساتھ! میں کہاں سے اپنے گھر میں گنجائش

نکال پاؤں گا اور پھر ناد یہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ کس طرح سے سب کا خیال رکھے گی۔“
”اے میاں! تم تو لے جاسکتے ہو، نئی نئی شادی ہوئی ہے اور تم دو ہی تو ہو۔“ سعود بھائی اس اچانک حملے سے گھبرا گئے پھر کچھ سنہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

”نہ..... نہ میرا مطلب ہے کہ میں کیسے لے جاسکتا ہوں؟ میں نے کچھ دن پہلے ہی اپنی لائف اسٹارٹ کی ہے۔ نیا بزنس ہے اور ویسے بھی میں اپنے سالے کے گھر میں رہتا ہوں اور میری بیوی ذرا الگ مزاج کی ہے۔ وہ شاہ نور سے کھل مل نہیں پائے گی اور شاہ نور میرے گھر میں خوش نہیں رہ سکتی۔“ انہوں نے اپنی بات روانی سے کہی اور ایسا انداز اپنایا جیسے اب کچھ بولنے اور سننے کی ضرورت باقی نہ ہو۔



کمرے کی نضا اپنوں کی آوازوں سے گونج رہی تھی اور دروازے کے باہر شاہ نور ساکت کھڑی یہ سب سن رہی تھی۔ اُسے اپنے وجود میں سناٹے اترتے محسوس ہوئے۔ اُس کا خون منجمد ہونے کو تھا۔ رشتوں کے بھرم کا شیش محل دھڑام سے نیچے آن گرا اور اُس کی گونج میں ساری آوازیں دب گئیں، ساتھ میں وہ بھی! ایک طویل بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک شاہ نور کی پڑھائی کا ایک سال پورا نہیں ہو جاتا وہ سعود بھائی کے ساتھ رہے گی اور ایک سال کے بعد اسلام آباد بڑے بھائی داؤد کے پاس چلی جائے گی۔ اسے یہ خبر بڑے بھائی نے دی۔ کچھ دیر تک شاہ نور یوں ہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ بالکل اس طرح کہ جیسے وہ بے جان وجود ہو جس میں زندگی کی کوئی رمت باقی نہ ہو۔

☆.....☆.....☆

دوران سفر نادیا بھابی نے ایک بار بھی اُسے مخاطب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ ٹیکسی کے رکتے ہی اتر کر اپنا بھاری بھرکم سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے، فلیٹ کے داخلی دروازے کی جانب، بھاگنے کے سے انداز میں جانے لگیں۔ سعود بھائی نے بھی اُن کی تقلید کرنا ضروری سمجھا اور کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ شاہ نور اپنا سامان اٹھائے کس بے بسی سے اُن کی پشت دیکھ رہی تھی۔

شاہ نور نے فلیٹ میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے وہ کسی کباڑ خانے میں کھڑی ہو۔ کمرہ خاصا ابتر حالت میں نظر آ رہا تھا نہ جانے کب سے اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی جابجا چیزیں بکھری ہوئیں تھیں وہ تو سدا کی صفائی پسند تھی۔ مگر اب وہ سعود بھائی اور بھابی کے رحم و کرم پر تھی۔

سعود بھائی نے اُس کی اُلجھن بھانپ لی اور کھیاتے ہوئے بولے۔

”دراصل تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے گھر کا یہ حال ہوا ہے۔ ورنہ وہ سارا کام خود کرتی ہے۔ چلو اب تم آگئی ہو تو اس بیچاری کی بھی کچھ مدد ہو جایا کرے گی اور کچھ آرام ملے گا۔“ شاہ نور نے اثبات میں سر ہلایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی تاکہ سامان رکھ سکے، مگر اسے کمرے میں کوئی جگہ نظر نہ آئی تو اُس نے سوٹ کیس الماری کے ساتھ لگا کر رکھ دیا۔

”پہلے تم ذرا چائے بنا دو، پھر اس کمرے کی حالت درست کر لینا۔ تمہاری بھابی تو سفر کر کے نڈھال ہو جایا کرتی ہے۔“ بھائی کی بات سن کر اُس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور کچن کی جانب چل دی جس طرف بھائی نے اشارہ کیا تھا۔

کچن میں آتے ہی وہ چکرا گئی۔ اُف میرا خدا! وہاں کا منظر بھی کمرے سے مختلف نہ تھا۔ اُس نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے کچن صاف کیا اور چائے بنانے لگی۔ اس پل اسے بابا جانی بے طرح یاد آئے اور وہ سسک پڑی۔

☆.....☆.....☆

پھر یہ روز کا معمول بن گیا کہ وہ سارا کام کرتی کیونکہ نادیا بھابی ہمیشہ بیمار رہتیں۔ کبھی سر درد، کبھی کمر درد، اب تینوں بچپوں کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ وہ صبح فجر کے وقت اُٹھتی، نماز پڑھتی اور سب کا ناشتا بنا کر بچوں کی تیاری کروا کر، خود بھی کالج جاتی۔ دوپہر میں آ کر کھانا بناتی۔ غرضیکہ سب کچھ اُس کو ہی کرنا تھا۔

وہ اکثر سوچتی کہ شاید قدرت نے اُس کو ان ہی کاموں کے لیے پختا ہے۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور ایک سال ہونے کو آ گیا تھا۔ اس دوران بڑے بھائی نے اُسے تقریباً بھلا ہی دیا۔ پھر بھی اپنے وعدے کے مطابق وہ اُسے لینے آ گئے تھے، اور وہ اک بار پھر وقت کے دھارے میں بہنے کو تیار تھی۔

بڑے بھائی کا گھر، سعود بھائی کے گھر کے مقابلے میں قدرے بڑا اور اچھا تھا۔ اُس کے آنے سے بڑی بھابی کی ناخوشی اُن کے ہر ہر انداز سے عیاں تھی۔ خوش تھا کوئی، تو بس اُس کی سچی اسما رہ جو عمر میں اُس سے 2 سال چھوٹی تھی۔ وہ قدرے لا اُبابی طبیعت کی مالک تھی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی تھی۔ شاہ نور کو اُس کا وجود غنیمت لگا تھا کیونکہ بھائی تو بس لیے دیے رہنے والے بندے تھے اور بھابی کو اُس کا وجود نظر ہی نہ آتا تھا۔ مگر اسما رہ اُس کو بات کرنے اور اپنے خول سے باہر آنے کے لیے مجبور کرتی اور اُسے آگے پڑھائی جاری رکھنے کا کہتی۔

ایک شام وہ چائے کے لوازمات ٹرے میں سجائے، ٹی وی لاؤنج کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک کسی سے ٹکرائی اور ٹرے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گئی۔ اُس نے اُس شخص کو دیکھا جو رکنے کے بجائے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر جا کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے اسما رہ سے پوچھا اور گہری نظروں سے شاہ نور کو دیکھا جو کانچ کے بکھرے ہوئے ٹکٹے اٹھا رہی تھی۔

”یہ محترمہ کون ہیں؟ کیا کوئی مہمان ہیں؟“ وہ اب تک کانچ کے ٹکڑے جمع کرنے میں لگی تھی۔

”یہ مہمان نہیں۔ میرے پاپا کی بہن ہیں یعنی میری پھوپھو۔“

”کیا.....؟“ وہ ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ نجل سی ہو گئی اور جلدی سے کچن کی طرف جانے لگی۔

”یہ تمہاری پھوپھو ہیں۔“ اس کی حیرانی دور نہیں ہو رہی تھی۔ ”مگر یہ تو تمہاری چھوٹی بہن لگتی ہے۔“

”ہاں ہم میں زیادہ فرق نہیں ہے۔“

”فرق تو ہے تم مغربی طور طریقوں والی ماڈرن گرل اور وہ اک مشرقی انداز لیے سادہ سی لڑکی۔“

”اچھا چند لمحوں میں اتنی گہری نظروں سے جانچ بھی لیا۔“

بعد میں اُسے اسما رہ کی زبانی پتا چلا کہ اُس کا نام عائش تھا اور وہ بھابی کا بھتیجا تھا، یعنی اسما رہ کا کزن۔ وہ ہر روز یہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اور اسما رہ بچپن کے دوست تھے اور ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

عائش بڑی بھابی کا بہت لاڈلاتھا۔ بھابی اُس پہ صدقے واری ہوتیں۔ اسما رہ اُسے اُس کی باتیں بتاتی اور وہ سوچتی کہ اسما رہ کتنی خوش قسمت ہے۔ سب کچھ ہے اُس کے پاس، ماں باپ، عالیشان گھر اور اتنا پیارا دوست جو ہر قدم پر اُس کے ساتھ تھا۔ مگر کوئی تہی دامن تھا تو بس وہ تھی۔

☆.....☆.....☆

شاہ نور ہر گزرتے دن کے ساتھ خود میں واضح تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ سر شام جانے کیوں انتظار کی سوئی اُس کے دل میں ٹک ٹک کرتی اور عائش کے آتے ہی اُسے درود یوار میں زندگی کی رمت نظر آتی۔ جس دن وہ نہ آتا وہ جلے پیر کی بلی بنی پورے گھر میں پھرتی۔ اب وہ خود کو آئینے میں دیکھا کرتی، اچھی خاصی پیاری لگتی اسے اپنی صورت وہ حیکے حیکے اور سنور نے لگی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے خود کو دیکھنے کی وجہ ملی تھی۔ وہ مسکرانا چاہتی تھی، بولنا چاہتی تھی اور اپنی اس تبدیلی سے بہت خوش تھی مگر وجہ جاننے کا صبر تھی۔

☆.....☆.....☆

شاہ نور بھی اپنی تعلیم پوری کرنا چاہتی تھی مگر بھابی سے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ اسما رہ نے بھرپور ساتھ دیا اور عائش کی کاوشوں سے وہ ان دونوں کے ساتھ یونیورسٹی جانے لگی۔ وہاں وہ پڑھتے بھی اور باتیں بھی کرتے عائش کو یہ سادہ سی لڑکی بہت بھابی اور اُس کے ساتھ وقت گزارنا اُسے اچھا لگتا۔

☆.....☆.....☆

”اسما رہ اب شادی کے قابل ہو گئی ہے داؤد صاحب! آپ کچھ توجہ گھر کی طرف بھی دیں۔ میں

نے ہی گھر کی باگ ڈور سنبھال رہی ہے۔“ بڑی بھابی کی آواز پر چائے اندر لائی شاہ نور ٹھٹک گئی۔
داؤد صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ایک نظر بیگم کو دیکھا اور پھر سے کتاب میں کھو گئے۔
”آپ سن رہے ہیں نا داؤد صاحب!“ بڑی بھابی نے پھر اُن کو ٹوکا۔

”ہوں! سن رہا ہوں کہیے، کیا بات ہے؟“
”میں اسماہ کی شادی عائش سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے وہ اسماہ کے لیے ہمیشہ سے ہی پسند ہے اور میں چاہتی ہوں اب جبکہ وہ برسرِ روزگار ہے تو شادی کے بندھن میں بندھ جائے۔“

”ٹھٹک ہے بیگم! جیسے آپ کی خواہش، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ بیگم داؤد شوہر کی جانب سے گرین سگنل ملنے ہی شادی کی تیاریوں کے بارے میں سوچنے لگی تھیں، جبکہ برآمدے میں کھڑی شاہ نور کی زندگی، اُس کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی کی طرح سرد ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

شاہ نور اک بار پھر اپنے خول میں بند ہو چکی تھی۔ اسماہ اور عائش اُس کے رویے پر حیران تھے۔ وہ اب کم ہی بات کرتی۔ عائش کے آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتی۔ عائش نے بہت بار کوشش کی کہ وہ بات کرے مگر اُس کی چپ کا قفل نہ ٹوٹا۔

”نہ جانے کیا مسئلہ ہے تمہاری پھوپھو کو؟ مجھ سے وہ بات کیوں نہیں کرتی؟ کیوں اس طرح خاموش ہے؟“
”عائش! وہ ایسی نہیں ہیں مگر ان کے رویے سے میں بھی حیران ہوں کہ آخر ہوا کیا کہ وہ دوبارہ اتنی بے زار اور خاموش ہو گئی ہیں۔ آنکھیں بھی سو جی سو جی رہتی ہیں جیسے روتی رہی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

بڑی بھابی نے اپنے طور تیاریاں شروع کر دی تھیں وہ بہت خوش تھیں اور ستم تو یہ تھا کہ وہ شاہ نور کو

بھی ان کاموں میں ساتھ رکھتیں۔
ایک روز بڑی بھابی اپنی الماری سے جہیز میں رکھے جانے والے کپڑے شاہ نور کو دے رہی تھیں کہ اسماہ اُن سے کچھ پوچھنے آئی اور سامان دیکھ کر ٹھٹک گئی، پوچھنے لگی۔
”یہ سب کیا ہے؟“ شاہ نور اٹھ کر کپڑے پر لیس کرنے چل دی۔

”یہ جہیز کا سامان ہے۔“ بڑی بھابی نے سرسری بتایا۔
”اوہ! اچھا کیا ہم شاہ نور کی شادی کر رہے ہیں؟ داؤد کتنا مزہ آئے گا۔“ بڑی بھابی نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

”یہ تمہاری شادی کا سامان ہے۔“
”اصولاً تو پہلے شاہ نور کی شادی ہونی چاہیے اور ویسے بھی میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں۔“
”بہیں کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں، یہ فیصلہ تم نہیں کریں گے۔ تمہیں بس وہ کرنا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔“
”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کس سے کر لوں شادی؟“

”ارے لڑکا تمہاری پسند کا بھی ہے اور اچھا بھی۔“
”کون ہے وہ؟“
”عائش۔“

”عائش نہیں ماما! وہ صرف میرا دوست ہے۔“
”ہاں تو کیا ہوا! تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو اور ایک ساتھ خوش رہتے ہو اور کیا چاہیے؟“
”ماما! میں عائش کو اپنے بھائی جیسا سمجھتی ہوں اور وہ بھی مجھے بہن کی طرح۔ جانے آپ لوگوں کو ایسا کیوں لگا کہ ہم دونوں ایسی کوئی خواہش رکھتے ہیں۔“
بڑی بھابی کو شاک لگا تھا اور جاتے ہوئے اسماہ نے رُک کر کہا۔

”ماما! عائش شاہ نور کو پسند کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رُک نہیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

کمر میں تیار پیاں زور و شور سے جاری تھیں۔
اسمارہ بھی خوش نظر آتی۔ گھر بھی خوب سجایا گیا تھا۔
اداسی تھی تو بس اُس کے اندر تھی۔ وہ بے جان سی
پورے گھر میں چکراتی پھرتی اور خدا سے دعا مانگتی کہ
خدا اُسے کسی اور امتحان میں نہ ڈالے۔

دلہن کی چیزیں اُس کے سامنے پڑی تھیں اور
اُس کے آنسو اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں خود سے اُلجھ رہی تھی کہ بڑی
بھابی اور اسمارہ اندر داخل ہوئیں اور پہلی بار بھابی
نے اُسے پیار سے دیکھا تھا اور قریب آ کر بیٹھ
گئیں۔ وہ کچھ کچھ حیران تھی کہ ایسا کیونکر ہوا؟ بھابی
نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ نور بیٹا! تم میری بیٹی جیسی ہو اور آج سے میں
تمہاری ماں ہوں۔“ شاہ نور اچانک اس بات پر چونک
پڑی۔ عرصہ ہوا تھا اُسے پیار بھرے کس کا مزہ چکھے ہوئے۔
”بیٹا! ہم کل تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔“
بڑی بھابی نے گویا اُس پر بم گرا دیا تھا۔

”میرا نکاح؟ کل تو اسمارہ کی شادی ہے۔“
”اسمارہ ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہے اور ہم
اب تمہارا فرض پورا کرنا چاہتے ہیں۔“

شاہ نور کو تو وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے کی عادت
ہو گئی تھی۔ اُس کی اپنی کیا مرضی؟ اُسے تو بس فیصلہ سنایا
جاتا تھا۔ اُس نے بے بسی سے سوچا اور گردن جھکا دی۔
تب اسمارہ نے پیار سے اس کے گلے میں بازو
حائل کر دیے۔

”شاہ نور آپ پوچھیں گی نہیں کہ اُٹ کی شادی
کس سے ہو رہی ہے۔“

”نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بے
اختیار بھر آئیں اپنوں نے اتنے دکھ دے تھے کہ خوشی
بھی دل کے کسی کونے میں بس رویا ہی کرتی تھی۔

”میں جانتی ہوں شاہ نور آپ اپنی ہر تمنا ہر

خواہش کا گلا گھونٹ کر بس دوسروں کے لیے جی رہی
ہیں اور یہ ہی آپ کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ میرے
خیال میں دوسروں کی زندگی جینا بہت بڑی بے وقوفی
ہے۔ اسمارہ کی بات پر بھابی کچھ کھیا کر کمرے سے باہر
چلی گئی اسمارہ نے شرارت سے اس کی خوبصورت آنسو
بھری آنکھوں کو دیکھا۔ آپ جس حقیقت کو اپنے آپ
سے بھی چھپاتی رہیں میں اس کو جانتی ہوں۔“
”کیا جان گئی ہو تم۔“ شاہ نور نے بہت گھبرا
کر پوچھا۔

”یہ ہی کہ عائش کے بنا آپ کی زندگی ادھوری
ہوگی۔“ اسمارہ کی بات پر اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔
”نہیں نہیں اسمارہ پلیز تم غلط۔“ لیکن

اسمارہ نے درمیان سے ہی اس کی بات کاٹ دی۔
”بس کر دیں شاہ نور۔ کب تک یوں ڈر ڈر کر
اپنے دل کو مار کر زندگی گزاریں گی۔ سچی بات یہ
ہے کہ اُٹ کی خاموش محبت یک طرفہ نہیں۔ عائش
بھی آپ کی محبت اب اپنے دل میں چھائے
چھپائے تھک چکے ہیں سو ان کی خواہش پر آپ،
دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے، ان کی بن جائیں گی۔

شاہ نور کی سانسیں جیسے ایک لمحے کو کھم سی گئیں۔
اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی
ہے وہ بس سکتے کہ عالم میں اسمارہ کو دیکھے گی۔ اسمارہ
نے اسے بے اختیار اپنے گلے لگا لیا۔ اللہ بہت رحیم
ہے شاہ نور۔ اور وہ بند ہونٹوں کی دعا بھی بنا کہے جان
لیتا ہے بس جذبے میں سچائی ہونا ضروری ہے۔

اچھا چلیے اب مسکرا دیجئے اور دل سے میاں جی
کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر تھوڑا سا کریڈٹ
مجھے بھی دی دیجئے۔“

اسمارہ کی بات پر شاہ نور نے بھیگی پلکوں کے ساتھ
بے اختیار مسکرانے ہوئے شاہ نور کو گلے لگا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

المحوال نے خطا کی تھی

”اتنی فکر مند مت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔“ اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو بھنبھوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔“ تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا۔“.....

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

پر رکھ دیے۔

”مما.....“ وہ سیدھا ہوا۔

”جی جان۔“

”بابا کب آئیں گے۔“ وہ زسری کا بچہ تھا مگر

اُردو بہت صاف بولتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ

اُس کی ممانے اُس سے اُس وقت باتیں کرنا شروع

کر دی تھیں جب وہ محض ایک دو ماہ کا تھا۔

”بابا کب آئیں گے۔“ اب کی بار اُس کی معصوم

آواز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی تھی۔ ماں کی توجہ نہ

پا کر اُس کا غصے میں آنا ایک فطری عمل تھا۔ وہ ماں کی

بھرپور توجہ کا عادی تھا۔

”آجائیں گے بیٹا۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”بابا آئیں تو میں اُن سے بات نہیں کروں گا۔“

وہ بسوراماں خار ہونے لگی۔

”کیوں؟“

”بس خفا ہوں میں۔“ اُس نے دونوں ہاتھوں کی

منھیاں بھیج کر آنکھوں پر رکھ لیں۔

ٹھنڈی، دودھیا چاندنی چاروں اور پھیلی ہوئی

تھی۔ چاند کی پُر سکون اور رومان بھری روشنی نے ہر چیز

کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ رات کی رانی کی مسکور

کن مہک اطراف میں بکھری ہوئی تھی۔ خاموش رات

اپنے اندر بھید بھرا اسرار چھپائے ہوئے تھی۔ ماحول کی

پاکیزگی نے ایک سحر سا طاری کر رکھا تھا۔

وہ لوہے کے ادنیٰ سے تخت پر جکے پر سر رکھے

لیٹی تھی۔ اُس کے پہلو میں اُس کا کیوٹ سا بیٹا لیٹا ہوا

تھا جو بمشکل تین، ساڑھے تین سال کا تھا۔

”مما.....“ اسد نے کروٹ بدلی تو اک نرم و

گداز، گدگداتا ہوا سا احساس اُس کے رگ و پے میں

ممتا کی حلاوت بھرنے لگا۔ اُس نے داری سے اپنے

پہلو میں کسماتے معصوم اور نازک وجود کو اپنے سینے

سے لگا کر بھیج ڈالا۔ اندر دور تک سکون اُتر گیا۔ وہ بوہنی

اُسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے دیپاتی رہی، تھکتی

رہی، محویت سے اُس کے گھنے سیاہ بال دیکھتی رہی، پھر

دفور جذبات میں اُس نے اپنے ہونٹ بچے کے بالوں



”اچھا میری بات سنو۔“ اُس نے بچے کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اُس کے ہاتھوں کو آنکھوں پر سے ہٹایا اور اُسے کہانی سنانے لگی۔ بچہ بہل ہی گیا۔ بچے تو بہل ہی جایا کرتے ہیں۔ کبھی کھلونوں سے، کبھی شہزادے کی کہانی سے، مگر کب تک۔

”مما چاند کتنا خوبصورت ہے نا۔“ اُس کا معصوم ذہن اب آسمانوں کی وسعتوں میں سفر کرتے چاند میں اٹک گیا۔ وہ چاند کو دیکھ کر مسکرا نے لگا۔ اُس کے گلابی پھولوں جیسے ہونٹ پھیلنے سکنے لگے۔ آنکھوں میں بے تحاشا روشنی سی بھر گئی اور گال تہمتا نے لگے۔

”تم بھی تو چاند ہونا، میرے چاند۔“ اُس نے متا کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا۔

”وہ چاند زیادہ اچھا ہے ممّا۔“ بچے نے اُفق کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”نہیں، میرا چاند اُس چاند سے زیادہ پیارا ہے۔“ وہ قطعیت بھرے انداز میں لاڈ سے بولی۔

”نہیں ممّا، آسمان والا چاند بہت اچھا ہے۔“ اُس نے بازو پھیلا کر بہت پر زور دے کر کہا وہ چپ رہی۔

”چاند میں ماموں نظر آتا ہے ممّا۔“ اس کا بچے کے بالوں میں سرسراتا ہاتھ یک لخت رُک گیا۔ ٹھنڈی چاندنی رات اُسے کھوں میں سلگا گئی۔ اُس کے ہونٹ پل میں خشک ہوئے۔

”چند ماموں، چند ماموں۔“ وہ خوشی سے تالیاں پیٹتا رہا اور وہ لرزیدہ وجود کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن منتشر ہو کر بے قابو ہو کر بدن میں اُدھم مچا رہی تھی۔ بچہ سوچکا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی اُس کی سانس رُک رہی تھی۔ پیاس کا احساس شدت سے جاگا تھا، یوں لگ رہا تھا حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ اُس نے ایک نظر پر سکون سوتے بچے کو دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔

”ماموں۔“ اُس نے زیر لب دہرایا اور اُس کے

نذر باہر درد پھیلنے لگا۔ اُس نے لبوں سے نکلتی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ کی ہتھیلی جمادی مگر اُسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ وہ تخت سے اُٹھی اور پاؤں میں چپل اُڑس کر بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی۔ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور لبوں سے لگالی۔ وہ غٹا گٹ بہت سارا پانی پی کر بھی اپنا حلق تر نہیں کر پائی تھی۔ تن من لق دق صحرا بن گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکلی، پاؤں بالکل بے جان ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں دیرانی بھری وحشت اُتر آئی تھی۔

”ماموں۔“ وہ خشک ہوتے ہونٹوں سے بڑبڑائی۔ اُسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے روشن رات تاریکی کے لبادے میں لپٹی دکھائی دینے لگی۔ وہ اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، خوف اور ڈر کی سرد لہر شریانوں میں بھاگتے دوڑتے گرم جذبات سے لبریز لہو کو جمانے لگی۔

قریب ہی شہتوت کے درخت میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ شاید کوئی پتا گرا تھا، وہ سہم گئی۔ سناٹا اُس کی روح میں اُتر گیا تھا۔ کیسی خاموشی تھی، سرد اور مردہ، تلخ کڑوی، کڑواہٹ زدہ، اُس نے اپنے ٹوٹے بکھرے لرزیدہ وجود کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں چھپالیا اور آہوں اور سسکیوں کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت دے دی۔ اُن پر اب کوئی بند نہیں باندھا۔

”ماموں“ لفظ اُس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دکتے الاؤ میں جلتا دیکھ رہی تھی۔ درد نے اُسے گھائل ہی نہیں، پڑمردہ اور نڈھال بھی کر دیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کے ایک لفظ

’ماموں‘ نے اُسے اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہول کر رہ گئی۔ زخم خوردگی سے وہ بلبلائی رہی۔ زخموں سے نیسیں اٹھتی رہیں، روح میں سناٹا چکرانے لگا۔ روتی رہی، کرلاتی رہی، اُس کے اندر درد تک درازیں پڑتی رہیں۔ اُس کی دردناک سسکیاں ہولناک سناٹوں میں گونجتی رہیں۔ خاموش فضا میں ارتعاش برپا کرتی رہیں۔ وہ رو رو کر بے دم ہو گئی۔ بے کسی سے اُس نے اپنا سراپنی ہی گود میں گرا لیا اور بے جان بازوؤں کو اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کے گرد لپیٹ لیا۔ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے آنکھوں کے اندر کسی نے مٹھی بھر مرچیں ڈال دی ہوں۔ اُس کی ہچکیاں وقفے وقفے سے کر بناک وحشت زدہ سناٹے میں ابھرتی رہیں۔ فجر کی اذان کی آواز اُس کی سماعتوں میں پہنچی، وہ چونکی۔ اتنا وقت گزر گیا۔ ساری رات تمام ہوئی وہ بے آواز روتے ہوئے سر اوپر اٹھا کر گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی نکا کر سیاہ گھور اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ خاموشی اور خوف سرسراتے ہوئے اُس کی ہڈیوں میں اتر کر اعصاب کو شل کر رہے تھے۔ وہ ابھی تو ذرا سا ہی سکون کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ پائی تھی کہ اُس کے بیٹے کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ نے دل کی دنیا تہہ بالا کر کے دل میں دھواں سا بھر دیا تھا۔ سارا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ سارے زخم ہرے کر دیے تھے۔ وہ اٹھی اور بے جان قدم واش روم کی طرف بڑھا دیے۔ ابھی اُسے وضو کر کے نماز پڑھنی تھی۔ غرض کے سجدے ادا کرنے تھے۔ خدا کی بارگاہ سے دل کا سکون مانگنا تھا۔

”جسے کہیں سکون اور طمانیت اور خوشی نہ ملے۔ جسے سارا زمانہ دھتکار دے۔ سارا عالم ٹھکرا دے۔ اُسے خدا کی ذات اپنی رحمت کی بانہوں میں پناہ دے کر سمیٹ لیتی ہے۔ سکون عطا کرتی ہے۔ طمانیت سے دامن بھر دیتی ہے۔“

جسے کوئی معاف نہیں کرتا، اللہ اُسے بھی معاف کر دیتا ہے، بس مانگنے والے کو مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ اس کے پاس بھی آخری در خدا کا ہی بچا تھا۔ ہر کسی کے پاس آخری در خدا ہی ہوتا ہے جہاں آنسوؤں کو دیکھ کر اندر آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ بہت پسند ہیں خدا کو ندامت کے آنسو۔

☆.....☆.....☆

”مما۔“ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ماما کی نازک سی کلائی پکڑ کر دھیرے سے ہلائی۔

”مما اٹھو۔“ اب کی بار وہ ذرا زور سے بولا اور اپنی دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اُس کی کلائی زور سے بھینچ ڈالی۔ سختی بھری گرفت سے وہ ذرا سا کسمائی مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔

”مما اٹھو مجھے بھوک لگی ہے۔“ وہ چڑ کر شور کرنے لگا اور ساتھ ساتھ اُسے ہاتھوں سے مارنے لگا۔

”تم گندی ماما ہو، گندی ہو۔“ وہ بیڈ سے اتر کر چلانے لگا۔ درشتی سے چیزوں کو پٹختے لگا۔ تبھی اُس کی آنکھ کھلی وہ ناہمی کے عالم میں خالی خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہی، پھر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ شدت گریہ اور تمام رات اذیت میں گزارنے کے بعد ابھی تو ذرا کی ذرا اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بے سدھ سوئی پڑی تھی جاگ تو گئی تھی مگر اُس کے اعصاب ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے اور آنکھیں کھولنے سے آنکھوں میں شدت سے جلن اور تپش سمٹ آئی تھی۔

”تم گندی ماما ہو۔“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا کیوٹ سا گپلو سامنا آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر قہر سجائے اپنی ماما کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے الفاظ کیسے تھے۔ دل کو کاٹتے ہوئے دل کو چیرتے ہوئے اُس کی رتجگے کی ماری آنکھیں برسنے لگیں۔ یوں لگا جیسے زخموں پر نمک پاشی ہو رہی ہے۔

وہ تو ملازمہ تھی، وہ اُس سے کیا کہتی کہ اُس کے تو اندر اتنے زخم ہیں اتنے گھاؤ کہ جن کا شمار ممکن ہی نہیں اور برسوں سے اُن زخموں سے خون رس رہا ہے اور کون جانے کب تک رستا رہے گا۔

فاخرہ جبیں صرف سوچ کر رہ گئی۔ بولی کچھ بھی نہیں، بس بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی رہی اور ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ بشیراں بغیر کہے اُس کی ٹانگیں دبائے لگی۔ آنسو فاخرہ کی بند آنکھوں کی گھنی سیاہ پلکوں کو بھگوتے رہے۔ وہ اپنی ذات میں کتنی اکیلی تھی کوئی اس سے فاخرہ سے پوچھتا آنسوؤں کا پانی قطرہ قطرہ اُس کے سفید گالوں پر بہنے لگا۔ اُس نے اپنے گال صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یونہی بے آواز روتی رہی۔ بشیراں نے ترحم آمیز نظروں سے فاخرہ کو دیکھا اُس کا دل اپنی مالکن کی بے سرو سامانی پر بھرا آیا۔ اتنی حسین عورت کہ جسے دیکھ کر دل نہ بھرے، اتنے مصائب اور کٹھن نامساعد حالات نے بھی اس کے صبح چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مضموم و آرزو عورت جس کا من اور تن دونوں ہی لہولہان تھے مگر اُس کے چہرے کی تازگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

بشیراں نے فاخرہ کے دل نواز نقوش کے سحر سے بمشکل نظریں چرائیں اور کچھ سوچ کر اٹھی اور مختلف درازیں کھنگالنے لگی کہ کوئی مرہم مل جائے کوئی کولڈ کریم ہی مل جائے تاکہ وہ اُس کے زخمی کھٹنے پر لگا دیتی۔ مگر بہت تلاش بسیار کے باوجود بھی کوئی دوا، کوئی مرہم نہیں ملا تھا۔

”باجی میں کوئی دوا ڈھونڈ رہی تھی تاکہ آپ کے لگا دوں مگر ملی ہی نہیں۔“ بشیراں دوبارہ فاخرہ کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی۔ جواباً فاخرہ نے کچھ نہیں کہا تھا بس سسکتی رہی آپ بھرتی رہی۔

زمان کو پچھلے دو دن سے بخار تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی اُسے آکر لے گیا تھا تاکہ اُسے دوائی لے دے

”نہیں، نہیں بیٹا میں گندی ممانہیں ہوں۔“ وہ عجلت میں بیڈ سے اُتری۔ اُس درد کی ماری کا نازک سا پاؤں بیڈ کی چادر میں الجھ کر رہ گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اوندھے منہ فرش پر گر گئی تھی۔ اُس کی پیشانی ماربل کے چکنے فرش سے ٹکرائی اور پیشانی پر گوڑ سا اُبھر آیا۔ وہ کمرے کے وسط میں بکھری پڑی بس ’سی‘ کر کے رہ گئی۔ وہ بچہ جو چند لمحے پہلے غیض و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اب بدحواس ہو کر رونے لگا۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی ماما کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”ممانہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔ تبھی بشیراں (ملازمہ) اندر آئی اور اُسے نیچے گرے دیکھا تو لپک کر سامنے آئی اور سہارا دے کر اُسے اٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ اُس کے ٹخنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ پاؤں میں بہت درد محسوس کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی تھی۔

”باجی صاحب کو فون کروں؟“ بشیراں نے پاس بیٹھ کر کہا مگر اُس نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا۔

”باجی آپ کا تو ٹخنہ بری طرح سے جھل گیا ہے، درد بھی ہو رہا ہوگا۔“ بشیراں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کا سفید گلابی مائل پاؤں اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہولے ہولے دبائے لگی۔

”باجی ذرا دیکھیں تو خون رس رہا ہے، آپ کہو تو فون کر دیتی ہوں۔ شہر سے آتے ہوئے صاحب کوئی دوائی لیتے آئیں گے۔“ بشیراں صحیح معنوں میں اُس کی وقادار اور غمگسار تھی۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی بشیراں نیک فطرت خاتون تھی۔

”رسنے دو خون، میں اسی قابل ہوں کہ میں درد کی ٹھوکریں کھاؤں، دھکے کھاؤں مگر کہیں کوئی سہارا نہ ملے، کوئی پناہ نہ ملے۔“ اُس نے خود اذیتی کی شدت میں اپنا نچلا ہونٹ کھل ڈالا۔

اور رات کو واپس چھوڑ کر جانے کی بجائے اپنے گھر ہی لے گیا تھا۔

”تیری ٹانگیں ٹوٹ تو نہیں گئیں جو یوں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے دیوار ہی ہے۔ بچہ باہر بھوکا روتا پھر رہا ہے۔ ادھر سوگ منانے سے ہی فرصت نہیں ہے۔“

زمان کی ماں نے کمرے میں آتے ہی جو یہ منظر دیکھا مانو اُس کے سر سے لگی پیروں تک چلی گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر فاخرہ کے کالے سیاہ بال اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ کر اتنی زور سے کھینچ لیے کہ فاخرہ کی درد سے جان نکلنے لگی۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کر سکی۔ فاخرہ کی ٹانگیں سکڑ کر پیٹ سے آن لگیں۔ اُس کا وجود گٹھڑی بن گیا۔ ڈری سہی کپکپاتی گٹھڑی فاخرہ کے بال چڑیا کا گھونسلا بن چکے تھے۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اُس عورت نے (جو فاخرہ کی ساس اور اُس کے شوہر زمان کی ماں تھی) یہاں تک بس نہیں کیا اب وہ قہر کی طرح برسی تھی۔ اُس نے فاخرہ کی کمر پر دو ہتھ مارنا شروع کر دیے مارتی رہی۔ پھر اُس کا سکڑا سمٹا وجود کسی غلیظ ڈھیر کی طرح پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ فاخرہ کا سر زوردار آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرایا تھا مگر فاخرہ نے سی تک نہیں کی تھی۔ کراہنا یا تڑپنا، بلکنا تو درکنار اُس نے تو ایک آہ بھی نہیں بھری تھی۔ اب وہ ظالم خزانہ عورت اُسے اپنے سخت پیروں سے ٹھوکریں مار رہی تھی۔ فاخرہ بے حس و حرکت یوں پڑی تھی جیسے اُس کے اندر سانس باقی ہی نہیں رہی ہو۔ زندگی نے اُس کو کرا اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ہو کہ اُسے کمزور عورت! تیرے جیسی بے حس عورت کو میری ضرورت ہی نہیں، تو ٹھیک ہے مجھے بھی تیرے ساتھ نہیں رہنا۔“

”ٹو اچھی بیوی تو کبھی بن ہی نہیں سکی اور بن بھی نہیں سکے گی، مگر اچھی ماں تو بن کر دکھا گھٹیا عورت۔ ٹو تو ناگن ہے ناگن، جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔“

اس بات پر فاخرہ نے زور سے بند کی ہوئی آنکھیں کھولیں اور ایک ایسی نظر سامنے کھڑی عورت پر ڈالی کہ وہ پل بھر کے لیے فاخرہ کے تیور بھانپ کر شپٹا کر رہ گئی۔ کیسی وحشت در آئی تھی فاخرہ کی آنکھوں میں، جیسے وہ اُسے کچا چبا ڈالے گی۔

”میرے بچوں کے سامنے میری تذلیل مت کرو خالہ! مجھے معاف کر دو۔ میری اولاد کی نظروں میں مت گراؤ مجھے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے! مجھے اپنی اولاد کی نظروں میں حقیر مت کریں۔“ فاخرہ اُس کے قدموں سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو دی۔ بشر اُس کی یہ حالت زار دیکھی نہیں جاتی تھی مگر اُس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اُس کو سہارا دیتی اس وقت۔

”اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ ذرا بدکردار عورت! تُو ہے اس قابل کہ تجھے معاف کر دیا جائے۔“ اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے فاخرہ کے منہ پر پاؤں سے ٹھوکر ماری، نرم گال پر ضرب لگی تھی۔

”اور تُو ٹسوے کس چکر میں بہا رہی ہے۔ کان کھول کر سن! تجھے اس حرافہ کی تیمارداریوں کے لیے نہیں رکھا گیا ہے کہ تُو اس عورت کے ناز نخرے اٹھائے، اس کی ناز برداریاں اٹھائے۔“ اب اُس مرد مار عورت کا روئے خن بشر اُس کی طرف ہوا۔ اُسے بشر اُس کی خیر خواہی بری طرح کھٹکتی تھی۔

”مت بھولو کہ تمہیں اس عورت کی خبر گیری کے لیے رکھا گیا ہے۔ تمہیں ہر وقت سائے کی مانند اس کے ساتھ رہنا ہے۔ اس کے پل پل کی رپورٹ مجھے دینی ہے اور اس کے لیے میں تمہیں تنخواہ دیتی ہوں، لہذا تمہیں اس عورت سے ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تم۔“ اُس نے بے حس و حرکت کھڑی بشر اُس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس عورت کا طنطنہ، اس عورت کا گھمنڈ نجانے کیا دن دکھانے والا تھا۔

”دادو مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ مجھے کچھ کھانے کو دے دیں۔“ اسد زمان اُس کی ٹانگوں سے لپٹا کہہ رہا تھا۔ اُس عورت سے جو ڈائن تھی سفاک ہونے کی حد تک ظالم تھی۔

”اپنی ماں سے مانگ، جیسی تیری ماں ویسا تو ناگن کا سنپولیا۔“ وہ بکتی جھکی منہ سے کف اڑاتی، پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ بشیراں نے لپک کر اسد کو گود میں اٹھالیا جو بھاں بھاں کر کے رو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

زمان احمد کا بھائی رحمان احمد، زمان کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔ دو کمروں کا نیم پختہ گھر، ذرا سا کچن۔ دروازے کے سامنے رکشہ رکنے کی آواز آئی تھی پھر کسی نے دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا تھا۔ صبا اور فضا ابھی اسکول سے آئی تھیں جبکہ اسوہ اور اسد چھوٹے سے ایک کھلونے کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ دروازہ پھر سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے والے کے انداز میں عجلت ہی نہیں ایک محسوس کی جانے والی جارحیت بھی تھی۔ صبا اور فضا نے وی کی آواز فل کھولے اپنی اچھل کود میں لگی ہوئی تھیں۔ اماں دوسرے کمرے میں اندر سے دروازے کی چٹختی چیز ہائے بے خبری کی نیند سو رہی تھی، گہری نیند۔ ایسی پرسکون نیند کہ لگتا نہیں تھا کہ جلد اُس کی آنکھ کھلے گی اور باہر رحمان دروازہ توڑ دینے کے در پے تھا۔ اُسے غصہ آ رہا تھا، بہت آ رہا تھا بے تحاشا غصہ مگر کس پر..... فاخرہ جہیں پر، اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بند دروازے کے پار فاخرہ کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر نوج کھوسٹ ڈالے، خراشیں ڈال دے۔

”بد بخت عورت نبانے کیوں دروازہ نہیں کھول رہی۔“ زمان نے دروازے پر زوردار لات مار کر تشفیر سے کہا۔ جو طیش رحمان کو فاخرہ پر آ رہا تھا ویسا ہی تاؤ زمان کو بھی آ رہا تھا۔ سب کو فاخرہ پر غصہ آتا تھا اور

سب بلا دروغ اظہار بھی کرتے تھے۔ نفرت کا، کراہیت اور حقارت کا۔

رحمان نے زمان کو ذرا سا ٹھوکا دیا پھر کچھ خیال آیا کہ وہ تو دیکھ نہیں سکتا اُس کا مقصد سامنے آتی فاخرہ کی طرف رحمان کی توجہ مبذول کروانا تھا مگر وہ اپنے بڑے بھائی کی بے نور آنکھوں کو محض دیکھ کر رہ گیا۔

”ہو گئے تمہارے سیر سپائے ختم۔“ رحمان نے بدتمیزی سے اکھڑ لہجے میں کہا۔ فاخرہ نے استفہامیہ اُسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہنا بھی بے سود ہی ٹھہرتا، کیا فائدہ اپنی حاضر جوابی دکھانے کا، جب کوئی فائدہ ہی نہیں، کیا اُسے نظر نہیں آ رہا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ صد شکر کہ دروازہ اندر سے کھل گیا۔ خالہ اماں آنکھوں میں نیند کا تھما لیے کھڑی تھیں۔ سب کو ایک نظر باری باری دیکھا، فاخرہ نے، قہر آلود سلگتی نظروں سے، اندر تک کاٹتی نگاہیں، پھر ان کی نظریں تپے ہوئے رحمان پر رکیں جو پہلو بدل رہا تھا، اُس کے ساتھ چپکا زمان۔

”سلام اماں۔“ رحمان نے لٹھ مار انداز میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، آ جا پتر اندر آ۔“ وہ درمیان انکی تھی

دروازے کے، ذرا سا سائیڈ پر کھسکی۔

”مجھے اندر نہیں آنا، بھائی کو اندر لے جاؤ۔“ وہ یوں ہی اکڑا اکڑا بولا فاخرہ اپنی جگہ چوری بن گئی۔

خالہ اماں نے زمان کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف مڑیں، جاتے ہوئے رحمان نے ایک سیٹیلی سرنگاہ فاخرہ پر ضرور ڈالی تھی۔ یہ اُس کے سسرالی رشتے تھے جن کے لیے فاخرہ ایسی ہستی تھی جس میں زمانے بھر کی خامیاں تھیں۔ اُس کی ہر خامی ناقابل برداشت، اُس کی ہر غلطی ناقابل تلافی اور اس کامیک.....

فاخرہ نے آتے ہی کپڑے تبدیل کیے اور کھانا پکانے میں جت لگائی۔ بشیراں اُس کی مدد کروا رہی تھی۔

رات کو وہ گھر کے کاموں سے فراغت پا کر کمرے میں آئی تو دیکھا صبا اسوہ کو ساتھ لگائے تھپک

رہی تھی جبکہ اسوہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر کہانی سننے کی ضد کر رہی تھی۔ کھانے کے خالی برتن کمرے کے فرش پر بکھرے پڑے تھے بشراس کو شاید گھر جانے سے پہلے دھیان نہیں رہا تھا برتن اٹھانے کا۔

”مما اسوہ ایک ہی بات پراڑی ہوئی ہے کہ مما سے کہانی سننی ہے جبکہ میں نے کہا بھی کہ مجھے بھی کہانی آتی ہے شہزادی کی اور ظالم جادوگر کی۔“ صبا نے فاخرہ کو دیکھ کر بتایا۔

”بیٹا میں سناتی ہوں کہانی ذرا کمرہ سمیٹ لوں۔“ فاخرہ نے دونوں بچیوں کے یونی فارم چارپائی سے اٹھا کر الماری میں لٹکائے، اُن کے اسکول شوز اکٹھے کر کے رکھے، اسد کے کھلونے سمیٹے پھر کھانے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھنے چلی گئی۔ جاتے جاتے ذرا سا دوسرے کمرے میں جھانکا، اسدا اپنے باپ کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور خالہ اماں زمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ فاخرہ کچن میں۔ وہ بھی برتن دھو کر جب اپنے کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کر اُس کا دل ملال سے روئے لگا، نضا اور صبا کے درمیان میں اسوہ سوئی پڑی تھی۔ وہ تینوں ماں کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ اسوہ کی چمکیں بھگی ہوئی تھیں اور اُس کے نازک گالوں پر آنسوؤں کے نشان تازہ تھے۔ فاخرہ کا دل تڑپنے لگا۔ اُس کی مجبور ممتا ہر رات، ہر دن ایسے ہی بلکتی تھی۔ باوجود چاہنے کے بھی وہ اپنے بچوں کے لیے بہت سارا تو درکنار، تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال پاتی تھی۔ اُس نے وہیں اپنی بیٹیوں کے پاس جگہ بنائی اور لیٹ گئی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا کب آنکھ لگ گئی۔ اُس کا نیند میں ڈوبا ذہن ابھی پوری طرح سکون بھی نہیں پاسکا تھا کہ کسی نے اُسے بے دردی سے جھنجھوڑ ڈالا۔

”اری بے حس عورت کس قدر ظالم ہے تو، تیرے شوہر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تو آرام سے سوئی ہوئی ہے۔ اٹھ جا اس نمانے کے پاس جا۔“ فاخرہ کا

ذہن سوئی جا کی کیفیت میں غصے کا، بدن ہوا آرام پانا چاہ رہا تھا ذہنی یکسوئی نصیب نہیں، ولی تو ایسے اوصاف گھنچ کر رہ گئے۔ بدن میں درد کی لہریں سی اٹھ کر فاخرہ کو بد حال کرنے لگیں۔

”اب جا بھی اُس کے پاس انسان فراموش عورت، قدر کر اُس فرشتہ صفت انسان کی۔“ فاخرہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں زمان اسد کو ساتھ لپٹائے لیٹا تھا۔ جیسے ہی فاخرہ کمرے میں آئی زمان دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پچھلے پودہ سالوں سے فاخرہ کے قدموں کی چاپ سے آشنا تھا۔ اُس کے بدن کی خوشبو زمان کے بدن کا حصہ تھی۔

”تم آگئیں فاخرہ۔“ جیسے ہی وہ بند پر آ کر بیٹھی زمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”طبیعت کیسی ہے اب؟“ فاخرہ نے اب دونوں ہاتھوں میں زمان کا ہاتھ دبا کر کہا۔

”بخار تو اب نہیں ہے مگر بدن میں بہت درد ہے، کروٹ نہیں لی جا رہی۔“

”دبا دوں۔“

”ہاں دبا دو اور تب تک دباتی رہنا جب تک میری آنکھ نہ لگ جائے۔“ زمان نے اپنے ہاتھ سے اسد کے نقوش مٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اکثر ایسے ہی اپنے بچوں کے نقوش کو چھو چھو کر دیکھا کرتا، محسوس کیا کرتا تھا۔

فاخرہ ذرا سا آگے کھسکی اور پیروں کی طرف بیٹھ کر زمان کے پاؤں دبائے لگی۔ فاخرہ نرم گورے ملائم ہاتھوں سے زمان کے گہرے سیاہ پاؤں کو دباتی رہی، ابھری ہڈیوں والے سخت سوکھے ہوئے پاؤں، فاخرہ کے ہاتھوں میں ہڈیاں چبھتی رہیں فاخرہ کا سر مارے نیند سے بو جھل ہو رہا تھا۔ اُس کی چمکیں بار بار جڑ رہی تھیں۔ فاخرہ خود پر جبر کر کے بند آنکھوں سے زمان کو دباتی رہی۔ میٹھی غنودگی نے ایک بار تو اُسے نیند میں پہنچا بھی دیا مگر یہ لحوں کی بات تھی فاخرہ جھٹکا کھا کر

سیدھی ہوئی تھی، زمانے بھر کی تھکن اُس کی پور پور میں سما رہی تھی۔

”فاخرہ ادھر آ میرے پاس۔“ زمان نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ فاخرہ نے ایک آزدہ سی سانس خارج کی اور زمان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آگے ہو کر لیٹ گئی۔ زمان کا ہاتھ کسی لکڑی کی مانند فاخرہ کے بالوں میں سرسرا نے لگا پھر اُس کا ہاتھ فاخرہ کے بالوں کی لمبائی ناپنے لگا۔ وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

”تمہارے بال بہت لمبے اور ریشمی ہیں نا۔“ زمان نے یہ سوال ہزاروں بار پہلے بھی پوچھ رکھا تھا۔

”جی بہت لمبے گھنے سیاہ بال۔“ فاخرہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تمہاری پیشانی کیسی ہے۔“ یہ بھی پرانا سوال تھا مگر ہر بار نیا تجسس دبا ہوا ہوتا تھا سوال میں۔

”جی بہت چمکتی ہوئی کشادہ، جیسی بخت آوروں کی ہوتی ہے۔“ فاخرہ نے سسکاری لی اُس کی پیشانی کشادہ روشن تھی مگر وہ بخت آور نہیں تھی مقدر کی سیاہی نے اُسے کہیں کانہ چھوڑا تھا۔

”رور ہی ہو کیا؟“ اب زمان کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید وہ رور ہی ہے۔ اس کے ہاتھ اب فاخرہ کے نین نقوش کھوج رہے تھے۔ زمان کے ہاتھ کی انگلی فاخرہ کی آنکھ میں کھب گئی بلا کا درد اٹھا تھا اور آنکھ سے پانی بہہ نکلا۔ فاخرہ کے دل سے کراہوں کا سیلاب اُٹھ چلا آ رہا تھا مگر اُس نے بے دردی سے اپنی آہوں کو ہونٹوں میں ہی دبایا اور کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

”فاخرہ مجھے بتاؤ تمہاری آنکھیں، تمہاری ناک، تمہارے ہونٹ کیسے ہیں۔“ زمان کے انداز میں نجانے کیا تھا کہ فاخرہ نے آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اوپر اٹھا کر زمان کو دیکھا۔ زمان کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخروہ یہ کیوں پوچھ رہا ہے کرید رہا ہے جستجو تھی کوئی کھوج یا پتا نہیں مگر فاخرہ بے

دل سے بولی۔

”میری آنکھیں بڑی بڑی ہیں، بولتی ہوئی، اپنی طرف کھینچتی ہوئی۔ میری ناک ستواں اور ہونٹ ایسے جیسے تازہ گلاب۔“ زمان کا ہاتھ فاخرہ کے بدن پر سرسرا نے لگا۔ پھر زمان اُس سے بدن کے خدوخال پوچھنے لگا۔ اپنا شوہرا اپنی ہی بیوی کو کھوجتا رہتا تھا۔

”تم بہت خوبصورت اور مکمل عورت ہو۔“ زمان خمار آلود لہجے میں بولا۔ فاخرہ ٹھکی یعنی وہ جاگنے اور جگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فاخرہ کو اپنا وجود ٹوٹا بکھرتا محسوس ہو رہا تھا وہ صبح سب سے پہلے اٹھتی تھی اور سب کے بعد سونا نصیب ہوتا تھا۔

”سنا ہے وہ بھی بہت پرکشش نوجوان تھا۔“ زمان نے کوئی تیر فاخرہ کے روح و بدن میں اتارا تھا وہ اب ایسے طنزیہ کاٹ دار جملوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے اب بہت اطمینان سے جواب دے دیتی تھی۔

”جی!! بہت ہینڈسم اور وجیہہ تھا۔“

”یاد آتا ہے نا بہت۔“ زمان کے ترکش میں بہت تیر تھے، اپنے سین گھائل کرنے کے لیے۔

”بالکل نہیں قطعاً نہیں۔“ وہ زور زور سے ہنسا پھر ہنستا رہا۔

”کہاں وہ پڑھا لکھا ڈینٹ مرد اور کہاں میں، میٹرک پاس بھی نہیں عام سامرد کالاکلوٹا۔“ وہ پھر ہنسا۔

”ادھورا مرد اندھا مرد۔“ ہاہا ہاہا۔ فاخرہ نے تاسف سے زمان کو دیکھا وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا اور وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا کہاں زمان اور کہاں فاخرہ جہیں، کوئی چیز بھی تو دونوں میں مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ شکل و صورت، تعلیم، ذہانت، کچھ بھی مگر حالات و واقعات تو شاہوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو وہ کیا چیز تھی۔

فاخرہ واش روم سے فارغ ہو کر آئی، گیلے بال سلجھا کر وہ بس سونے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ کچھ بھی ایسا نئی بھرا نہیں سوچنا چاہتی تھی جو نیند کو اُس کی

آنکھوں سے کوسوں دور بہہ گادے۔

☆.....☆.....☆

فاخرہ اپنی طاقت، اپنی ہمت اور صبر پر حیران تھی کہ بھلے اُس کا دل اپنوں کے ستم پر اُن کے ڈھائے جانے والے مظالم پر کتنا ہی ماتم کناں ہوتا مگر بند نہیں ہوتا تھا۔ وہ مریکوں نہیں جاتی تھی۔ روز روز کے مرنے سے ایک بار ہی مرجاتی مگر جینا کتنا ہی دشوار اور دقت طلب ہو، مرنا اُس سے بھی کہیں کٹھن اور ہولناک ہوتا ہے۔ اتنی ذلت، اتنی خواری پر فاخرہ کا تن بدن سلکتا رہتا۔ اپنی ذات کی پامالی اُسے کاٹتی رہتی، مارتی رہتی مگر اب وہ اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر زندہ تھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی۔ کسی آس، کسی اُمید کے سہارے شاید وہ کبھی معتبر ہو جائے مگر کیا پتا آنے والا وقت فاخرہ جیس کی چھید بھری جھولی میں کیا ڈال دے۔

فاخرہ جب اٹھی تو نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہی فجر کی نماز پڑھ پاتی تھی۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ نہیں کھل پاتی تھی۔

فاخرہ نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا۔ آٹا گوندھا اور جلدی جلدی پراٹھے بنانے لگی۔ اتنی دیر میں بشیراں بھی آگئی۔ اُس نے صبا اور فضا کو جگایا اور اُن کی اسکول جانے کی تیاری کروانے لگی۔ پھر بشیراں بچیوں کو ناشتا کروانے لگی۔ فاخرہ نے کپڑے بدلے، چند لقمے زہر مار کیے، آدھا کپ چائے پی، برقع اوڑھا اور سوتے ہوئے اسد اور اسوہ کو پیار کیا اور ایک نظر خالہ اماں کو دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔

باہر رکشہ آکر رُکا بشیراں نے صبا اور فضا کو اُس میں بٹھا دیا رکشہ چل پڑا۔

فاخرہ کا اسکول قریب ہی تھا دو گلیاں چھوڑ کر اس لیے وہ پیدل ہی جاتی تھیں دونوں۔

”آپ کا پاؤں اب کیسا ہے؟“ بشیراں کے پوچھنے پر فاخرہ چونکی۔ پھر یاد آنے پر بولی۔

”اتنی فکر مند مت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔“

”اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو بھنبھوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔“

”تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا۔“

”آپ خود کماتی ہیں، خود اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہیں، پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ایسے کٹھور اور سنگدل لوگوں کو، جو آپ کو انسان نہیں سمجھتے۔“ وہ سچی مخلص تھی۔

”چھوڑنا نہیں چاہتی، کیونکہ میں اب ایک ماں ہوں، باقی کچھ نہیں، ماں ہونا میرے اندر توانائیاں بھر دیتا ہے۔ میں نئے سرے سے اپنے اندر زندگی کو جوان ہوتے، سانس لیتے دیکھتی ہوں۔ اولاد ہر ماں کا سرمایہ ہوتی ہے۔ میری اولاد بھی میرا اثاثہ ہے، قیمتی اثاثہ، میری کل متاع جاں۔“ تبھی اُس کی نظر سامنے رُک کی ٹھنکی اور پھر تھم گئی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ یک ٹک دیکھے گئی یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں پانیوں سے بھر کر دھندلی ہو گئیں۔

”کیا ہوا رک کیوں گئیں؟“ بشیراں نے پوچھا۔

”بس کچھ نہیں۔“

”آپ روز اس گھر کے سامنے رُک جاتی ہیں۔ کس کا مر ہے یہ۔“ بشیراں نے فاخرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کوئی نہیں، تالا لگا ہوا ہے، میرا یہاں کوئی نہیں رہتا۔“ وہ نم آنکھوں کو مسلتی ٹوٹے قدموں سے آگے بڑھ گئی سامنے ہی سرکاری ہائی اسکول کی عمارت نظر آرہی تھی وہ اسکول میں سینئر ٹیچر تھی۔ رنپل اُس کی مشاورت سے اسکول کے ہر کام کیا کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

عروہ نے تیز آواز میں کمپیوٹر پر ”بلما“ لگا رکھا تھا اور بالکل ہیروئن کے انداز میں اسٹیپ لیتا سیکھ رہی

تھی۔ بہت دنوں سے اُس کی پریکٹس چل رہی تھی۔ تقریب کا سارا انتظام مس افشاں کر رہی تھیں۔ عروہ نے کانٹے کی تقریب میں ڈانس کرنا تھا۔ امن نے بھی عروہ کے ساتھ اسٹیج پر ڈانس کرنا تھا وہ دونوں کزن ڈانس میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں۔ امن اور عروہ گھر پر اپنے طور پر اکٹھے ڈانس کر کے سیکھتی رہتی تھیں۔ وہ تقریب میں اپنی کارکردگی سے نمایاں نظر آنا چاہتی تھیں۔ عروہ اس وقت کمر کو بل دے دے کر ناچ رہی تھی جب دروازہ پر دستک ہوئی، مگر وہ تھرکنے میں اتنی گم تھی کہ اُسے دستک کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ ذرا توقف کے بعد دستک دوبارہ ہوئی۔ عروہ کا دھیان بٹ گیا اور اُس کے پاؤں کھم گئے۔

”کون؟“ عروہ نے درستی سے پوچھا۔

”امن، دروازہ کھولو۔“

”آؤ، اتنی دیر لگا دی۔“ عروہ نے امن کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور اندر سے دوبارہ کنڈی لگا دی۔

”تمہاری ماما کہاں ہیں۔“ امن نے پوچھا۔
”نجانے اُسے امن کی ماما (تائی جان) سے ڈر کیوں لگتا تھا، عجیب منہ پھٹ سی تھیں۔ بل میں اگلے کو بے عزت کر کے رکھ دیتی تھیں۔“

”اپنے دورے پر نکلی ہیں بے فکر رہو۔“ عروہ نے لاپرواہی سے کہا اور امن کو آنکھ ماری اور پھر دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

”میری ماما آئے نہیں دے رہی تھیں۔ میں بہت مشکل سے بہانے بنا بنا کر آئی ہوں۔“

”چل چھوڑ، اپنی اور میری ماما کو، اتنے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈانس ہی سیکھنا ہے نا کوئی فلموں میں تو کام کرنے نہیں جا رہیں ہم دونوں۔“ عروہ ایسی ہی تھی۔ لاپرواہ امن موبجی، کسی کی نہیں سنتی تھی۔

”دراصل یار میں نے ماما کو بتایا نہیں ہے نا کہ مجھے کان کنکشن میں ڈانس کرنا ہے، چوری چھپے حملے

لیا، میری ماما کو جانتی تو ہو کہ ذرا سخت طبیعت کی ہیں۔“
”چل چھوڑ! پراں کر ساری فکریں۔“ کہتے ہی عروہ نے ایک بار پھر بلما تیز آواز میں لگا دیا۔ عروہ تو خیر سرے سے اپنی ماں کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ امن اپنی ماما سے ذرا سا ڈرتی تھی مگر اس وقت بلما کی چھٹک اور سر میں وہ بھی سارے ذرا اور خوف دل سے نکال چکی تھی۔

”اُو ووف تھک گئی۔“ امن نے پنکھا فل اسپنڈ میں چلایا اور صوفے پر بے دم ہو کر گر گئی۔ اُس کی پوری قمیض پسینے سے بھیک چکی تھی۔ وہ تھک چکی تھی مگر لگن ابھی باقی تھی۔ یہی حال عروہ کا تھا دونوں ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے۔ تھری سیٹر صوفے پر وہ دونوں پڑی ہانپ رہی تھیں۔

”پھر نا چیں۔“ ذرا سی سانس بحال ہوئی تو عروہ نے پوچھا مگر امن نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انکار کر دیا۔
”نہیں یار ذرا بھی سکت نہیں، کل آؤں گی۔“
امن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ باہر نکلی تو دیکھا فروا اپنے سامنے پالک کا ڈھیر لگائے خود کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔

”ہیلو فروا آئی کیسی ہو؟“ امن فروا کو سامنے پا کر بوکھلا گئی۔ وہ بھی تائی جان جیسی ہی تھی۔

”ہو گیا ناچ گانا۔“ فروا نے خشکیں نکا ہوں سے امن کو کھورا، وہ شپٹا گئی۔ اُس کو خدشہ لاحق ہوا کہیں فروا اُس کی ماما کو نا بتا دے یہ سوچ کر امن کے اوسان خطا ہونے لگے۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ فروا کی گھورتی نظروں سے خائف ہو کر بھاگی۔

”اپنی ماما کی آنکھوں میں دھول جھونکنا خوب سیکھ گئی ہو۔“ وہ طنز سے باز نہیں آ سکتی تھی۔ امن جانتی تھی کہ فروا کا عروہ پر تو بس نہیں چلتا تھا مگر امن کو جلی کئی سالے پر تلی رہتی تھی اور امن دو بدو جواب نہیں دیتی تھی

کچھ بھی تھا اتنا لحاظ مروت تو ہر طور اُس میں تھا۔

☆.....☆.....☆

عروہ اور امن کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں ہم عمر، ہم مزاج ہی نہیں کلاس فیلو بھی تھیں۔ بہادرپور شہر کی مل والی گلی کی رہائشی یہ دونوں کزن ایک پرائیویٹ کالج میں آئی کام فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ کالج میں اُن دونوں کی دوستی ضویا سے ہو گئی جو کسی گاؤں سے بڑھنے کالج میں آتی تھی۔ یہ تینوں کالج میں ہر وقت اٹکھی نظر آتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے مگر کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کو آپس میں بہت زیادہ بات چیت کرنے کی اجازت تو نہیں تھی۔ گھلنا ملنا تو درکنار، بس سب اسٹوڈنٹس اسٹڈی کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ لیکچر کے حوالے سے ڈسکشن ہوتی تھی۔ مگر کھلم کھلا گھومنا پھرنا یا عامیانہ گفتگو کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی بہت سارے لڑکے لڑکیوں نے خفیہ دوستیاں گانٹھ رکھی تھیں۔

دونوں ہی واجبی سی شکل و صورت کی تھیں۔ پڑھائی میں بھی بس اتنی ہی اچھی تھیں کہ پاسنگ مارکس لے لیتی تھیں، اُن کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

اُس دن جب جھلسا دینے والی دھوپ نے اُن کی رنگت جھلسا کر رکھ دی تھی۔ سورج بادشاہ اپنی پوری آب و تاب اور طمطراق سے اُن پر سایہ فلکں تھا۔ عروہ اور امن نے اپنی فائلز کا چھجا سا بنا کر آنکھوں پر تان رکھا تھا وہ کینٹین جارہی تھیں۔

”میں نے تو صبح بھی ڈھنگ سے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس وقت شدید بھوک لگی ہے۔“ عروہ نے بے چاری سی شکل کو مزید بسور کر کہا۔

”ہاں صبح صبح دل بھی نہیں چاہتا اور بھائی نے اتنا شور مچا رکھا ہوتا ہے کہ بس ایک کپ چائے پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔“ ضویا نے بھی اپنا مسئلہ بتایا۔

”میں تو ناشتا کر کے ہی آئی ہوں۔ میری ماما مجھے

کبھی بھوکا نہیں آنے دیتیں۔“ امن نے کہا۔

”اچھا آؤ! میری تو جان نکلی جا رہی ہے بھوک

سے۔“ عروہ نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

”تم تو ہر وقت بھوک بھوک ہی کرتی رہتی ہو۔“

ضویا نے مذاق اڑایا۔

عروہ نے اُسے غصے سے گھورا مگر بولی کچھ نہیں

کیونکہ وہ حقیقتاً بھوک سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

ضویا چلتے چلتے رُکی اور اپنے بیگ کی زپ کھول کر

اُس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ ساتھ ہی بیگ میں

منہ گھسایا۔ عروہ نے اُسے بیچ راستے میں رُکے دیکھا تو

اُسے تپ چڑھ گئی۔

”کیا ہے! یہ احمقوں والی حرکتیں بند کر دو۔“ عروہ

نے اُسے ٹھوکا دیا مگر اُس نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔

تلاش بسیار کا کام ہنوز جاری رکھا، نجانے بیگ میں ایسا

کیا گم کر بیٹھی تھی جو ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”مل گیا۔“ تبھی ضویا چلائی اُس کی مطلوبہ چیز مل

چکی تھی۔

”بدحو کہیں کی۔“ عروہ نے اُسے گھر کا، کیونکہ

اُسے ضویا کی یہ حرکات و سکنات ایک آنکھ نہیں بھاتی

تھیں۔ اکثر لا پرواہی سے بیگ میں سیل فون ٹھونس

دیتی تھی پھر مل کے ہی نہیں دیتا تھا۔

”ہزار بار کہا ہے کہ اندر کی پاکٹ میں سیل فون

رکھ لیا کرو، عمرو عیار کی زنبیل جیسا بیگ ہے تمہارا، جس

میں زمانے بھر کا الم غلم بھرے رکھتی ہو پھر اُسی میں سیل

فون پھینک کر گم کر لیتی ہو۔ اپنا بھی وقت برباد کرتی ہو

اور ہمارا بھی، وہی رہنا بے وقوف گاؤں کی گوری۔“

امن نے بھی اُس کو پہلے ڈپٹا اور بعد میں اُس کا تسخر بھی

اڑا ڈالا۔

بلکہ یوں کہو امن گاؤں کی کالی۔“ عروہ بھی ہنسی۔

”ہاں تم دونوں تو حسینہ عالم ہو، پریاں ہو اور شہر کی

شہزادیاں ہو۔“ وہ بھی دو بدو بولی تو سب ہنسنے لگیں۔

کینٹین پر آ چکی تھیں وہ۔

”تین پلیٹ سمو سے اور تین کوک اسٹراسمیت۔“
عردہ نے کینٹین والے لڑکے کو آؤرڈ دیا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ مستعدی سے کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ تینوں سمو سوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ بے فکری اور لا اُبالی پن کی شوخ ہنسی، جو اس عمر کا خاصا ہوتی ہے، بے وجہ ہنسی آتی ہے اور بے حد زوروں کی ہنسی آتی ہے۔ ایسی ہنسی جو دل سے شکوفوں کی مانند پھوٹتی ہے۔ رکتی نہیں آئے چلی جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

یہ گھر فرقان احمد کا ہے۔ اچھا پنختہ بنا ہوا گھر اُن کی جنت ہے۔ اُن کی بیوی لبنی میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو اچھی بیوی اور اچھی ماں میں ہوتی ہیں۔

اُن کی بیٹی امن، بیٹے ہنزلہ اور حذیفہ اُن کی زندگی ہیں۔ اُن کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لبنی سمجھدار اور معاملہ فہم ہیں، کچھ پڑھی لکھی باشعور بھی ہیں۔ اُن کو محلے میں اس وجہ سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ خداترس خاتون بھی ہیں۔

اس وقت لبنی دیوار کے ڈھلتے سائے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ امن پاس ہی دوسری چار پائی پر اپنی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ ہنزلہ اور حذیفہ اس وقت ٹیوشن سینٹر گئے ہوئے تھے۔

امن ابھی واش روم سے نہا کر آئی تھی۔ اُس نے بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ لبنی نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے فروا کھڑی تھی۔ امن نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر لبنی کے کندھے سے جھانکا ہنستی مسکراتی فروا پر نظر پڑتے ہی امن کا رنگ فق ہو گیا۔ سانولی رنگت متغیر ہو کر سیاہ نظر آنے لگی۔ لبنی پر تپاک انداز میں فروا کو گلے ملی اور اندر

آنے کی جگہ دی۔

”کیسی ہیں آپ چاچی۔“ فروا نے نظریں امن پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جتانی ہوئی نگاہیں دیکھ کر امن شپٹا کر رہ گئی دائیں بائیں دیکھنے لگی مگر دل کا خوف دائیں بائیں نہ ہوسکا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا، تم سناؤ۔“ لبنی نے خوشدلی سے پوچھا۔ فروا نے بتایا کہ وہ بھی ٹھیک ہے۔ فروا نے اپنا لان کا دوپٹہ اتار کر گول مول کر کے اپنے چہرے اور گردن کا پستھ صاف کیا۔

”میں بخبین بنا کر لاتی ہوں۔“ امن بہانے سے غائب ہو گئی۔

”آپ تو آتی ہی نہیں ہیں، میں نے سوچا کہ میں ہی مل آؤں چاچی سے۔“

”اچھا کیا بیٹا تم چلی آئیں، بس میں تو گھر داری میں ہی اُلجھی رہتی ہوں۔ چاہ کر بھی نکلتا نہیں ہوتا۔“ لبنی نے انکساری سے نہ آنے کی وضاحت بھی دے ڈالی۔

امن بخبین بنا کر لے آئی جگ اور گلاس لبنی کے پاس رکھے اور جان بوجھ کر دوبارہ کچن میں جا کھسی جاتے جاتے اپنا ’کام‘ کر گئی تھی۔ لبنی کے چہرے کے تاثرات یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

فرقان احمد کا شہر کے وسط میں جنرل اسٹور تھا۔ وہ علی الصبح اسٹور پر جایا کرتا تھا۔ اچھا چلتا ہوا اسٹور تھا۔ رات دیر تک بارش ہوتی رہی تھی۔ موسم بے حد سہانا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

”فرقان اُٹھ جائیں نماز کا وقت نکل جائے گا۔“ لبنی نے بیڈ کے سرہانے بیٹھ کر اُن کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، بال سہلانے لگی پھر ہاتھ فرقان کی پیشانی پر آن رکا۔

”بارش رُک گئی کیا؟“ فرقان نے لبنی کے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ کر لبوں پر رکھ لیا۔

”جی رُک گئی۔“

”پڑے استری کر دیے۔“

”جی رات کو ہی کر کے رکھ دیے تھے بلکہ جوتے بھی پالش کر کے رکھ دیے تھے۔“ وہ مسکرائی۔
”اچھا اب اٹھ جائیں نماز پڑھ لیں۔“ لبتی اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ بیٹھی رہی تو فرقان یوں ہی کسلمندی سے لیٹے رہیں گے نماز نہیں پڑھیں گے۔“

”اچھا جی بیگم صاحبہ!“ وہ اٹھ کر سلپر پہنے لگے۔

☆.....☆.....☆

فرقان جلدی ناشتا کر کے اسٹور پر چلے گئے لبتی اب امن اور حذیفہ و ہنزله کے لیے سلائس تل رہی تھیں۔ امن اور ہنزله ہر چیز چپ چاپ کھا لیتے تھے جبکہ حذیفہ بہت نخرے کرتا تھا، شرارتی بھی بلا کا تھا۔
”امن میں ٹیبل لگاتی ہوں تم پلیز بیٹا حذیفہ کو دیکھو جا کر۔ ابھی تک نہیں اٹھا، جاگنے میں بہت وقت لیتا ہے۔“ لبتی بڑبڑاتی ہوئی ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات رکھنے لگی۔

”وہ اٹھ گیا ہے ماما، واش روم میں ہے۔“ امن کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”مجھ سے کچھ بھی مت چھپایا کرو امن۔“ امن سلائس پر جیم لگا کر مزے سے کھا رہی تھی۔ لبتی کی بات پر اس کا ہاتھ وہیں رک گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

”تم کالج کے فنکشن میں ڈانس کر رہی ہو۔“ لبتی کی بات پر امن نے دانتوں تلے انگلی دبائی جس بات کا ڈرتا وہی مجسم ہو کر سوال بن گیا تھا۔

”وہ ماما، وہ.....“ امن ہکلا رہی تھی۔ کوئی مناسب بہانہ نہیں سوچ رہا تھا۔ اچانک پکڑی گئی تھی۔

”زندگی میں صرف پہلی بار جھوٹ بولنا مشکل لگتا ہے پھر انسان عادی ہو جاتا ہے۔ بیٹا زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولنا اور نہ اپنا اعتبار رکھو دوگی۔ سچ بھی بولو گی تو بھی کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور ماں سے تو کبھی بھی

جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اور نہ کوئی بات چھپانی چاہیے۔
ماں سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔“ لبتی نے سرزنش کی تھی یا کوئی وارننگ، امن کی سمجھ سے بالاتر تھا ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے کوئی عذر نہیں تراشا بس پریشان سی نظر آنے لگی۔

”بتی کے بارے میں کوئی بات یا اطلاع ماں کو بتی کے بجائے کوئی باہر کا بندہ دے تب کتنی شرمندگی اور خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ بیٹا یہ یاد رکھنا بات کتنی ہی معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو گھر کے اندر مت چھپانا۔“ لبتی نے ماں کا فرض ادا کرتے ہوئے رسائیت سے امن کو سمجھایا۔ وہ سمجھی یا نہیں اس کا دوبارہ اس نصیحت پر عمل کرنے کا ارادہ تھا یا نہیں مگر فی الوقت اس نے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے وہ ندامت میں ڈوبی سر اٹھا نہیں پارہی ہو۔

”سوری ماما۔“

”ٹھیک ہے مگر دوبارہ خیال رکھنا۔ لڑکیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں (جو جانے انجانے میں ان سے سرزد ہو جاتی ہیں) بعض اوقات ان کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیتی ہیں۔“ امن نے اپنی کتابیں، فائل سیٹ کیس، اپنا بیگ اٹھایا اور لبتی کی بات کو بے توجہی سے سنتی باہر نکلی۔ اسے یہ خواہش ہی نہیں تھی کہ وہ لبتی کی بات دھیان سے سنے اور پھر ان باتوں سے معنی اور نتیجہ اخذ کرے اور آنے والے دنوں میں ان پر عمل بھی کرے۔ وہ تو لمبی چوڑی ڈانٹ یا لیکچر سے بچ جانے پر خوش تھی۔

”ماما میں جا رہی ہوں۔“ امن نے دوپٹا اچھی طرح سر پر جما کر کہا۔

”اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا۔“ لبتی نے آیت الکرسی پڑھ کر پھونگی اور تادیر محویت سے امن کو جانتا دیکھتی رہی۔ وہ دلیلیں پار بھی کر گئی مگر لبتی دروازے کو ہی دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

اس وقت بھی وہ تینوں کالج گراؤنڈ میں اکٹھی بیٹھی تھیں گرمی آج بھی زوروں کی تھی۔
 ”ضویا سوٹ کا کیا فیصلہ کیا، مطلب فنکشن میں کیسا سوٹ پہنوں گی۔“ عروہ نے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے پوچھا۔

”میرے پاس سادہ سے چند جوڑے ہیں بس۔“
 ضویا نے سادگی سے کہا۔
 ”یار پلیز کوئی سادہ سا جوڑا پہن کر نہ آ جانا۔“
 عروہ نے اُس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے کیونکہ ضویا کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اس لیے وہ اسٹائلش جوڑے نہ ہی بنوا سکتی تھی اور نہ ہی وہ کریزی تھی ایسی چیزوں کو لے کر۔

”میری آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اُن کا جوڑا پہن لوں گی، ڈونٹ وری۔ مجھے دوست کہتے تمہاری شان میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔“ ضویا اسٹینش کانشس نہیں تھی۔ کوئی کیا سمجھتا ہے، کیا کہتا ہے اُسے کبھی بھی قطعی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی وہ جیسی تھی ویسی نظر بھی آتی تھی، پیچھے نہیں بھاگتی تھی چیزوں کے، لوگوں کے یا جھوٹے خوابوں کے۔
 ”امن تم کیا پہنوں گی۔“

”میں اپنی ماما سے کہوں گی ضرور کہ نیا سوٹ دلوا دیں مگر یہ بھی امکان ہے کہ وہ مجھے ’قناعت‘ پر لمبا چوڑا لیکچر دینے لگیں مگر ہو سکتا ہے سوٹ دلوا ہی دیں۔“
 ”میں تو بوتیک سے نیا سوٹ لوں گی اپنی ماما سے، بھلے ضد ہی کرنی پڑے۔“ عروہ نے آنکھوں کو گول گول گھما کر زعم سے کہا۔ اس سے اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اُسے اپنی بات منوالینے کا یقین ہی نہیں بلکہ ’زعم‘ بھی ہو۔

”ویسے عروہ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔“ امن نے کندھے اُچکا کر تجسس پھیلایا۔
 ”کس بات کی؟“ ضویا اور عروہ نے یک زبان

ہو کر پوچھا۔
 ”یہی کہ تمہاری آنکھیں کیسی ہیں عجیب سی۔“ امن نے کہا اور عروہ کو منہ چڑائی اپنی کتابیں اور بیگ وہیں چھوڑ کر اٹھ کر بھاگی۔ اُسے پتا تھا عروہ پہلے شپٹائے گی پھر امن کو مار ڈالے گی۔

”ناک بھی چپٹی ہے۔“ امن جاتے جاتے بولی۔
 عروہ اُس کے پیچھے بھاگی تھی۔ ابھی تو وہ نئے سوٹ کی جھلملاہٹوں میں گم تھی کہ امن نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ خوابوں کی وادیوں سے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

”تم تو جیسے حور پری ہونا، لیڈی ڈیانا جیسا فکر، مونالیزا جیسی مسکراہٹ ہے نا۔“ وہ مسلسل امن کے پیچھے بھاگ رہی تھی مگر وہ پکڑائی میں ہی نہیں آرہی تھی، تبھی وہ زور سے کسی سے ٹکرائی تھی۔ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں امن کو لگ پتا گیا تھا۔

”کیا بد تمیزی ہے گرلز، چلیں اپنی اپنی کلاسز میں۔“ سامنے بی کام کا سی آر نیہات ضمیر تھا وہ اُن کو ڈپٹ رہا تھا۔ امن نیہات ضمیر سے ہی ٹکرائی تھی۔
 ”آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے۔ بی میچور گرلز، یہ اُچھل کود، یہ بھاگ دوڑ، فضول کے قہقہے بہت بچکانہ حرکتیں ہیں ویری سیڈ۔“ وہ تو شروع ہی ہو گیا تھا۔
 لعنت ملامت کرنے پر تو یوں تل گیا تھا جیسے نجانے اُن دونوں سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

وہ انہیں برا بھلا کہتا وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ وہ دونوں گم صم کھڑی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

”جہاں بھی جاتے ہیں بے عزت ہی ہوتے ہیں اور یہ ضویا ضمیر کا بھائی نیہات ضمیر سڑیل، کھڑوس، پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑتا ہے۔ مجال ہے ذرا ہلا گلا کرنے دے۔“

”اچھا یار معاف کر دے میں نے تمہیں گول

آنکھوں والی چپنی ناک والی کہا۔ ”اسن چہرے پر بے چارگی و مسکینی سجا کر چا پلوسی کرنے لگی بلکہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے وہ پہلے ہی نیہات کے ہاتھوں خوار ہو چکی تھی۔“

”تم تو مس کترینہ کیف ہو پراں دفع ہو۔“ عروہ نے اُس کے بندھے ہاتھ جھٹکے اور تن فن کرتی یہ جاوہ جا۔

اسن کو ماننا پڑا کہ آج کا دن بے عزت ہونے کا دن تھا۔

لبنی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی اُس کا ارادہ آج بازار جانے کا تھا۔ اسن نے بہت لجاجت و منت بھرے انداز میں نئے سوٹ کا تقاضا کیا تھا، لاڈ سے عاجزی سے اور لبنی نے حامی بھری تھی۔ اس سے پہلے کہ اسن ضد کرتی۔ لبنی جو کم ہی اکیلی بازار جایا کرتی تھی مگر کچھ سوچ کر گھر سے چادر اوڑھ کر نکلی اور زمان بھائی کے گھر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ لبنی ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”السلام علیکم!“ زینت گھر کی صفائی کر رہی تھی لبنی پر نظر پڑی تو ادھر آ گئی۔

”علیکم السلام، بھابی عائشہ کہاں ہیں۔“

”وہ تو گھر نہیں ہیں، کہیں باہر گئی ہیں۔“ زینت کل وقتی ملازمہ تھی اس لیے گھر میں اُس کی کافی عزت تھی اور اُسے گھر کی معاملات کے بارے میں پتا ہوتا تھا۔

”کچھ پتا ہو گا کس کے گھر گئی ہیں۔“ لبنی نے بیزاری سے پوچھا اُسے عائشہ بھابی کی گھر گھر پھرنے والی عادت سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔

”پتا نہیں جی۔“

”فروا بی بی کو جگا دوں۔“ زینت کہہ کر لبنی کو دیکھنے لگی کہ وہ کیا جواب دیتی ہیں۔

”نہیں رہنے دو، ویسے یہ آج پارلر کیوں نہیں گئی۔“

”پتا نہیں جی، ناشتے کے لیے زمان صاحب نے بلوایا تھا تو اُس نے دروازے کے اندر سے ہی کہہ دیا

کہ موڈ نہیں ہے پھر زمان صاحب نے کہہ دیا کہ جب اُس کا دل چاہے گا اُنھ جائے گی اور جب تک جی چاہے وہ سوئے۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں پھر، بھابی کو بتا دینا۔“ یہ کہہ کر لبنی بازار چلی گئی۔

اسن کے لیے لبنی نے ایک اسٹائلش سا سوٹ لیا۔ میچنگ شوز بھی لے لیے، چھوٹی موٹی کچھ اور گھریلو ضروریات کی چیزیں لے کر وہ سبزی لے رہی تھی جب کوئی اُس کے پاس آ کر رُکا تھا۔ لبنی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں گلے مل کر زار و قطار رونے لگیں تھیں۔ حال احوال بھی نہیں پوچھا تھا حال چھپا ہوا تو نہیں تھا۔

دونوں کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنے اطراف سے بے خبر تڑپ تڑپ کر رہی تھیں۔

”بھئی بشر! نے اُن کو الگ کیا اور احساس دلایا کہ بازار میں سب لوگ اُن کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ لوگ تو اُن کے پاس آ کر پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے خیریت تو ہے نا، اُن دونوں نے بروقت خود کو سنبھالا اور آنسو صاف کر لیے۔“

”کیا ہوا ہے بہن، کوئی مر گیا ہے یا چوری وغیرہ ہو گئی ہے؟“ اُس اجنبی خاتون کی نگاہوں میں بیک وقت ترحم بھی تھا شک و شبہات بھی۔

”کچھ نہیں ہوا، پرانی سہیلیاں ہیں عرصے بعد ملی ہیں تو آبدیدہ ہو گئیں۔“

”بشر! نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو وہ عورت ناک بھوں چڑھاتی پلٹ گئی لوگوں کا مجمع بھی چھٹ گیا اور سب معمول کے مطابق اپنے کاموں میں دوبارہ منہمک ہو گئے تھے۔“

”کیسی ہو فاخرہ؟“ لبنی نے چادر کے پلو سے آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔

”کیسی ہو سکتی ہوں میں۔“ فاخرہ کی سوز میں ڈوبی

بات پر اپنی کچھ لہجوں کے لیے بس گم سی ہو گئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ناکہ تسلی و تشفی یا کسی کو دلا سہ دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے کے لیے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر مقابل کا دکھ، اُس کا صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس درد کے مداوے کے لیے لفظ بہت چھوٹے۔

”تم کیسی ہو لبتی، میں تو اپنوں کی شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ تمہیں دیکھا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ نجانے میری آزمائش کب ختم ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں۔“ عبایا میں چھپا اُس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اُس کے لہجے کا اضطراب لبتی کے دل میں گڑھ گیا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا فاخرہ، اللہ تعالیٰ کبھی بھی بندے کو اُس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، سب دوسوے اور خدشے دل سے نکال دو۔“ فاخرہ اذیت سے مسکرائی۔

”میں ہر رشتے کی مجرم ہوں لبتی، کوئی بھی مجھ سے کبھی خوش نہیں رہا حالانکہ بہت سے لوگ میری زندگی میں ایسے بھی ہیں جن کو خوش رکھنے کی کوشش میں، میں ہلکان ہو رہی ہوں۔ اپنا آپ مٹا رہی ہوں مگر میری خطائیں شاید اتنی زیادہ کہ سزا میں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے سدھارنے کے لیے بہت جتن کیے مگر میرا سفر ختم ہی نہیں ہوتا اور کوئی آس بھی نہیں کہ سفر کی تسکین بھری طوالت کے دوسرے کنارے پر کوئی سکھ، عزت، یا بچی کچھی کچھ محبت میرے حصے کی منتظر ہے۔“ اُس کی سانس پھولنے لگی۔

”میرے پاؤں اس آبلہ پائی کے سفر میں درد کی منزلیں طے کرتے تھک گئے ہیں۔ اذیت بھری مسافت نے میرا دل فگار کر ڈالا ہے۔ میں نے اب دوسروں کے ڈر خوف کو دل سے نکال دیا ہے۔ میرے بچے میری ڈھال بن جائیں تو مجھے سکھ مل جائے مگر میرا دل لرزتا ہے، یہ سوچ کر کہ اگر بچوں نے بھی میرے آگے سوال رکھ دیے تو کیا کروں گی۔ کیسے سامنا کروں

گی ان کی ملاست بھری نظروں کا۔“ فاخرہ کا دل اس سے صرف ماں کا دل بنا کر ب سے گزر رہا تھا۔

”تم فکر مت کرو، تمہاری بیٹیاں کوئی سوال نہیں کریں گی۔ وہ تمہاری درد آشنا بنیں گی۔“

”میں اب صرف ماں بن کر زندہ رہ رہی ہوں۔ میری اولاد میری مضبوطی ہے۔ لبتی تم دعا کرنا میرے حق میں کہ میں کم از کم اپنی اولاد کی نظروں میں ہی سرخرو ہو جاؤں۔ وہ ہی مجھے معتبر کر دیں، ہم کوشش کرتے ہیں مگر کبھی کبھی نتائج ہمارے ارادوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانچ پڑتال کرتے بہت سادقت گزر گیا۔ پچھتاؤں کی آگ میں جل جل کر گزار دیے اتنے سال مگر نہ ملال کم ہوا اور نہ ہی ندامت۔“

لبتی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی کزن فاخرہ کے دکھ، اذیت اور تکلیف کو دل سے محسوس کرتی تھی مگر بہت سارے معاملوں میں مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شروع شروع میں لبتی نے فرقان، زمان، رحمان اور اپنی ساس کو سمجھانے اور احساس دلانے کی کوشش کی تھی مگر سب بے سود تھا۔ اُسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اُس کی بات ماننا تو درکنار کسی نے فاخرہ کے حوالے سے اُس کی بات سننا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ پھر آخر کار لبتی نے فاخرہ کی زندگی کے سارے معاملے اللہ پر چھوڑ دیے تھے اور اپنی سسرالی فیملی کو سمجھانے کی کوشش ترک کر دی تھی کیونکہ یہ سب خدا بن گئے تھے۔ فاخرہ کی قسمت کے فیصلے خود کرنے لگے، سزا دینے لگے، سزا تجویز کرنے لگے بھول گئے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

”اچھا میں چلتی ہوں، بچوں کو پیار دینا لبتی۔“

فاخرہ نے لبتی کو سوچوں کے کھنور سے نکالا۔ دونوں بھیج بھیج کر گلے ملیں، پھر وہ چلی گئی۔ ایک وقت تھا جب وہ دونوں گہری دوست ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج ایک دوسرے کو ملنے کو ترستی تھیں۔

اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے

شرٹ اور فیروز پاجامہ ہے۔ نگوں اور موتیوں کا ہلکا ہلکا کام ہے، شوز بھی ہائی ہیل میچنگ۔“ اسن کے دکتے خوشی کے تمنا تے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے۔
 ”واہ کیا بات ہے۔ اس بار تمہاری ممانے تمہیں قناعت پر سبق نہیں پڑھایا۔“

”بس ممانے فضل خرچی کو پسند نہیں کرتیں نا اس لیے ورنہ تو وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔“
 ”خاک محبت کرتی ہیں۔ ہر وقت روک ٹوک، یہ نا کرو وہ نہ کرو، یہاں نہ بیٹھو وہاں نہ بیٹھو، میری ممانے کو دیکھو۔ کبھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جہاں دل چاہے جاتی ہوں۔ جو جی چاہے کرتی ہو، تو بھی اپنی ہر بات چاچی سے منوایا کر ضد کر کے۔“ وہ اُسے اُکسا رہی تھی۔

”میں اپنی ممانے ”ضدیں“ نہیں لگا سکتی۔“
 ”چلو ترستی رہنا ساری عمر، اچھی بو بو بن کر گزار دینا زندگی“ وہ ہاتھ جھاڑ کر بولی جیسے کہہ رہی ہو قصہ ختم۔
 ”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم کیا پہن رہی ہو؟“ اسن کی آواز میں دبا دبا جوش اور اشتیاق جھلکا۔
 ”سی گرین فراک پور دیکے کے کام والا۔“

”اچھا وہی جیسا فردا کا ریڈ ہے۔“ اسن دیوار پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکی۔

”اچھا پھر تم نے نیا سوٹ نہیں خریدا پھر۔“
 ”خریدا ہے، وہ گھر سے پہن کر جاؤں گی اور سی گرین فراک ڈانس کرتے ہوئے پہنوں گی۔“ عروہ اترائی۔
 ”اچھا یا تم اپنے فراک کے ساتھ وہ فردا کا ریڈ والا بھی ساتھ لے جانا پلیز میرے لیے۔“

”نا بابا فردا نہیں دیتی اپنی چیزیں، اور وہ فراک تو ہے بھی بہت قیمتی۔“

”مانگنے کی ضرورت بھی کیا ہے فردا سے، چوری لے آنا، پلیز میری خاطر۔“ اسن نندیدوں کی طرح بولی۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ عروہ نے احسان کرتے

ہم سے منہ زور کمالات کیا کرتے تھے خشک مٹی کو عمارات کیا کرتے تھے اے محبت یہ تیرا بخت کہ بن مول ملے ہم سے انمول جو ہیروں میں تلاش کرتے تھے اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے لہنی کی آنکھوں سے آنسو نہیں یادیں بہہ رہی تھیں۔ فاخرہ کی بے وقفی، اُس کی بے قدری پر اُس کا دل ہمیشہ کتنا تھا مگر اُس کے بس میں کیا تھا۔ اُن کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی، دکھ سکھ بانٹنا تو دور کی بات تھی۔ بہت سی یادوں کے منہ کھل گئے تھے۔
 لہنی دل گرفتہ سی گھر لوٹی تھی۔

☆.....☆.....☆

”چل معاف کر دے نا، تو میری اچھی بہن ہے نا۔“ اسن اس وقت اپنی چھت پر کھڑی عروہ کی چھت پر جھانکتے ہوئے کہا۔ شام کا وقت تھا عروہ چھت پر چار پائیاں بچھا رہی تھی۔ یہ لوگ چھت پر سوتے تھے۔ مگر عروہ نے پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا بس اپنا کام کرتی رہی۔

”عروہ سُن نا، ادھر دیکھ نا میری طرف چھکی“ اسن نے آخری لفظ دانتوں تلے دبا کر کہا۔ عروہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور ذرا سادرمیانی فاصلہ گھٹا کر اسن کے سامنے آن رُکی مگر چہرے پر غصہ نظر آ رہا تھا۔
 ”ہاں بول، کیا ہے۔“

”معاف کر دے، میں نہیں رہ سکتی نا تمہارے بنا، دوستوں میں ہنسی مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے یار! اتنا برا ماننے کی بھلا کیا تنگ ہے۔“ وہ جلدی جلدی بول گئی۔

”چل ٹھیک ہے، یہ بتا تیرا سوٹ سل گیا۔“ عروہ نے زروٹھے پن سے کہا تو اسن نے فضائی کس اُس کی طرف اچھالی۔ مقصد عروہ کا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔

”ہاں ممانے سی دیا ہے، گلابی رنگ کی لونگ

ہوئے کہا۔
 ”بہت بڑا تھینکس۔“ اسن اُس ریڈ بکے والے
 شیفون کے فرائڈ کی جھلسلا ہٹوں میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، نیہات کا ارتکاز
 ٹوٹ گیا۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ
 کوئی اور اسن کو دیکھے۔ اسنہاک سے توجہ اور پھر دلچسپی سے۔
 ”چلو اندر جاؤ رش بڑھ رہا ہے۔“ وہ ایک دم
 روکھے پھیکے انداز میں بولا۔

”ضویا، اسن چلو۔“ اب کے بار درشتی سے بھرپور
 لہجہ تھا۔

”ایک تو یہ تمہارا بھائی بھی نا، ہر وقت ڈانٹتا ہی
 رہتا ہے۔“ اسن نے منہ بگاڑا۔

”سی آر ہے نا نیہات بھائی، نمائندہ ہیں وہ؟“
 ”اپنی کلاس کے ہیں، پورے کالج کے نہیں اور
 ویسے بھی آج تو ہم کالج میں ہیں بھی نہیں۔“

”اچھا چھوڑو، آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔“
 ”تم بھی بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔“ اسن نے بھی
 ضویا کی تعریف کی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی قابل ہی
 نہیں بہت اچھے بھی تھے۔ بظاہر دیکھنے میں بھی دلکش تھے۔

ہال میں جا کر عروہ نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا
 آئینہ نکالا اور اپنا چہرہ آئینے کے سامنے کر کے آنکھیں
 پھیلا کر کبھی سکیڑ کر خود کو ہر زاویے سے دیکھا۔ آئینے
 نے جھوٹ بول کر ایک خوش فہمی اسے تھمائی کہ آج
 حسین ترین لگ رہی ہو۔ ہاں وہ معمول کے دنوں کی
 نسبت آج قدرے اچھی لگ رہی تھی مگر ایسی بھی نہیں
 کہ اس کا حسن قیامت خیز دکھائی دے رہا تھا اور دیکھنے
 والی نظر کو اسیر کر کے راہ چلتوں کو رک جانے پر مجبور
 کر دے۔ نگاہوں کو خیرہ کر دے، مبہوت کر کے ارد گرد
 سے بیگانہ کر ڈالے، مگر عروہ کی خوش گمانیوں کی کوئی حد
 نہیں تھی۔ اُس کو کم از کم اس وقت ایسا ہی لگ رہا تھا۔

نیہات ضمیر اسٹیج پر کمپیئرنگ کے فرائض انجام
 دے رہا تھا۔ اُس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ لوگ
 آ جا رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے
 تھے۔ نیہات ضمیر اپنی دل موہ لینے والی آواز میں گانا سنا

کالج بہت بڑا نہ ہونے کی وجہ سے کالج فنکشن کا
 اہتمام ایک ہوٹل کے ہال میں تھا۔ اسن اور عروہ نے
 منتیں کر کر کے فردا سے میک اپ کروایا تھا۔ فردا نے
 لاکھ خرچے کیے مگر صد شکر کہ اُن کا میک اپ کر دیا تھا اور
 جب وہ کالج کے لیے نکلنے لگیں تب فردا نے اسن کو اپنا
 پنک پاؤچ بھی دیا اور حیرت کا مقام تھا کہ بن مانگے
 ہی دیا تھا۔ اسن نے فردا کو ہونٹ سکوڑ کر یوں اشارہ دیا
 جیسے مشکور ہو کر اُسے کس کر رہی ہو۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ فردا نے کہا تو اُس نے
 چونک کر دیکھا۔

”سیلون تک۔“ فردا نے کہا تو اُن کی انکی سانسیں
 بحال ہوئیں۔

”اوہ اچھا۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 فردا کا سوٹ وہ چوری سے لے کر جا رہی تھیں فردا کے
 ساتھ فنکشن میں جانے کی وجہ سے بھانڈا پھوٹ جاتا۔
 شکر ہے خیر گزری۔

وہ ہوٹل میں داخل ہوئیں تو ہوٹل کی انٹرنس میں
 ہی نیہات ضمیر اور ضویا ضمیر کھڑے مل گئے۔ فردا پیچھے
 ہی رہ گئی تھی۔ نیہات نے گہری نظروں سے اسن کو
 دیکھا۔ گلابی لونگ شرٹ، فیروز پاجامہ، لمبے گھنے
 بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ فرنٹ سے بالوں کا
 بینڈ اسٹائل بنا رکھا تھا جس کی وجہ سے اسن کا چہرہ بہت
 معصوم لگ رہا تھا۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی مگر پُرکشش
 تھی اور کم عمری کی سحر انگیز نو خیزی توجہ کھینچ لیتی تھی نیہات
 محویت سے اُسے تکتا رہا، وہ متوجہ نہیں تھی۔ ضویا سے
 باتوں میں ملن تھی، ہنسی مسکراتی، اٹھلاتی، دوپٹہ کندھے
 پر جھول رہا تھا۔

رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے سیل فون سے اُس کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ ہر چہرہ جوش و خروش سے تہمتا رہا تھا۔ جب گانا ختم ہوا تو بے تحاشا تالیاں بجا کر اُسے داد دی گئی۔

پھر بہت سارے آئیٹم ہوئے، ڈرامے ہوئے پھر نیہات نے امن اور عروہ کا نام اناؤنس کیا ڈانس کے لیے اور کس دل سے جلتے کڑھتے لیا یہ صرف وہی جانتا تھا یا اُس کا دل۔ گوکہ باہر کے لوگ چند ایک ہی تھے پھر بھی اتنے لوگوں کے سامنے امن کو عجیب جھجک مانع آ رہی تھی۔ مرد اساتذہ نہیں تھے صرف فی سیل ٹیچرز ہی تھیں۔ یہ سوچ کر امن نے خود کو تسلی بھری تھکی دی۔

میوزک شروع ہوا تو انہوں نے بہت مہارت سے ڈانس کیا۔ کہیں بھی سر اور تال کو اپنے اسٹیپ سے اوپر نیچے ادھر ادھر نہیں ہونے دیا۔ ردھم کے ساتھ ایک ساتھ ایک جیسا ناچتی رہیں۔ ہال سے اُٹھ اُٹھ کر گرلز اور بوائز سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہونٹوں اور ہاتھوں کی مدد سے ہوائی بو سے اُچھال رہے تھے۔ بوائز اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر تھرک رہے تھے اور نیہات ضمیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امن کو کہیں غائب کر دے۔ ان لڑکوں کی نظروں سے کہیں دور چھپا دے یا پھر خود کہیں روپوش ہو جائے۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں، وہ کپیسر تھا۔ اسٹیج پر رہنا اُس کی مجبوری تھی۔ اسی سٹیج پر سوچ کر وہ وہاں سے خود کو ہٹا نہیں سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبا اور فضا کا زیادہ وقت فاخرہ جیس کے ساتھ گزرا تھا۔ صبا چھوٹی تھی تو فاخرہ اُسے اپنے ساتھ اسکول لے جاتی تھی۔ صحت مند بڑی بڑی آنکھوں والی صبا دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ حالہ اماں فاخرہ کو خود اسکول چھوڑ کر جاتی اور چھٹی سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اسکول کے آگے آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ چھٹی ہوتی تو فاخرہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورتی

واپسی کی راہ لیتی۔

فاخرہ نے اسکول کے اندر ایک پٹی صبا کو سنبھالنے کے لیے رکھی ہوئی تھی جو کہ چوکیدار نے ڈھونڈ کے دی تھی۔ فاخرہ کے اسکول کی ساری ٹیچرز صبا سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ بھی تو بہت پیاری، میدے جیسی رنگت، نرم و ملائم صبا کے بعد فضا کی ذمہ داری بھی فاخرہ نے اٹھالی۔ دونوں بچیاں چونکہ سارا وقت ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس وجہ سے ماں سے لگاؤ اور گہری انسیت ایک تو فطری عمل تھا اور دوسری بات اور تھا بھی کون جو اُن کو اپنے قریب رکھتا، اُن کا خیال کرتا۔ ددھیال میں صرف دو چاچو تھے، جو زمان کی فاخرہ سے شادی کے بعد باری باری بھانے بنا کر گھر چھوڑ گئے تھے۔ اُن کو فاخرہ کا وجود گوارا نہیں تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ فاخرہ جیسی بے حیا عورت کے ساتھ رہ کر اُن کی بیویاں اور پھر اُن کی بیٹیاں بگڑ جائیں گی۔ وہ جو پہلے ہی اپنے اندھے ناکارہ بھائی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ اُن کو زمان کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ فارغ بیٹھے نکلے، ناکارہ مرد کو کما کر کھانا اُن کو عذاب لگتا تھا۔ وہ بات بے بات اُسے جھڑک دیتے تھے۔ اُن کی نظر میں زمان جیسے ادھورے مرد کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جو گھر میں بے کار پرزے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ جو کسی کام کا نہیں تھا۔ ماں زمان کے کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا خیال رکھتی تھی۔ ایسے میں فاخرہ کا زمان کی زندگی میں آنا سب کی خلاصی کا بہانہ بن گیا۔ زمین جا سیدا وہ پہلے ہی دھوکے سے اپنے نام لکھوا چکے تھے۔ فرقان کا جنرل اسٹور تھا جبکہ رحمان کی سونے کی دکان تھی۔ دونوں بھائیوں کا چلتا ہوا کاروبار تھا مگر دونوں کو ہی زمان کی تین وقت کی روٹی بھاری معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی بیویاں بھی ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر دونوں ماں بیٹے کو کھانا دیتی تھیں۔ لہٰذا تو پھر بھی اچھی فطرت کی تھی مگر عائشہ تو کسی اور کا وجود برداشت

ہی نہیں کرتی تھی۔ اُسے اپنی ساس اور زمان کا وجود بھی کسی خار کی طرح چھٹتا تھا۔

فاخرہ کا آنا اُن کی گلو خلاصی کروا گیا۔ دونوں چلے گئے کچھ ماہ کرائے پر رہے پھر ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے گھر بنوائے اور شان سے رہنے لگے۔

فاخرہ ایم اے پاس سرکاری ٹیچر تھی۔ گوری چٹی اونچی لمبی، ریلے ہونٹ، لمبے حسین چمکتے بال، وہ گلاب سے گلابی نازک بدن والی لڑکی اپنی ایک خطا کے عوض زمان کی جھولی میں پھینک دی گئی۔

وہ جو حسن میں یکتا تھی۔ خاندان کے سارے لڑکے اُس پر فدا تھے۔ سیکڑوں اُسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے خواہاں تھے۔ وہی باکمال لڑکی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر بے اعتبار ہو گئی، نامعتبر ٹھہرائی گئی، معتبوب ٹھہرا دی گئی اور اُس کے نتیجے میں فاخرہ جیس کی شادی زمان سے ہو گئی۔ انمول ہیرا بے مول ہو گیا۔ بے قیمت ہو گئی وہ، اُس کا معیار گر گیا پھر کیا بھاؤ لگتے اُس کے۔ کوئی مول تول کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اتنی ارزاں اور حقیر ہو گئی فاخرہ جیس کے رل گئی۔

سہاگ رات کو زمان کبھی رونے لگتا کبھی ہنسنے لگ جاتا۔ کبھی فاخرہ کی سنی سنائی تعریفیں کرتا، کبھی اُس کی سیاہ بنختی پر رونے لگتا کہ اُس جیسی مکمل لڑکی نامکمل مرد کے پلے باندھ دی گئی۔

پورے خاندان میں فاخرہ جیس کی قابلیت کے جے پے تھے۔ سب اُس کے حسن کے گن گاتے تھے جو زمان نے بھی سن رکھے تھے، واقف تھا مگر جہاں سب فاخرہ کے خواب دیکھتے تھے، فاخرہ کو پالنے کے تمنائی تھے۔ وہاں رحمان بھی اُس پر فریفتہ تھا مگر فاخرہ کسی کو بھی گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔

زمان نے تو کبھی اپنی بے نور آنکھوں میں اتنا مہنگا خواب سجانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ ادھورا تھا پھر اتنا مکمل پینا کیسے پرونے کی جسارت کر سکتا تھا اور

وہ بن مائے تعبیر بن کر اُس کے من آگن میں اتر آئی تھی۔ پڑھی لکھی برسر روزگار فاخرہ جیس۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خالہ اماں اور زمان اُسے دل سے قبول کرتے مگر انہوں نے بھی اُسے دھتکارنا اور ذہنی اذیت دینا شروع کر دیا۔ جسمانی طور پر بھی خالہ اماں اُسے اذیت دینے سے باز نہیں آتی تھیں۔ زمان بھی اپنی لامٹھی سے اکثر اُسے پیٹ ڈالتا تھا۔ رات کے پُر کیف، سرور انگیز لمحوں میں کبھی کبھی زمان 'عاشق' بن جاتا تھا اور کبھی اک اُن دیکھی ہستی کا 'رقیب' بن کر فرخندہ کو بے عزت بھی کرتا تھا۔ اُس کے تیور بگڑ جاتے، چہرہ مزید بد صورت و کریمہ نظر آنے لگتا پھر وہ فاخرہ کے وجود کی دھجیاں اڑانے لگتا۔ اُسے جسمانی اذیتیں دیتا۔ وحشت زدہ ہو کر اُسے بھنبھوڑ ڈالتا، بھڑک اٹھتا۔ طوفان اٹھا دیتا۔ جو ہاتھ میں آتا فاخرہ کو مار دیتا، اپنا غصہ، اپنی ناکامی اپنا سارا زہر نکال کر فاخرہ کے بدن میں انڈیل دیتا۔ وہ ساری رات روتی رہتی، تڑپتی رہتی۔ سب کم ظرف تھے، سب اُس کا 'صبر' آزمانے پر تل گئے تھے۔

فاخرہ جیس اس رشتے کو نبھاتے ہوئے پل صراط پر سے گزر رہی تھی۔ وہ پل پل سلگتی، تڑپتی، جھپتی اور مرتی تھی۔ اُس کے اندر تپش، ٹھٹھن، جس، آگ بڑھتی جا رہی تھی۔

زمان ساری تنخواہ اُس کے ہاتھ سے لے لیتا تھا اور فاخرہ اپنی ضرورتوں کے لیے پیسے زمان سے مانگا کرتی۔ وہ سب فاخرہ کو بلیک میل کر رہے تھے، خوار کر رہے تھے۔ اُس کی عزت نفس تار تار ہو چکی تھی۔ کہیں امان نہیں تھی، کہیں آسودگی نہیں تھی۔ وہ خود کا کر بھی خالی ہاتھ رہ جاتی تھی۔ کیسی بے سروسامانی تھی، کیسے بے آسرا ہوئی تھی وہ۔ میکے والے منہ موڑ چکے تھے اور اب تو شہر ہی چھوڑ گئے تھے مگر فاخرہ کو تنہا الاؤ میں پھینک گئے تھے، جہاں وہ رات دن جلتی تھی، کٹتی

مرتی تھی مگر زندہ تھی۔

زندگی میں جب برا ہوتا ہے تو پھر ہوتا چلا جاتا

ہے، پے در پے صدمات انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ مگر
فاخرہ اپنی اولاد کے کسی بھی معاملے میں کوئی کوتاہی و
لا پرواہی نہیں برتنا چاہتی تھی۔ زمان اور خالہ اماں سے
مایوس ہو کر اُس نے اپنی تمام توجہ اور محبت صبا پر لگادی،
پھر فضا آگئی۔ فاخرہ اُن پھول سی بچیوں کو دیکھ دیکھ کر
جینے لگی۔ اب زمان اُسے جتنی بھی لفظوں کی مار مارتا،
کتنا ہی پیٹ ڈالتا وہ اپنی بیٹیوں کے لیے اپنی ساری
اذیت بھول جاتی۔ فضا اور صبا میں بالترتیب ایک سال
کا وقفہ تھا۔

جب بھی لبتی یا عائشہ کے میکے سے عیدی آتی تھی تو
خالہ اماں اسپیشلی صبا اور فضا کو ساتھ لے کر اُن کے گھر
جاتی تھیں اور وہاں سے آنے کے بعد صبا اور فضا سو سو
سوال کرتیں۔

”ممانا ابو کہاں ہیں۔ ہمارے ماموں، ہماری
نانو کہاں ہیں۔ ہماری عیدی کیوں نہیں آتی؟“ اُن
کے تجسس میں ڈوبے سوال فاخرہ کے اندر بے چینی،
اضطراب اور کڑواہٹ بھر دیتے۔

”عائشہ چاچی کی امی نے اتنے سارے سوٹ
بھجوائے ہیں۔ فروا آپلی اور عروہ آپلی کے لیے بھی
سوٹ، جوتے، کچر، پونیاں بھی بھجوائی ہیں۔“

”بتائیں نا ماما آپ کو نانو عیدی کیوں نہیں
بھجواتیں۔ ہماری نانو کہاں ہیں؟“ صبا پوچھتی تو فاخرہ
کا دل جیسے کوئی کند چھری سے کاٹا رہتا۔ اُسے اپنی
سانسیں بوجھ لگنے لگتیں۔ وہ بے بسی سے اپنی بیٹی کو
دیکھتی رہتی۔ بے بسی کا دبیز احساس فاخرہ کو کچھ کے لگاتا
رہتا۔ اپنوں کی بے اعتباری، بے اعتنائی اور لا پرواہی
نے اُسے یہ دن دکھائے تھے۔ وہ قسمت پر شا کر رہنے
والی اب شا کی رہنے لگی۔ اللہ سے شکوہ کرنے لگی، گلہ
کرنے لگی۔ زندگی نے اُسے کس دوراے پر لاکھڑا کیا
تھا۔ ہر دن نئی تکلیف ہر دن نیا سوال۔

پھر صبا آگئی۔ فاخرہ کے بے قرار دل کو قرار آ گیا
۔ وہ بہل گئی، سنبھل گئی، جینے لگی۔ صبا تھی بھی تو من
مونی سی، بالکل فاخرہ کی طرح۔ تب فاخرہ نے اپنے
اندر توانائی جمع کی اپنی بیٹی کے لیے۔ اب وہ ایک ماں
تھی اُسے اپنی بیٹی کے لیے جینا تھا۔ شاید اُس کے بچے
اُس کا یقین بن جائیں، سہارا بن جائیں۔

صبا کے لیے اسکول کے اندر چوکیدار نے کسی بے
آسرا بچی کا انتظام کر دیا تھا، صبا کو سنبھالنے کے لیے اور
وہ بچی یتیم تھی۔ فاخرہ کو وہ بہت اچھی لگنے لگی تھی مگر وہ
اُسے خالہ اماں کی وجہ سے اپنے گھر لے کر نہیں آ سکتی
تھی، ورنہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُس بچی کو پڑھائے
لکھائے، آسرا دے، پناہ دے مگر وہ تو خود بے اماں
تھی، کمزور تھی، اُس کی قسمت کے فیصلے تو خود دوسروں
کے ہاتھ میں تھے۔ پھر وہ کسی اور کی قسمت بدلنے کا
ارادہ کیسے باندھ سکتی تھی۔ جب یقین ہی نہیں تھا کہ وہ
ان ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا بھی سکے گی۔

”لوگوں نے اپنی اپنی زندگیوں میں کیا کیا کھل
نہیں کھلائے اور میں نے ایسا کیا کر دیا جس کی سزا
ساری زندگی بھگتنی پڑے گی۔ زمان اور خالہ میرا جینا
حرام کیے رکھتے ہیں۔ آخر کب میری سچائی پر لوگ
یقین کریں گے۔ کب تک مجھے بہتان تراشیوں اور
تمہتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ فاخرہ ہر روز اپنا محاسبہ
کرتی روز زندگی کے لمحے شمار کرتی۔ آسودگی کم اور
اذیتیں زیادہ جمع ہو جاتیں، وہ روز جوڑ توڑ کرتی مگر
حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔

”تمام عمر لوگ گناہوں کی دلدل میں دھنسنے رہتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے عیوب کو اپنی رحمتوں کی
چادر سے ڈھانپے رہتا ہے۔ وہ لوگ زمانے میں قابل
عزت بن کر شاہانہ زندگی گزار دیتے ہیں۔“ وہ تمام دن
گلوحتی رہتی سُلکتی رہتی۔

وہ صبا کو کیا جواب دے کر مطمئن کرتی، جھوٹ کا پلندہ یا سچ، جھوٹ بولنے سے وقتی طور پر تو وہ مان جاتی یقین کر لیتی مگر زندگی میں کبھی فاخرہ کا جھوٹ کھلنے پر اُس کا رد عمل کیا ہوتا۔ کیسی بے یقینی صبا کی آنکھوں میں ٹھہر جاتی۔ فاخرہ بھر بھری سی لیتی، نہیں وہ سب کی بے یقینی و بے اعتباری سب کئی مگر وہ اپنی اولاد کی نظروں میں بے اعتبار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ہر ماں اپنی اولاد کی بے یقینی سے ڈرتی ہے۔ سوال کرنے سے ڈرتی ہے۔ ایسے سوال جن کا جواب اُن کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر فاخرہ سچ بتا دیتی تو پھر صبا کے معصوم ننھے سے ذہن میں ہزاروں سوال اور اُگ آتے اور فاخرہ ٹال مٹول سے کام لیے جاتی، بس آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی۔

لبنی فاخرہ کی کزن تھی اور دوست بھی رہی تھی اس لیے کبھی کبھار چوری چھپے فاخرہ کو فون کر لیتی، تب فاخرہ بھی اپنے دکھ سکھ اُس سے بانٹ لیتی تھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔

صبا اور فضا کی اسکو لنگ کی وجہ سے اُن کے دل میں ابھرتے کئی نو کیلے سوال وقتی طور پر دب گئے تھے۔ فاخرہ نے اپنی طرف سے کوشش کی کہ دوبارہ صبا فضا کو اپنے چاچو لوگوں کے گھر نہ جانے دے۔ عائشہ اور رحمان اس طرح تو اُس کی بچیوں کا ذہن اور زہر آلود کر دیں گے۔ ان میں شکوک و شبہات اور بدگمانیاں بھر دیں گے اور ایک دن اُس کی اپنی اولاد ہی اُس کی مخالف بن کر اُس کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

فضا اور صبا کا ذہن بٹ جائے، اُن کے خیالات بکھر جائیں۔ ایسا فاخرہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اب وہ خالہ اماں کے سامنے اکڑنے لگی تھی۔ ضد کرنے لگی تھی اپنی بچیوں کے لیے۔ جب جب وہ صبا اور فضا کو رحمان یا فرقان کے گھر لے کر جانا چاہتی تھی۔ تب فاخرہ تن جاتی۔ اُن کو جانے نہیں دیتی تھی۔ بدلے میں خالہ اُسے مار مار کر ادھ موا کر دیتیں مگر فاخرہ

اس معاملے میں خالہ کو اپنی من مانی نہیں کرنے دیتی تھی۔ لبنی اور عائشہ نے کبھی اپنی ساس کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اور وہ خبیث عورت سارے بدلے فاخرہ سے ہی لے رہی تھی۔ چار چوٹ کی مار دیتی تھی بات بے بات اُسے طلاق کی دھمکی دی جاتی تھی۔

پھر خالہ اماں نے فاخرہ کی رُکھوالی کے لیے ایک عورت رکھ لی۔ بشیراں اب کسی سائے کی مانند اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ فاخرہ کی تنخواہ سے ہی بشیراں کو تنخواہ دی جاتی تھی۔

اسی دوران اسوہ اور پھر اسد دنیا میں آ گئے تھے۔ بشیراں نے جب فاخرہ کے حالات زندگی دیکھے تو اُس کی تمام تر ہمدردیاں فاخرہ کے ساتھ ہو گئیں۔ وہ اُس کی خیر خواہ تھی۔ اُسے بہت ترس آتا فاخرہ پر اور ایسی بے جوڑ شادی پر وہ کفِ افسوس ملتی رہتی۔

صبا آنکھوں کے پیپر زدینے والی تھی، فضا ساتویں میں جبکہ اسوہ ابھی چوتھی کلاس میں تھی۔ تینوں بہنیں ہی اپنی ماں کے ساتھ بہت ایچ تھیں۔ احساس کرنے والی حساس بچیاں تھیں۔ تابعدار بھی تھیں۔ مگر اسد کبھی کبھی اکھڑ پن اور بدتمیزی کا مظاہرہ کر جاتا تھا۔ دادی اُس کا ذہن خراب کر رہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا۔ فاخرہ نے فجر کی نماز کے بعد واشنگ مشین لگالی تھی پھر ناشتا بنانے لگی۔ زمان کے لیے دودھ والا دلیہ بنانا تھا۔ آج کل زمان کا پیٹ خراب رہنے لگا تھا۔ فاخرہ نے براٹھے بنائے، رات کا سالن گرم کیا پھر چائے بنانے لگی۔ تبھی باہر واشنگ مشین کی سیٹی بجی تھی۔ فاخرہ نے برز کی آنچ ہلکی کی اور چھوٹے سے صحن میں نکل آئی۔ واشنگ مشین سے کپڑے نکال رہی تھی۔ تبھی اُس کی چھٹا کا زور کا جھٹکا لگا۔ فاخرہ بروقت سنبھلی اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر اُس کو موقع نہیں دیا گیا۔ اس بار کا جھٹکا شدید تھا اتنا شدید کہ وہ اگلے ہی پل زمین پر گر پڑی۔ ایک اسی

سالہ بوڑھی عورت کی نفرت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ جب جی چاہے چھتیس سالہ فاخرہ کو روئی کی مانند دھنک دیتی تھی، پیچ دیتی تھی، گرا دیتی تھی۔ فاخرہ نیچے گری زمین کا حصہ بن رہی تھی۔ دھول مٹی جیسی، بے توقیر کم مایہ۔

”ساری چائے اُبل گئی۔ چولہا خراب ہو گیا۔ اندھی ہے کیا۔“ اُس نے فاخرہ کے پیٹ پر لات ماری، اس سے پہلے کہ فاخرہ اپنا بچاؤ کرتی فضا، صبا اور اسوہ نے آ کر اپنی داد کو پکڑ لیا تھا۔ خالہ اماں کی درد ناک چیخیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ تینوں بچیوں نے اپنی داد کو زمین پر گرایا ہوا تھا اور دانتوں اور ناخنوں سے اُسے کاٹ رہی تھیں۔ چنگیاں کاٹ رہی تھیں۔ خالہ اماں داویلا بچا رہی تھی۔ فاخرہ زمین سے اٹھی تو کچھ لمحے تو وہ شاک کی کیفیت میں یہ منظر دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر خالہ کو اُن کے چنگل سے آزاد کر دیا۔

”ہائے میرے ربا، مجھے کھا گئیں چڑیلیں، میرا خون نکال دیا، جیسی ماں حرافہ ویسی ہی چندالیں ہیں۔ یہ حرام زادیاں۔“ خالہ اماں اپنے بازوؤں کو دیکھ کر رو دی، دانت کھبے ہوئے تھے اُن کی سوکھی کلاسیوں میں۔ خون بھی رس رہا تھا۔ وہ صحن میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی، کوئے نے بددعائیں دینے لگی۔

”اب پتا چلا کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“ تینوں بہنوں نے زبانیں نکال کر داد کو چڑایا اور اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔ فاخرہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ خوش ہوتی یا مغموم اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

مگر آج پہلی بار اُس نے اپنے اندر ڈھیروں اطمینان اُترتا دیکھا وہ اکیلی نہیں تھی کوئی اُس کا تھا اُس کو بچانے والا، اُس کا اپنا۔ فاخرہ تو عادی ہو چکی تھی۔ مار کھانے کی یا شاید ڈھیٹ بھی، یا پھر اذیت پسند۔

خالہ اماں فاخرہ کو اور اس کی بیٹیوں کو گالیاں دیتی رہیں۔ برا بھلا کہتی رہی مگر وہ اتنی بے دم ہو چکی تھی۔ اس وقت کہ دوبارہ اُس نے فاخرہ پر جھپٹنے کی کوشش

نہیں کی اور بکیتی جھکی اُنھہ کر اندر زمان کے پاس چلی گئی۔ فاخرہ نے کپڑے دھو کر تار پر پھیلائے اور کپڑے مشین میں ڈال کر پھر پکن میں آگئی اور دلیہ بنانے لگی پھر دلیہ کی بھاپ نکال کر اُسے ٹھنڈا کر کے پلیٹ میں ڈال کر فاخرہ زمان کو دینے گئی تو خالہ اماں اُس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، جلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”زمان دلیہ کھاؤں۔“ فاخرہ نے پاس بیٹھ کر کہا۔

”نہیں مجھے نہیں کھانا۔“ وہ ساٹھ سال کا تھا آج کل اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔

”کیوں نہیں کھانا۔“

”بچیوں نے اماں سے اتنی بدتمیزی کی، اُن کو کاٹ ڈالا اور تم چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں۔“ اُس نے ہاتھ ادھر ادھر مار کر اپنی لائٹھی ٹولی اور انداز سے سے فاخرہ کو ماری اُس کی کمر میں لگی۔ ایک زوردار آہ بلند ہوئی اور کمرے کی فضا میں گم ہو گئی۔

”دفع ہو جا یہاں سے بدکردار عورت، گندگی کی پوٹ، نظروں سے دور ہو جا۔“ وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

”زمان تمہیں میں کون سا نظر آتی ہوں جو تمہاری نظر سے دور ہو جاؤں۔“

”مجھے اندھا ہونے کا طعنہ دیتی ہے نا گھٹیا عورت، جادفع ہو جا۔“ اُس قابل بھی نہیں تھی کہ تجھے کوئی اندھا لولا لنگڑا بھی قبول کر لیتا۔“

”کون جانے زمان، کون کس کے قابل تھا۔ یہ تو وقت کے ہیر پھیر ہیں۔ تقدیر کے فیصلے تھے یا اپنوں کی ستم ظریفی کہ آج میں ان حالوں میں ہوں۔“ وہ دکھ سے ہنسی ایسی ہنسی جیسے بہت سے کانچ ایک ساتھ ٹوٹے ہوں۔

”اب تیری زبان بھی چلنے لگی ہے بدتمیز عورت۔“

بھول رہی ہو کہ شوہر کا اسلام میں کیا مقام ہے۔“

(اس خوب صورت ناولٹ کی اگلی قسط ماہ مئی میں ملاحظہ فرمائیں)

وقت کے اس کھیل میں

آنے والا وقت کیا دکھانے والا ہے یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ بات کچھ ایسی تھی کہ کسی سے رائے مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کیوں کہ ذات اور بدنامی اپنی ہی تھی۔ ہمیشہ بیٹی کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور شوہر کو ہر بات سے اعلم رکھا تھا کیوں کہ انہیں اچھی طرح.....

رشتوں کو یقین اور اعتماد دیتا ایک افسانہ

والی لکڑیوں کا حال آپ دیکھ رہی ہیں سارا گھر دھوئیں سے بھر جائے گا لیکن وہ لکڑیاں آگ نہیں پکڑے گی۔ نہ بابا میں باز آئی ان گیلی لکڑیوں سے۔ ہمارے ملک میں کبھی بجلی کی لوڈ شیڈنگ، کبھی گیس کی پتا نہیں ان مسائل سے کب پاکستان کو چھٹکارے ملے گا۔ صالحہ بیگم نے جب دیکھا کہ ان کی ضدی اور ہٹ دھرم بیٹی بس سے مس نہیں ہوئی ہے بلکہ بجائے ناشتے کہ اس نے ایک طویل تقریریں ماں کو سنا ڈالی۔ لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ بالا آخر خود ہی کچن میں کھس کر چولہا سیدھا کیا تھوڑی ہی دیر میں انہیں پتا چل گیا کہ برسات سے بھٹکی ہوئی لکڑیاں خود تو جل نہیں رہی ہاں البتہ ان کا خون ضرور جلا رہی ہیں۔

صالحہ بیگم اور فیاض الدین کی اکلوتی اولاد ماہ روکانی منتوں مرادوں بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ کبھی بھی اسم باکسی، انتہائی خوش شکل اور جازب نظر۔ فیاض احمد بیٹی کو دل و جان سے چاہتے تھے لیکن بے جالا ڈ پیار کے خلاف تھے جبکہ صالحہ بیگم نے اسے سرچڑھا رکھا تھا۔ باپ کے سامنے تو ماہ روڈری سہی

رات پھر موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ جھلسا دینے والی گرمیوں کے بعد وقفے وقفے سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا امیر اور با حثیت لوگ تو اس سہانی رات کو خوب انجوائے کر رہے تھے مزے لوٹ رہے تھے جبکہ غریبوں کی جانوں پر بی ہوئی تھی کچے اور خستہ حال گھروں کی چھتوں نہ صرف ٹپک رہی تھیں بلکہ اب تو زار و قطار رو رہی تھی۔ صالحہ بیگم نے باروچی خانے کے سارے برتن نکال کر اس جگہ رکھ دیے جہاں بارش نے نقب لگائی تھی۔ برتنوں کی دکان لگانے کے بعد انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی ماہ رو کو آواز لگائی۔ ”ارے ماہا اٹھ جا بیٹے تیرے ابو باہر محن سے پانی نکال رہے ہیں آتے ہی ناشتہ مانگے گے تمہیں پتا ہے وہ تاخیر برداشت نہیں کرتے ہیں۔ میں اگر کچن کے کاموں میں مصروف ہو گئی تو اور حشر خراب ہو جائے گا۔ اٹھ جا میری چاند اور جلدی سے ناشتہ بنا لے۔“ ماہ رو نے گرم لحاف میں منہ چھپاتے ہوئے منمنائی آواز میں کہا۔

نہ اماں نہ، میں تو آج بستر سے نہیں نکلنے والی۔ آج تو آپ کو ہی مجھے اور بابا کو ناشتہ کروانا ہوگا۔ ویسے ہی پچھلے دو دن سے گیس غائب ہے چولہے میں جلنے

رہتی تھی لیکن ماں کے سر پر سوار ہو کر اپنی ہر اچھی بری بے جا بات منوا کر ہی دم لیتی تھی۔

جب تک بچپن کا دور دورہ تھا۔ صالحہ بیگم بغیر کسی عذرو جھٹ کے اس کی ہر ضد ہر ہٹ پوری کر کے خوشی محسوس کرتی تھیں لیکن اب تو خیر سے وہ بی اے فاضل میں تھی لیکن مزاج میں ابھی تک ضد اور سرکش تھی دوسرے ماں کا لاڈ و پیار اور اس پر طرہ امتیاز ہمارا میڈیا جو نو جوان نسل کے لیے زہر کا دلدل بنا ہوا ہے۔ فلم اشارز، سنگرز، کرلٹ پلیئر ہمای نئی نسل کے خوابوں خیالوں بلکہ ان کی سانسوں میں لپٹے ہوئے ہیں پڑوس کی ہنڈیا تو ہمارے بچوں کو ایسی چھٹی اور مزیدار لگتی ہے کہ لڑکے اگر ایٹور یا اور کرینہ کے حسن و جمال پر فدا ہیں تو لڑکیاں سلمان اور شاہ رخ کے کسرتی اور متناسب جسم و جاں پر فریفتہ ہیں۔ گھر کے بڑوں کا غلط رویہ اور منفی طرز فکر اس چیز کو اور ہوا دے رہی ہے۔ اماں ابا بذات خود اس کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی شاہ رخ اور ابراہیم کی اداؤں پر جان دیتی ہے

اور بیٹے پر یا نکا اور کترینا کے عشق میں گرفتار ہیں۔۔۔ احمقوں کی اس جنت میں غیر تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے باشعور افراد بھی شامل ہیں نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نئی پیڑھی ان کی بول چال، اٹھنا بیٹھنا، لباس، ہیئر اسٹائل کی تو پوری پوری کاپی کرتے ہیں لیکن کبھی ان کی لگن انتھک محنت اور جان لیوا شفقت پر ایک نظر نہیں ڈالتے۔ یہ نہیں سوچتے کہ دولت اور شہرت انہیں یوں ہی نہیں ملی بلکہ ان لوگوں نے اپنے آرام کو اپنے آپ پر حرام کیا تب جا کر بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی ہے اور دھن دولت کی بارش ہوئی ہے۔

فیاض الدین اور صالحہ بیگم کی لاڈلی بھی کیسل پر شاہ رخ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر ایسی دیوانی ہوئی کہ اسے چلتے پھرتے، جاگتے سوتے، ہر سو کنگ خان ہی نظر آنے لگے۔ اور پھر کالج جاتے ہوئے محلے کہ ایک نو جوان پر نظر پڑی تو اس میں اسے اپنے پسندیدہ اشار کا عکس نظر آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قہمی فلم انڈسٹری سے اس کے خوابوں کا شہزادہ اڑ کر اس کے پاس چلا آیا ہے اور بس



یہیں سے اوائل عمری کے اس اقمعانہ عشق کی شروعات ہو گئی اور جب صالحہ بیگم کو بیٹی کے اس کارنامے کا پتا چلا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ان کی روح فنا ہو گئی۔ کیوں کہ بیٹی کی پسند اور کوئی نہیں محلے کا ناکارہ ٹکھٹونو جوان شاہنواز عرف شانو تھا۔ جو شاہ رخ کی حرکات و سکنات کی نقل کرتے کرتے اپنے آپ کو شاہ رخ خان سمجھنے لگا تھا جس کے پاس تعلیم کے نام پر صرف میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا جب تک باپ کی کمائی رہی عیاشیاں ہوتی رہی جب باپ دنیا سے سدھارے اور اپنی کی کمائی کا وقت آیا تو گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ ماں کی سلائی و کشیدہ کاری کی کمائی اور بہن کی پرائیویٹ اسکول کی چھوٹی موٹی تنخواہ کا سہارا نہ ہوتا تو شاہ رخ کے اس ڈپلکیٹ کو دن میں تارے نظر آ جاتے۔ بیوہ ماں اور جوان بہن کے ساتھ ہمیشہ دانستہ کل۔ کل ہوتی لیکن اس کے کان پر جوں بھی نہ رہتگی۔ جسم کی ہڈیاں اتنی آرام طلب ہو گئی تھیں کہ کام کے نام سے جان جانے لگتی۔ دور جدید کی لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہر کی شکل و صورت کے بعد میں دیکھتی ہیں اور جیب پر پہلے نظر ڈالتی ہیں لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا ماہ رو پر روز روشن کی طرح شالو کے حالات عیاں تھے لیکن اس کے باوجود وہ جیتی جاگتی مکھی نگلنے کو تیار تھی کیوں کہ شانو اس کے لیے شانو نہیں بلکہ شاہ رخ خان تھا۔

دونوں ماں بیٹی کی اس معاملے پر کئی بار تلخ کلامی ہوئی۔ صالحہ بیگم نے تو پہلے اپنی بیٹی کو اس کے باپ کا خوف دلایا کہ وہ کسی بھی قیمت پر شانو جیسے لفنگے کا رشتہ قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی خاندان کے دوسرے افراد کے لیے یہ رشتہ قابل قبول ہوگا اس کے علاوہ انہوں نے بیٹی کو اونچ نیچ اچھے برے سے آگاہ کیا۔ اسے سمجھایا کہ حسن و عشق کے ڈرامے کہانیوں اور ناولوں اور افسانوں میں تو بہت اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دنیا ایک سنگین حقیقت ہے کوئی سنہرا خواب نہیں۔ تصورات اور سپنوں کے سہارے کوئی

کام نہیں ہوتا جب شادی کے بعد زندگی کے ٹھوس حقائق سے واسطہ پڑے گا تو بولتی بند ہو جائے گی۔ شانو آج تک اپنی ماں اور بہن کے لیے کچھ کرنے سکا تو زندگی بھر تیرا کیا پارا اٹھائے گا۔ وہ صرف تجھے سبز باغ دکھا رہا ہے۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بہلا رہا ہے ماں بہن کی کمائی پر زندگی گزارنے والا بھلا بیوی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ ماہ رو نے ماں کی ساری سخت سستی لیکن پھر بھی بس اس کا ایک ہی جواب ہوتا شادی کروں گی تو صرف شانو سے کیوں کیوں کہ وہ ہنستا ہے تو شاہ رخ کی طرح مسکراتا ہے، شاہ رخ کی طرح چلتا پھرتا ہے، بلکہ بولتا بھی شاہ رخ کی طرح ہکلا ہکلا کر ہی ہے۔ صالحہ بیگم بیٹی کا یہ سودائی پن دیکھ کر دل تھام کر رہ جائیں تفکرات اور اندیشوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔

آنے والا وقت کیا دکھانے والا ہے یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ بات کچھ ایسی تھی کہ کسی سے رائے مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھیں کیوں کہ ذلت اور بد نامی اپنی ہی تھی۔ ہمیشہ بیٹی کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور شوہر کو ہر بات سے لاعلم رکھا تھا کیوں کہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ فیاض الدین کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑی تو الٹی آنتیں گلے میں پڑے گی۔ چور کے گھر چوری ہو جائے تو با آواز بلند رو بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح صالحہ بیگم بھی زبان اور ہونٹ سی کر بیٹھ گئی تھیں۔ اگر ماہ رو کے رشتے کے سلسلے میں کوئی بات بھی کرتا تو بڑی صفائی سے یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ ہماری بیٹی کا ارادہ ماسرز کرنے کا ہے ابھی شادی کا کوئی خیال نہیں اس کا ارادہ ہے کہ ملازمت حاصل کرنے کے بعد شادی کرے گی۔ بات کرنے والا اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا لیکن آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا۔ صالحہ بیگم کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی اس وقت بجی جب فیاض الدین نے کراچی سے آ کر انہیں بتایا کہ ان کے مرحوم دوست نواز احمد کی بیگم نے اپنے

ایک اذیت ناک عذاب سے دو چار تھیں۔ اسٹریس کی وجہ سے بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

ماہ روکالچ سے گھر آئی تو صالحہ بیگم نے اسے یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ شانو کے گھر چوری ہو گئی ہے چور ساری جمع پونجی لے گیا اور سب ہاتھ ملتے رہ گئے، ماہ رو سکتے میں رہ گئی۔ کیوں کہ شانو کے گھر کے حالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے بلکہ فی الوقت تو اس کے گھر چور ہوں نے بھی فارغ خطی لے کر دوسرے گھروں کا رخ کر لیا تھا۔ پھر بھلا چور کو اس گھر میں کیا ملا ہوگا اپنا وقت ہی ضائع کیا ہوگا کم بخت نے۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں بولائی بولائی سی پھرتی رہی۔ شانو سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی تاکہ چوروں کی روداد سن سکے۔ وہ تو خبر ہوئی بی پڑوسن زمین خالہ کی جو وقت پر آگئی اور صالحہ بیگم سے علیک سلیک کے بعد کہا۔

”اے صالحہ ذرا شانو کے گھر چلو گی۔ سارے محلے میں شور ہے کہ چوری ہو گئی ہے۔ شانو کی بہن اور ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہیں بد بخت اٹھائی گیرے نے مرے ہوؤں کو مار دیا۔ صالحہ بیگم ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں اور پھر تیار ہو کر پڑوسن کے ہمراہ شانو کے گھر روانہ ہو گئیں۔ ماہ رو گھر میں تن تنہا تھی اور بے تابی سے ماں کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ تفصیل معلوم ہو سکے کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اٹھ کر ٹی وی آن کیا اور کھوڑی ہی دیر میں اکٹا گئی۔ ٹی وی بند کر کے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی اسی اثناء میں صالحہ بیگم اور خالہ زمین باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ دونوں کا موضوع گفتگو شانو کے گھر میں ہونے والی چوری ہی تھا۔ صالحہ بیگم نے ماہ رو کو آواز دے کر کہا ماہا خالہ زمین کے لیے شربت اور کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔ خالہ زمین انکار کرتی رہیں لیکن صالحہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی تخت پر بیٹھ گئیں۔ خالہ زمین نے پھر

بچے صبور کے لیے ہماری بیٹی کو پسند کیا ہے بیگم نور احمد اکثر ان کے گھر آیا جاتا کرتی تھیں لیکن اس بار وہ عنقریب اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ رہی ہیں شوہر کے منہ سے یہ بات سن کر صالحہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہو گئیں تھیں وہ خطرناک گھڑی آن پہنچی تھی جسے وہ اپنی دانست میں ابھی تک ٹالتی آ رہی تھیں کافی دیر تک وہ اپنے دماغ میں کچھڑی پکاتی رہیں پھر انہوں نے اپنی تمام ہمت اور حوصلہ مجتمع کر کے بڑے محتاط لہجے میں کہا فیاض الدین کو ایک نظر دیکھا اور ٹھوس حتمی لہجے میں کہا ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے مجھے بڑا ارمان ہے کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائیں شادی کی ایسی کیا جلدی ہے۔ ”اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں اگر ماہ رو اپنی تعلیم جاری بھی رکھے گی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب بیگم نور احمد بات چھیڑے گی تو ہم بھی اپنی بیٹی کی آئندہ تعلیم کی ڈیمانڈ اس نے سامنے رکھ دیں گے۔ میاں کے جواب پر صالحہ بیگم بغلیں جھانکنے لگیں۔ دل کی دھکڑ پکڑ ایک طلاطم پیدا کر رہی تھی۔ باپ بیٹی کے درمیان کوئی معرکہ نہ ہو جائے۔ وہ دل ہی دل میں رب کو یاد کر رہی تھیں۔ ایسے مسائل جس کا حل انسان کے پاس نہیں ہوتا تو بے اختیار نظریں مالک حقیقی کی طرف جاتی ہیں کیوں کہ جس وقت کچھ نظر نہیں آتا اس وقت صرف اور صرف اللہ نظر آتا ہے۔

ہر لڑکی مستقبل کے بارے میں ہونے والی باتوں پر نہ صرف کان رکھتی ہے بلکہ نظریں بھی رکھتی ہے ماں باپ میں جو خفیہ اور اہم نوعیت کی میٹنگ ہو رہی تھی اس کی سن گن ماہ رو کو ہو چکی تھی۔ پیش آئندہ حالات کا ادراک اسے بھی بخوبی تھا باپ کے سامنے تو لب کشائی کی ہمت نہیں تھی لیکن ماں کو وہ لرزا دینے والی دھمکی دے چکی تھی کہ اگر اس کی شادی شانو کے علاوہ کسی اور سے کی گئی تو وہ خودکشی سے گریز نہیں کرے گی۔ بیٹی کی زبان سے یہ جملہ سن کر صالحہ بیگم زندہ درگور ہو گئیں۔ وہ



شانو کے گھر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور سر کو شانہ والے انداز میں کہا۔ ”اے صالحہ تم کچھ بھی کہو میں تو حق لگتی کہوں گی۔ گھر کے بھیدی نے ہی لٹکا ڈھائی ہے ماں بیٹی نے دانتوں کا رس پی پی کر شادی کے لیے پائی پائی جوڑی تھی۔ ساری محنت کی کمائی ایک جھٹکے میں چلی گئی۔ دونوں کی آنکھ کا آنسو نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ اور وہ موا مارا شانو پلنگ پر لیٹا سگریٹ دھنک رہا تھا کش پہ کش لگا رہا تھا چہرے پر کوئی تردد کوئی پریشانی نظر نہیں آرہی تھی۔ صالحہ بیگم نے ایک گہری سانس لی اور کہا ”کیا کہہ سکتے ہیں زمین بہن کون چور ہے اس دور کے تو نو جوانوں کا مقدر ہی بیروزگاری بن گیا ہے۔ پیٹ کی بھوک اور افلاس انہیں جرائم کے راستے پر ڈال رہی ہے۔ دراصل یہ افلاس ہی جرائم کی ماں ہے۔ زمین نے ترخ کر فوراً کہا۔ ”لو اور سنو تم نے بھی خوب کبھی بیروزگاری اور نا کامی کی اصل وجہ تقدیر نہیں بلکہ ہڈ حرامی بد نیتی اور بد عملی ہے تم نے میرے بیٹے احمد کو دیکھا ہے کم پڑھا لکھا ضرور ہے لیکن کام چور نہیں چھوٹی عمر میں ہی ایک بیکری میں کام کرتا تھا محنت اور نیک نیتی سے کام کیا۔ سارا ہنر اور مگر سیکھنے کے بعد اپنی ہی جمع پونجی سے کرائے کی جگہ پر اپنی بیکری کی داغ بیل ڈالی اور پھر ماشاء اللہ اپنی محنت اور لگن سے کس طرح اپنے کاروبار کو چکایا ہے۔ آج ماشاء اللہ لاکھوں کما رہا ہے۔ سارے مارکیٹ میں سب سے بڑی فیکٹری ہے میرے بیٹے کی۔“ صالحہ بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ درست کہہ رہی ہو زمین بہن محنتی انسان کے گھر مفلسی باہر سے جھانک کر بھاگ جاتی ہے جبکہ نکلے اور کام چوروں کے گھر ڈیرے ڈال کر راج کرتی ہے۔“ ماہ روینا تو رہی تھی بیٹھا بیٹھا شربت لیکن ماں اور پڑوسن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر زہر کے کڑوے گھونٹ حلق کے نیچے اتار رہی تھی۔ اس چوری نے اس کے دلبر جانی کا کردار مشکوک بنا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں چور کو گالیاں

دے رہی تھی زمین خالہ کے رخصت ہونے کے بعد اس نے چلے کئے لہجے میں ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بدگمانی کی بھی حد ہوتی ہے خالہ زمین بغیر سوچے سمجھے شانو پہ اتنی بڑی تہمت لگا رہی ہے وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔ صالحہ بیگم نے حسد سے نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا اور کہا ”صرف زمین نہیں بلکہ وہاں جتنی عورتیں تھیں سب میں ہی یہی چہ لگوئیاں ہو رہی تھیں کہ چور باہر سے نہیں آیا تم کس کس کی زبان پکڑو گی اور میں بھی یہ ہی کہوں گی زبان خلق نقارہ خواست۔“ ماں کی زبان سے کھری کھری سن کر ماہ روکار ہا سہا موڈ مزید غارت ہو گیا وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور پیر پختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کو کھانے کے بعد جب اس کی امی اور ابو کمرے میں چلے گئے تو ماہ رو نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے فوراً اپنے سیل فون سے شانو کا نمبر ملایا اور اس کے گھر کی چوری پر اظہار افسوس کیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ جواباً شانو کی دل گرفتہ اور غمگین آواز اسے سنائی دے گی لیکن خلاف توقع شانو کا زبردست قہقہہ اس کی سماعت سے ٹکرایا اور اس نے استہزاء سے انداز ہتے ہوئے کہا۔

”جان شاہ رخ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں ذرا اپنا پر چیمبر استعمال کرو۔ اماں اور آپا کے جمع جتھے پر میں نے ہی ہاتھ صاف کیا ہے دراصل وہ دونوں کافی عرصے سے جوڑ توڑ میں لگی ہوئیں تھیں اور مجھ سے اس طرح چھپا رہی تھیں جیسے ملی سے دودھ چھپایا جاتا ہے۔ دونوں کو میرا ذرا سا بھی خیال نہیں تھا کہ اسے بھی چار پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے بھی ان کی ساری نقدی اور سونا چاندی پر ہاتھ صاف کر لیا۔ حقیقت جان کر ماہ رو بالکل سکتے میں رہ گئی۔ ماں اور زمین خالہ کی باتیں دماغ میں گونجنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھی بڑوں کے تجربات کتنے صحیح ہوتے ہیں اور کتنے مثبت نتائج اخذ کرتے ہیں۔ شانو کا انکشاف اس پر بجلی بن گرا تھا اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ شانو ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر منہ مارتی ہے اور تم نے اپنا

ہی گھر لوٹ لیا۔ تمہاری ماں نے تمہاری بہن کی شادی کے لیے جو پیسہ جو تولہ ماشا اکھٹا کیا تھا اسے ہی لے اڑے تمہیں شرم نہیں آئی۔ اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا شانو نے ڈھٹائی اور بے غیرتی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی۔

ماہ رو نے غصے سے دانت پیستے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ موبائل آف کیا اور بستر پر گر گئی۔ خون کی گردش تیز ہو چکی تھی اس رات وہ اتاروئی جتنا ساری زندگی نہیں روئی تھی اسے شانو سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آنکھیں موندے پڑی رہی اس طرح پوری رات گزر گئی۔

☆.....☆.....☆

فیاض نے ٹپائی سے صبح کا اخبار اٹھایا ابھی ورق گردانی ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی انہوں نے اخبار رکھا دروازہ کھول کر جھانکا تو انکے چہرے پر رونق آ گئی۔ ان کے سامنے ان کے دوست کا بیٹا مصور احمد تھا۔ فیاض نے والہانہ انداز میں اسے لپٹا لیا وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے صالحہ بیگم کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو کون آیا ہے۔“

صالحہ بیگم نے بھی بڑی خوشدلی کے ساتھ مصور کا استقبال کیا ماہ روا بھی تک بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی ساری رات بے چینی رہی تھی۔ آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی اور وہ ایک عجیب سی بیزار کن اور اعصابی تناؤ کا شکار تھی۔ والدین اور آنے والے مہمان کی گفتگو وہ بخوبی سن رہی تھی کیوں کہ چھوٹے گھروں کی ایک خوبی یا خامی یہ ہوتی ہے کہ کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی بلکہ خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔ صالحہ بیگم کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا وہ مصور سے کہہ رہی تھیں کہ ارے بیٹا اکیلے ہی چلے آئے امی کو بھی ساتھ لے آتے۔ ”جواباً مصور نے کہا آنٹی دراصل ہم لوگ کل ہی حیدر آباد پہنچے ہیں۔ پھوپھی کے گھر قیام کیا ہے میں گھر سے لکھا تو امی

آرام کر رہی تھیں امی اور پھوپھی آپ سے کل ملنے کے لیے آئیں گی۔ مجھے آج شام ہی کراچی جانا ہے اور کل ڈیوٹی جوائن کرنی ہے دونوں بہنوں کی شادیوں کے کارڈ تقسیم کرنے ہیں وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ اس لیے صبح ہی صبح نکل پڑا۔ اتنی صبح آنے کے لیے معذرت آپ لوگ بھی ڈسٹرب ہو گئے۔ فیاض احمد اور صالحہ بیگم نے اسے پیار سے دیکھا۔ ”ہرگز نہیں بلکہ ہمیں تو بہت اچھا لگا ہے۔ اچھا تم انکل کے ساتھ باتیں کرو میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔ یہ کہہ کر صالحہ بیگم وہاں سے اٹھ گئیں وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ماہ رو کمرے میں آئیں۔ ماہ رو گم صم اداس چت لیٹی چھت گھور رہی تھی۔ صالحہ بیگم نے اس کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ماہا اٹھ جاؤ جلدی سے فرج میں سے شامی کباب کی ٹکیاں اور انڈے نکال رہی ہوں آٹا بھی گندھا رکھا ہے ذرا جلدی ناشتہ تیار کر دو۔ میں اور تمہارے ابو مہمان کے ساتھ ہی ناشتہ کریں گے ماہ رو کی سمجھ میں اچھی طرح بات آگئی تھی کہ مہمان کون ذات شریف ہے۔ کیوں کہ پچھلے کئی دنوں سے وہ مصور احمد کا تذکرہ ماں اور باپ کی زبان سے زور و شور سے سن رہی تھی۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر نہیں تھی کہ کل مصور احمد کی والدہ اور پھوپھی کیوں تشریف لا رہی ہیں رات سے ویسے ہی اس کا موڈ اور مزاج خراب تھا۔ پھر مرے پہ سودرے مصور کی آمد۔ دل و دماغ میں کڑواہٹ سی کھل گئی۔ شانو کے ساتھ ہونے والی گفتگو کسی زہریلے ناگ کی طرح ذہن میں کلبلا گئی صالحہ بیگم نے جیسے ہی ناشتے کا حکم صادر کیا۔ اس نے لیٹے لیٹے تیوری چڑھا کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”باہر سے حلوہ پوری ناشتہ منگوا کر جان چھڑائیں اور مجھے سونے دیں۔ صالحہ بیگم نے ایک قہر آلود نظر بیٹی پر ڈالی اور سرد لہجے میں کہا۔

مجھے کوئی ضرورت نہیں تمہارے مشورے کی، جو کچھ کرنا ہے میں کر لوں گی۔ تم بس آرام کرتی رہو۔

اب آئینہ میں تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہوں گی۔
 صالحہ بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔
 ماہ رو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی رہی لیکن اب اس کے
 کان برابر والے کمرے میں ہونے والی باتوں پر لگے
 ہوئے تھے پہلے تو دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے
 رہے حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتے رہے پھر فیاض
 الدین نے اس کے مرحوم والد کو یاد کرتے ہوئے ماضی کے
 اوراق اٹے وہ کہہ رہے تھے۔ ”بیٹا جب تمہارے والد کا
 انتقال ہوا تم وقت تم تینوں بھائی بہت چھوٹے تھے۔ اللہ
 تمہاری ماں کا سایہ تم لوگوں پر قائم دائم رکھے۔ بڑی باہمت
 اور حوصلہ مند خاتون ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی انہوں
 نے جو تم لوگوں کے لیے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صبور
 نے نہایت سعادت مندانہ انداز میں جوابا کہا۔

آپ درست فرما رہے ہیں انکل، اللہ کے بعد
 وہی ہمارا سہارا تھیں ہمارے ماموں اور دیگر رشتہ
 داروں نے مالی امداد کرنے کی کوشش بھی کی تو امی نے
 بڑی شائستگی سے منع کر دیا۔ ان کی خودداری نے یہ گوارہ
 ہی نہ کیا تھا۔ ابو کی پینشن کے علاوہ خود گھر میں ٹیوشن
 پڑھاتی تھیں ہم لوگوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ اسی کی
 بدولت آج ہم سرانٹھا کے کھڑے ہیں۔ میری ملازمت
 کے فوراً بعد ہی امی چاہتی تھیں کہ میں شادی کر لوں لیکن
 میں نے سختی سے انکار کر دیا کیوں کہ میری شادی سے
 اہم دونوں بہنوں کی شادیاں تھیں اسی ماہ ہم لوگ انشاء
 اللہ اس فریضے سے سبکدوش ہو جائیں گے اپنا ذاتی
 مکان بھی ہم لوگ کر چکے ہیں۔ اسی سال اللہ نے چاہا
 تو ان کی سب سے بڑی خواہش حج بیت اللہ کی زیارت
 پوری کروں گا پھر اپنی شادی کے بارے میں سوچوں
 گا۔ ابھی تک امی نے ہم لوگوں کے لیے کیا اب ہمارا
 حق بنتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے کچھ کریں۔ فیاض
 الدین نے بے ساختہ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ اور اس
 کے خیالات اور نظریات کو سراہتے ہوتے استفسار کیا۔ تم

نے مکان خریدا ہے یا فلیٹ صبور نے جوابا کہا۔ ”جی انکل
 مکان ہے بس قسمت سے بہتر ایریا میں مناسب داموں
 میں مل گیا ہے۔ اور میں نے بھی فوری یہ کام اس لیے کیا
 کہ میری امی میری شادی کے لیے بہت بے چین تھیں اور
 میں نہیں چاہتا جو لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر میرے گھر میں
 قدم رکھے اسے میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچے۔ میری
 کوشش ہوگی کہ اسے وہ تمام آرام و آسائش فراہم کروں
 جس کے لیے لڑکی خواب دیکھتی ہے۔

فیاض الدین صبور کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے
 ہوئے اس کی تعریف کیے جا رہے تھے ماہ رو کی سماعت
 سے ٹکرا کر اس کا ہر لفظ دل میں اتر رہا تھا۔ مہذب انداز
 گفتگو شائستہ لب و لہجہ دل میں بل چل پیدا کر رہا تھا۔
 بے ساختہ دل میں مہمان کو دیکھنے کی امنگ جاگی اس
 نے تو بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازے کی جھری سے
 آنکھ لگا دی۔ دروازہ قامت اور قبول صورت صبور اچھا ہی
 نہیں بلکہ بہت اچھا لگا بلکہ اس سے بھی اچھی اس کی
 سوچ اور خیالات لگے۔ وہ بغور اسے دیکھے جا رہی تھی۔
 صبور کی رنگت گہری سانولی ضرور تھی۔ تاہم جنس مخالف
 کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ ایک ہی پل
 میں شاہ رخ کا ڈبلیکیٹ ریزہ ریزہ ہو کر خاک کی نذر
 ہو چکا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دونوں کے خیالات و
 نظریات اور سوچوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ بالا آخر وہ
 اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ اب تک سراب کے پیچھے دوڑ رہی
 تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فیاض الدین اس سے
 اس کی تعلیم کے بارے میں ضرور سوال کریں۔ اور شاید
 دونوں باپ بیٹی کے درمیان کی یہ ٹیلی پتھی ہی تھی کہ جو
 اگلا سوال فیاض الدین نے یہی کیا کہ۔

”صبور بیٹا تم نے اپنی تعلیم اور ذریعہ معاش کے
 بارے میں نہیں بتایا کیا کرتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ
 استفسارانہ نظروں سے صبور کو دیکھنے لگے۔ صبور نے
 خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”انکل میں نے بی

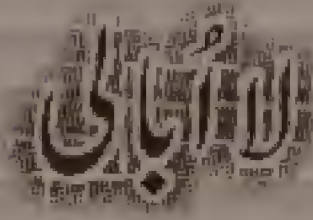
ایسی سی کرنے کے بعد میڈیکل ٹیکنیشن کا ڈپلومہ لیا اور ایک پرائیویٹ لیب میں کام کر رہا ہوں اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر اسپیشلسٹ کی سرکردگی میں بحیثیت اسٹنٹ کام کیا اب ماشاء اللہ اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ مختلف عناصر کو پرکھنے کے بعد حتمی نتائج اخذ کر سکتا ہوں میری اسی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے کراچی ایسوسی ایٹ نے مجھے مستقل ملازمت کی آفر کی اور میں نے فوراً قبول کر لی نہ صرف معقول تنخواہ بلکہ آگے ترقی کے بھی مواقع ہیں۔ بات ختم کر کے اچانک اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھیں اور وہاں جو چہرہ اسے نظر آیا وہ دل کو ایسا بھایا کہ وہ نظر ہٹانا ہی بھول گیا۔ ماہ رونے جب دیکھا اس کی چوری پکڑی گئی ہے تو وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہو کر تیز تیز چل رہی تھیں لیکن چہرے پر طمانیت اور خوشی کے عکس لرزاں تھے۔ تھوڑی دیر پہلے کی اداسی اور مایوسی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر اسے خود پر پیار آ گیا۔ اندرونی خوشی ایک چمک بن کر اس کے چہرے پر بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی وہ مسکراتی ہوئی۔ صالحہ بیگم کے پاس کچن میں پہنچ گئی۔ صالحہ بیگم بہت تیزی سے پرانے بنانے میں مصروف تھیں چہرے پر فکر تردد اور پریشانی کے آثار تھے۔ بیٹی کو دیکھ کر خفگی سے منہ پھیر لیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں ماہرونے ماں کی گردن میں اپنے باز حمال کرتے ہوئے معذرت خواہانہ اور محبت پاش لہجے میں کہا ”میری امی اچھی امی۔“ میں اپنی بدتمیزی، من مانی اور خود سردی کی تہہ دل سے معافی چاہتی ہوں۔ آپ کا اور ابو کا انتخاب بالکل صحیح ہے آپ کی اور ابو کی دعاؤں نے مجھے ایک بہت بڑے جہنم میں گرنے سے بچا لیا ہے۔“ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئی اور پھر ماں کے ہاتھ سے کام چھینتے ہوئے گلوگیر آواز میں

کہا۔ ”امی میں بہت شرمندہ ہوں آپ ابو کے پاس جائے باقی سارا کام میں دیکھ لوں گی۔ جب ناشتہ تیار ہو جائے گا تو آپ کو آواز دے دوں گی۔ صالحہ بیگم نے استعجاب انگیز نظروں سے بیٹی کو دیکھا کہا۔

یہ اچانک کیا معجزہ ہو گیا ہے یا پھر ماں کے ساتھ کوئی ٹانگ کر رہی ہو۔“

ماہ رونے شرم سار اور نادم لہجے میں کہا۔ امی آپ ہمیشہ کہتی تھیں ناکہ دلوں کا پھیرنے والا بھی اللہ ہے۔ بس ایک پل ایک لمحے میں اس نے مجھے تاریکی اور غلط راستے سے اٹھا کر صحیح اور سیدھی راہ دکھا دی۔ میں اس کو بے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ جوہنس کی چال چلتے چلتے اپنی چال بھی بھول گیا۔ ”صالحہ بیگم نے ایک آسودہ گہری سانس لی اور بے اختیار ہو کر اپنی بیٹی کی پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے۔ جوان کی بیٹی ضد اور ہٹ نے ان کا راتوں کا سکون اور دن کا چین غارت کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے بعد ان کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پیار سے دیکھا۔ ”تم ذرا دوڑ کر ایک کام کرو فرج میں سے ذرا بڑی کاپیکٹ نکال کر لے آؤ۔ پہلے میں اپنی بیٹی کا منہ میٹھا کرواں گی۔ ماہ رو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور ایک حیا آلود اور دلکش مسکراہٹ نے چہرے کو اور بھی گلنار بنا دیا۔ تب صالحہ بیگم نے بے اختیار ماہ رو کا ماتھا چوم لیا۔ اللہ نے ان پر کتنا کرم کیا تھا کہ ان کی بیٹی کے تودل و دماغ میں تو بروقت اچھے اور برے کی تمیز پیدا کر کے نہ صرف، اسے بلکہ پورے خاندان کو کتنی مشکلات اور اذیت آمیز، پریشانیوں سے بچا لیا تھا۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا بھی نکلی تھی کہ کاش اب کسی اور ماں کو، ان کی بیٹی اس اذیت سے نہ گزارے جس سے وہ گزری تھیں۔

☆☆☆☆



”ارے بیٹا! آج خیر تو ہے۔ تم کچن میں! کہیں سورج مغرب سے تو نمودار نہیں ہوا بھابی کہ میری صاحبزادی کچن میں۔“ سیکنہ بیگم کچن میں آتے ہی بولیں۔ ”لو آج میں آگنی تو مجھے سنا رہی ہیں اور اگر نہ آتی تو بھی مجھے ڈانتیں۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔ ”آؤ ادھر آؤ شیریں بیٹا.....“

زندگی کے رنگوں سے آباؤ ایک مسکراتا مکمل ناول

”فرہاد تم ہی اس سے پوچھو! آج اس کا کالج تیسرا دن ہے اور آج ایک لڑکے کی پٹائی بھی کر آئی ہے۔“ بیگم سیکنہ نے اُس کے قریب آ کر کہا۔ ”اچھا۔“ وہ سر ہلاتا ہوا بولا جیسے معمول کی بات ہو۔ ”چلیں چھوڑیں چھوٹی امی۔ آپ جا کر میرے لیے کچھ لائیں، مجھے بھوک لگی ہے۔ اس سے میں بات کرتا ہوں۔“ اس نے سیکنہ بیگم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے کچن میں کچھ لانے کے لیے گئیں تو اس نے شیریں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ”کیوں؟ آج کیا کر کے آئی ہو؟“ اس نے بھنویں اکٹھا کر کے سوال کیا۔ ”ارے کچھ نہیں یار۔ بس ایک لڑکے نے ریلنگ کرنے کی کوشش کی تو تھوڑا سا ہاتھ مار دیا اور گھر خبر پہنچ گئی۔ باقی تو تم جانتے ہو۔“ اس نے صوفے پر بے ترتیبی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یار شیریں! کچھ تو لڑکیوں والی حرکتیں کیا کر۔“ اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ہائے اللہ! کیا کروں میں اس لڑکی کا؟“ سیکنہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ”تم کب سدھرو گی اور کب لڑکیوں والی حرکتیں کرو گی؟“ انہوں نے غصے سے سامنے کھڑی شیریں کو گھورا۔ جو بڑے مزے سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ ”ماما اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اُس نے مجھے تنگ کیا تو میں نے اسے دو کک مارے اور بس!“ ”ہیں ہیں کیا؟ بس دو ہی مارے اور اس کا خون نکل آیا۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”چلیں دو چار اور بڑھالیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔ ”بس شیریں بس۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب بہت ہو گیا تم پتا نہیں کیا کرو گی؟ مجھے آج ہی تمہارے ڈیڈ سے بات کرنی ہو گی۔“ ”کس بارے میں چھوٹی امی۔“ فرہاد اندر داخل ہوتے ہوئے بولا اور اُس نے ہاتھ ہلا کر شیریں کو ہیلو کہا۔ جواباً اُس نے ہاتھ بھی ہلایا اور اشاروں میں آگاہ کر دیا کہ ماما کا غصہ مجھ پر ہی ہے۔ حسبِ عادت!



”اب تو مت شروع ہو جا۔ تجھ میں بھی کبھی کبھی ماما کی روح گھس جاتی ہے۔ اچھا میں نکلتی ہوں کہیں دوبارہ ماما نہ آ جائیں اور پھر ڈانٹ پڑنا شروع ہو جائے۔ تو مجھے بعد میں ملنا۔ میں کچھ لائی ہوں۔ دکھاؤں گی تجھے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”چلو ٹھیک ہے ملتا ہوں میں۔“ فرہاد نے ہارے ہوئے انداز میں کہا اور وہ اوپر کی منزل کی جانب بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

شیرازی ولا اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ شہر کے سب سے پوش علاقے میں قائم تھا۔ اس میں دو خاندان بستے تھے۔

منصور شیرازی اور مقصود شیرازی۔ دو بھائی تھے اور ان کی اپنی اپنی فیملی۔

منصور شیرازی کے چار بیٹے تھے۔ جلیل شیرازی، خلیل شیرازی، رمیز شیرازی اور فرہاد شیرازی۔

مقصود شیرازی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ منان شیرازی، نعمان شیرازی اور ارسلان شیرازی بیٹی شرمین شیرازی جس کو پیار سے شیری کہتے تھے۔ شیری بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ گھر میں سات بیٹوں کے بعد یہ واحد لڑکی تھی۔ اس لیے اسے ہاتھ کا چھالا بنا کر پالا گیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو شیرازی ولا میں بڑے پیمانے پر جشن منایا گیا تھا۔ سبھی اس کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔

جب تک وہ چھوٹی تھی تب تک تو سیکینہ بیگم جو کہ مقصود شیرازی کی بیگم اور شیری کی ماں تھیں۔ ان کا بس شیری پر چلتا تھا۔ وہ اسے بڑے خوبصورت فراک پہناتیں، اس کی پونی بناتیں اور اس کام میں ان کی جیٹھانی برابر کا ساتھ دیتیں۔ زرینہ بیگم بھی شیری سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ سب کی آنکھوں

کا تارا تھی۔ ہر کوئی اسے گود میں لیے پھرتا اور کہتا یہ بس میری بہن ہے۔ کبھی وہ جلیل کی گود میں ہوتی تو کبھی منان، اس چھوٹی سی گڑیا سے کھیل رہا ہوتا اور رمیز اور نعمان، اسے گود میں لپیٹنے کو جھگڑے ہوتے وہ بس سب کے ہاتھوں میں ہی رہتی تھی، مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی اس میں لڑکیوں والی کم اور لڑکوں والی عادتیں زیادہ آتی گئیں۔ جب بھی گھر کے لڑکے شاپنگ پر جاتے اس کے لیے بھی کوئی اچھی سی جینز یا شرٹ لے آتے۔ انہیں لڑکیوں کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

دونوں بیگمات خوش ہوتیں اور اعتراض نہ کرتیں کہ چلو بچی ہے۔ بڑی ہوگی تو خود ہی اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب بدل جائے گا۔“

وہ بچپن ہی سے اپنے بھائیوں سے کافی انچ رہی تھی۔ اس کے خیال میں اس کے چھ بھائی تھے اور فرہاد جو کہ اس سے تین مہینے ہی بڑا تھا وہ تو اس کا جگری دوست تھا۔

فرہاد اور اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تمام حالات سے آگاہ کر دیتے تھے اور ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہ چھپاتے تھے۔

گھر کے لڑکوں کو مختلف شوق تھے۔ کسی کو باکسنگ کا تو کسی کو گارڈنگ کا کسی کو باڈی بلڈنگ کا تو کسی کو سوئمنگ۔ غرض سبھی لڑکوں کے شوق خود بخود شیرازی میں آتے چلے گئے۔

اگر کوئی باکسنگ کرتا تو اسے بھی بتاتا کہ کیا کرنا ہے۔ کوئی ویٹ لفٹنگ کرتا تو اسے بھی بتاتا۔ وہ بڑے شوق سے یہ سارے کام کرتی تھی۔

جلیل اور منان ہم عمر تھے۔ اسی طرح خلیل اور نعمان میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ رمیز اور ارسلان میں البتہ دو سال کا فرق تھا، مگر کبھی لگا نہیں اور فرہاد اور

شیری بھی ساتھ ساتھ کے ہی تھے۔

غرض سب کی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ جلیل اور منان شیری سے پندرہ سال بڑے تھے۔ پھر خلیل اور نعمان ان دونوں سے تین سال چھوٹے تھے۔ پھر رمیز، نعمان اور خلیل سے دو سال چھوٹا تھا، ارسلان اس سے دو سال اور آخر میں شیری اور فرہاد ارسلان سے دو سال چھوٹے تھے۔

جب تک شیری چھوٹی تھی تب تک تو ٹھیک تھا، مگر اب وہ سولہ سال کی ہو گئی تھی اور کسی بھی اینگل سے لڑکی نہیں لگتی تھی سوائے بالوں کے جو شولڈر سے نیچے آتے تھے۔

بچپن میں سیکنہ بیگم اور زرینہ بیگم اسے خوب لڑکیوں جیسے کپڑے پہناتی تھیں، مگر اسے ہمیشہ بھائیوں جیسے کپڑے پہننا پسند تھے۔ اور حرکتیں بھی ساری بھائیوں والی کرتی تھی۔

جب وہ تیرہ سال کی تھی تب وہ بڑے مزے سے سڑکوں پر سائیکل دوڑاتی پھرتی جو کہ غلطی سے اس نے ارسلان سے سیکھ لی تھی۔ اس کا تو کچھ نہیں گیا مگر سیکنہ بیگم نے ارسلان کی کلاس ٹھیک طرح سے لے ڈالی۔

اس گھر میں سیکنہ بیگم ہی تھیں جنہیں اس کی لڑکوں والی حرکات و سکنات پر غصہ آتا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے شکایت کرتیں تو وہ ہمیشہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ساتھ دیتے اور ایک ہی جملہ کہتے ”ابھی بچی ہے۔“ کرنے دو اپنی مرضی۔“ جس پر وہ الجھ کر رہ جاتیں وہ ہمیشہ چڑ جاتیں اور خاموش مگر زرینہ بیگم انہیں سمجھا دیتیں کہ جب اسے خود احساس ہوگا کہ وہ لڑکی ہے تو دیکھنا وہ کیسے اپنا طرز زندگی بدلے گی۔

”بھابی دیکھیں ناں! کتنے لڑکے ہیں گھر میں اور آج تک اس نے دوپٹا نہیں لیا۔ اب آپ بتائیں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جوان ہو گئی ہے

اسے کب احساس ہوگا کہ وہ اب بچی نہیں ہے۔ کالج جانے والی لڑکی ہے؟“

”کوئی بات نہیں سیکنہ! گھر میں اس کے سارے بھائی ہیں اور آج تک لڑکوں نے اسے بالکل اپنی طرح رکھا ہے۔ وہ بھی اسے لڑکا ہی سمجھتے ہیں۔ اب بس تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ زرینہ بیگم نے انہیں سمجھایا اور انہوں نے سر ہلادیا۔

”آج ماما کا موڈ آف ہے؟“ نعمان نے ارسلان سے استفسار کیا۔

”ہاں مجھے بھی لگتا ہے۔ آج موسم ابر آلود ہے۔“ ارسلان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر جلیل، خلیل اور رمیز تینوں آکر دونوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ”کیا بات ہے چھوٹی امی! کچھ ناراض ہیں۔“ رمیز نے پوچھا۔

”ہمیں بھی لگتا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔ یعنی ہم پانچوں کو کچھ نہیں پتا۔ بائی بچے تین منان، فرہاد اور شیری۔ منان تو آج بابا کے ساتھ گیا ہے۔ یعنی اسے تو یقیناً نہیں پتا اور فرہاد اور ہے اور شیری نظر نہیں آرہی یعنی دونوں میں سے کسی نے کچھ کیا ہے۔“ رمیز اپنی عینک ناک پر جھاتے ہوئے بولا۔

فرہاد کی وجہ سے چھوٹی امی کا موڈ آف ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ ان کا سب سے زیادہ چہیتا بچہ ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ ادھوری چھوڑ کر میاں نے سب کی جانب دیکھا تو سب ہی نے تائید میں سر ہلادیا۔

”یقیناً آج شیری نے پھر کچھ کیا ہے تب ہی آج وہ کمرے سے باہر نہیں آرہی۔“ جلیل نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے سائیکل لے کر نکلی ہوگی۔“ ارسلان بولا۔ اوں ہوں! مجھے لگتا ہے کہ کسی کے گھر کا شیشہ توڑا ہوگا۔“ خلیل بولا۔

”نہیں، نہیں یقیناً کپڑوں پر بحث ہوئی ہو گئی اور آخر کار امی نے شیری کا ساتھ دیا ہوگا۔“ رمیز بولا۔

”بالکل نہیں۔“ فرہاد کی آواز گونجی جو پتا نہیں کب سے ان کے سروں پر کھڑا باتیں سن رہا تھا۔
 ”آپ لوگ غلط اندازے لگا رہے ہیں۔ اب ذرا مجھے اس گول چکر میں جگہ عنایت کریں اور اپنے سروں کو پاس سنبھالیں تو میں کچھ عرض کروں۔“ وہ ان کے درمیان گھسا جو سارے لاؤنج میں سر جوڑے دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ وہ جلیل اور ارسلان کے درمیان بیٹھے ہوئے کشن کو گود میں رکھ کر کہنیاں جماتے ہوئے بولا۔

”ہماری اس شہزادی نے گویا کہنا غلط ہوگا، مگر چونکہ یہ قدرت نے کر دیا ہے کہ شہزادہ بناتے بناتے شہزادی بنا دیا۔“ اُس نے افسوس سے سر ہلایا جیسے پتا نہیں کتنا غلط ہوا ہو۔

”اوں ہوں، آگے بکوہے۔“ خلیل نے ٹوکا۔

فرہاد نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ سارے ایسے متجسس تھے جیسے وہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ سنانے جا رہا ہو۔

”اب بولو بھی، کیا منہ دیکھ رہے ہو۔“ رمیز نے کہنی ماری۔

”اچھا اچھا تم سب تو پیچھے پڑ گئے۔ تو سنو۔ آج شیریں کالج میں ایک لڑکے کی پٹائی کر کے آئی ہے جس کی شکایت چھوٹی امی کو کالج کی جانب سے ملی ہے۔“
 ”لو! اس میں کون سی بڑی بات ہے؟ پٹائی ہی کی ہے۔ آخر وہ مرد ہے۔ مرد۔“ جلیل بے نیازی سے بولا۔

”اوہیلو، بھائی لوگو!“ فرہاد نے ہاتھ سے جلیل کو ٹوکا۔ وہ مرد ہمارے لیے ہے۔ دنیا کے لیے وہ لڑکی ہے مت بھولیں۔“

”یار معاملہ سیریس تو نہیں۔“ ارسلان نے پریشانی سے پوچھا۔ کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے شیریں کا۔ پتا نہیں بیچارے کو کتنا پیٹا ہو۔“ ارسلان کو

بیچارے لڑکے سے ہمدردی ہو گئی۔

”تو کس نے کہا تھا کہ اسے ہاڈی بلڈنگ، ویٹ لفٹنگ سکھائیں۔ اب وہ لڑکیوں کی طرح ایک آدھ تھپڑ پر تو گزارہ کرے گی نہیں یقیناً اچھی خاصی پٹائی کر کے آپ لوگوں کا نام روشن کر کے آئی ہو گی۔“ فرہاد نے منہ چڑھا کر کہا۔ اتنے میں شیریں آ گئی۔

”بھئی مجھے بھی جگہ دو۔ کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی تھی۔ سوچا اب تو می کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ وہ ان کے درمیان گھستے ہوئے بولی۔ بے ڈھنگی جینز اور شرٹ میں بال بکھرے ہوئے بڑی بے نیازی سے فرہاد کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس سے کشن بھی ٹھنڈا لیا۔
 ”مسئلہ زیادہ تو نہیں ہوا شیریں؟“ ارسلان نے شیریں سے دریافت کیا۔

”تو بتا دیا اس میاں مٹھو نے آپ کو۔ اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں نکلتی۔“ اس نے کہنی فرہاد کی پسلیوں میں گھسادی جس سے اُس کی چیخ نکل گئی۔
 ”بس کر شیریں تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”ارے نہیں بھائی بس تھوڑا سا مارا ہے۔ دو تین دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ وہ ایسے بتا رہی تھی جیسے معمول کا کام بتا رہی ہو۔

”ہاں یاد نہیں جب یہ تھرڈ کلاس میں تھی اور اسی طرح ایک بچے کی پٹائی کر کے آئی تھی۔ وہ بیچارہ ہفتہ بھر بیڈ سے نیچے نہیں اُترتا تھا۔“ فرہاد نے پھر مداخلت کی۔
 ”بس کر فرہاد ورنہ پٹے گا مجھ سے۔“ وہ انگلی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولی اور فرہاد چپ ہو گیا۔

اس کا بھروسہ بھی کوئی نہیں تھا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی پٹائی بھی کر دیتی۔

یہ بات کہیں پاپا اور بڑے پاپا تک تو نہیں پہنچ جائے گی۔“ شیریں نے کہا۔

”بھئی چھوٹی امی تک گئی ہے تو یقیناً چھوٹے پاپا

کے پاس جانے کی اور پھر مئی اور پاپا کے پاس پہنچ کر ہی دم لے گی۔ ”رہیز اپنی جگہ پھلتے ہوئے بولا۔
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ سب نے گردن ہلائی۔
 ”چلو دیکھا جائے گا۔ پٹا ہی ہے جان سے تھوڑی مار کر آئی ہوں۔“ وہ بے فکری سے بولی۔
 ”دیکھ شیریں ایک نہ ایک دن تو ہمیں ضرور پھنسوائے گی۔“ ارسلان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 ”ارے بھائی لوگو! ٹھنڈا کھو ٹھنڈا! کچھ نہیں ہو گا۔“ شیریں نے کہا۔

☆.....☆.....☆

رات کو ڈاکٹنگ ٹیبل پر بڑے پاپا نے اس سے آج کا واقعے کے بارے پوچھا تو اس نے اتنی معصوم شکل بنا لی جیسے غلطی تو اس کی سرے سے تھی ہی نہیں۔
 ”جی بڑے پاپا! اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ تو میں نے دو ہاتھ مار دیے۔“ وہ اسی معصومانہ لہجے میں بولی جیسے بڑی شریف ہو۔ پٹائی کا مطلب بھی نہ جانتی ہو۔

”دو ہاتھ مارے تھے اور بچے کا ہونٹ پھٹ گیا۔“ سیکرٹری بیگم گھورتے ہوئے گویا ہوئیں۔
 شیریں نے مدد طلب نظروں سے اپنے سات کے سات بھائیوں کو دیکھا جو بڑی بے فکری سے کھانے میں مصروف تھے۔ ان سے کوئی امید نظر نہ آئی تو پاپا کو دیکھا۔ انھوں نے ایسے سر ہلایا جیسے اس بار وہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔

جب اسے کچھ نہ سوچا تو آخری حربہ آزمانا پڑا۔ دو چار آنسو گھسیٹ گھسیٹ کے آنکھوں میں لائی (اسے یہ کرنے میں بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا) اور دھیرے لہجے میں بولی۔

”sorry بڑے پاپا! آئندہ ایسے نہیں ہوگا۔“
 ”اوں ٹھیک ہے، آئندہ خیال رکھنا۔ اچھے بچے جھگڑا نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے۔“

”جی بڑے پاپا! اس نے مظلوم سی شکل بنائی اور کھانا کھانے لگی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لڑکے گارڈن میں بیٹھے تھے کہ وہ آگئی۔ غصے سے اپنی شرٹ کے بازو اوپر کرتے ہوئے بولی۔
 ”ٹھیک ہے میرے ٹائم پر کسی نے مدد نہیں کی۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔“ وہ بے حد غصے سے انگلی کا اشارہ سب کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

”اب دیکھوں گی کہ کیسے مجھ سے اپنے کام کراتے ہیں کہ فلاں کا نمبر لا دوں۔ فلاں کو فون پر بلا دوں۔“ وہ خاص طور پر ارسلان اور ریمز کی طرف مڑ کر بولی۔

”اور آپ آئیے گا خلیل اور منان بھائی کہ ڈیڈی سے یہ کہہ دو وہ کہہ دو اور تم دونوں۔“ وہ خلیل اور نعمان کی طرف مڑ کر بولی۔ ”تمہیں تو چھوڑ دوں گی نہیں۔“ دونوں کا رکھا ہوا سانس بحال ہوا۔

”اور تم ماما کے چچے۔“ یہ خطاب صرف اور صرف فرہاد کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اس کے چچے بھاگی اور وہ جو چاکلیٹ کھانے میں مصروف تھا کہ اسے بخش دے گی؟ اٹھ کر دوڑا۔

”بھائی بچاؤ یہ لڑکی میرا حلیہ بگاڑ دے گی۔“ کبھی وہ خلیل کے چچے جاتا تو کبھی ارسلان کے چچے اور شیریں مسلسل اس کے چچے بھاگ رہی تھی۔

”یہ تو گیا! بیچارا فرہاد! اب اس کی پوری رات ہائے ہائے کرتے گزرے گی۔“ خلیل منان کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولا تو سب ہنس دیے۔

فرہاد شیریں کے قابو آ چکا تھا وہ اسے گھاس پر لٹائے اس پر بیٹھ کر اسے بری طرح گھونسنے مار رہی تھی۔ اس نے رونے والی آواز میں بھائیوں کو پکارا۔

”مجھے بچاؤ ورنہ یہ چٹیل میری جان لے لے گی۔ بچاؤ..... بچاؤ.....“

سب نے مل کر ان دونوں کو چھڑایا اور شیریں کا

غصہ دور کرنے کے لیے وہ سب آفس کریم کھانے چل دیے۔

واقعی ساری رات فرہاد ہائے ہائے کرتا رہا اور ارسلان جو اس کا روم شیئر کر رہا تھا۔ کانوں میں روئی ٹھونس کر سو گیا۔

ناشتے کی ٹیبل پر فرہاد اپنا ایک ہاتھ آنکھ پر رکھ کر آیا۔ ”السلام علیکم پایا جان۔“ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکوں کی تو اسے دیکھتے ہی ہنسی چھوٹ گی اور زرینہ بیگم بڑی فکر سے پوچھنے لگیں۔

”فرہاد بیٹے یہ آنکھ پر ہاتھ کیوں رکھا ہے۔ دکھاؤ کیا ہوا ہے۔“

”کچھ نہیں مُمی، وہ ویسے ہی میں نے ہاتھ رکھ لیا۔“ وہ کسی طور اپنا ہاتھ ہٹانے کو تیار نہیں تھا۔

”ارے ایسے کیسے رکھا ہے بیٹا۔ ہاتھ اٹھاؤ۔“ سکیزنہ بیگم نے بھی زور دیا۔ وہاں پر سب لڑکے اور شیریں کا ہنس ہنس کر برا حال تھا جبکہ فرہاد انھیں ایک آنکھ سے مسلسل گھور رہا تھا۔

”فرہاد ہاتھ ہٹاؤ۔“ اب کی بار بڑے پاپا نے کہا تو چارو ناچار اسے ہاتھ ہٹانا پڑا۔ وہاں پر سیاہ دھبہ تھا جیسے کسی نے گھونسا بہت زور سے مارا ہو۔

”ہائے اللہ! یہ کیا ہوا ہے؟ کس نے مارا ہے تمہیں۔ ذرا بتاؤ کس سے لڑائی کی ہے؟“ زرینہ بیگم نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اُس نے شیریں کو دیکھا۔ اس نے اشارے سے کہا اگر میرا نام لیا تو اور کھاؤ گے۔

”کچھ نہیں مُمی بس ذرا جھکڑا ہو گیا تھا۔“ وہ بات سمیٹتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ایسا نہیں کرتے۔“ زرینہ بیگم نے اسے جھکڑا اور وہ بری طرح شیریں کو گھورنے لگا جو بڑے مزے سے اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”آج سنڈے ہے تو کیا خیال ہے ہم سب مل کر شاپنگ ناں کر آئیں۔“ نعمان نے لہجہ نائم میں سب لڑکوں سے کہا۔

”ہاں کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم سب شاپنگ پر نہیں گئے۔ اسی بہانے آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔“ ارسلان نے ہامی بھری۔

”اور ویسے بھی آج کل بڑی زبردست کولیکشن آئی ہے شرتس کی۔“ خلیل نے کہا۔

”ہاں بھئی، ہمیں بھی اچھی سی شرتس اور ڈریس پینٹ خریدنی ہے۔ اب ہمیں پاپا کا آفس جو جوائن کرنا ہے۔“ خلیل نے منان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں!“ منان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ”میرے پاس بھی جینز ختم ہو گئیں ہیں اور آج کل بیگی جینز کا فیشن ہے۔“ شیریں نے حصہ لیا۔

”او میڈم! بیگی جینز خالصتاً لڑکوں کے لیے ہے۔“ فرہاد نے اسے احساس دلایا کہ وہ لڑکی ہے۔

”تو کیا ہوا میں بھی تو لڑکا ہوں۔“ وہ کالراؤ پر کر کے بولی۔

”لو اور سن لو۔ میں نے کہا تھا ناں کہ اسے اتنا مت سر پر چڑھاؤ کہ وہ واقعی ایک دن لڑکا بن جائے۔“ فرہاد نے اپنے بھائیوں کو کہا۔

”تو چپ کر۔ میں لڑکا ہی ہوں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے لڑکی کا جسم دے دیا ورنہ میں آج لڑکا ہوتی۔“ شیریں افسوس کرتے ہوئے بولی۔

”خبردار شیریں! اگر تم نے خدا کے احکامات میں ذرا مداخلت کی تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ سکیزنہ بیگم جواب تک صرف خاموش تھیں بول پڑیں۔

”تم لڑکی ہو اور لڑکی بن کر رہو۔ مانا کہ ہم تمہیں لڑکوں جیسی حرکتیں کرنے پر زیادہ سختی نہیں کرتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لڑکا ہو۔“ اللہ تعالیٰ نے تمہیں

لڑکی بنایا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔" وہ درشتی سے بولیں۔

"ہاں بیٹا زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوتا اور اگر تمہارے پاپا سن لیتے تو انہیں کتنا دکھ ہوتا۔" زرینہ بیگم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آئندہ ایسے مت کہنا۔ چلو جلدی سے اللہ تعالیٰ سے sorry کرو۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"Sorry اللہ جی۔ دیری دیری سوری۔" وہ جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگی۔

"یہ ہوئی ناں میری اچھی بیٹی۔" وہ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔

جب وہ سب شاپنگ کے لیے نکل گئے تو سیکنہ بیگم نے زرینہ بیگم سے کہا۔ "دیکھا بھابی یہ لڑکی دن بہ دن ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے۔ مجھے تو فکر ہو گئی ہے آخر کل کو اس کو بیاہنا بھی تو ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بالکل لڑکا سمجھتی ہے۔ ہائے کیا ہوگا اس کا۔" وہ فکر مندی سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"تم فکر نہ کرو سیکنہ! ابھی بچپنا ہے اس کا۔ دیے بھی وہ شروع سے اتنے لڑکوں کے ساتھ رہی ہے۔ کوئی اور لڑکی تو ہے نہیں گھر پر اسی لیے وہ ان کے انداز میں رہتی ہے۔ مگر جس دن اسے اپنی لڑکی ہونے کا احساس ہوا دیکھنا اس دن وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔ چوڑیاں، چنری، چوڑی پاجامے، وہ یہ سب چیزیں اپنی مرضی سے پہنے گی۔ اچھی تو وہ بچی ہے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتے رہتے وہ بالکل ان جیسا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ تم فکر نہ کرو وہ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

"بھابی میں تو اللہ کا لاکھ دفعہ شکر ادا کرتی ہوں کہ لڑکوں جیسی حرکتیں ہی کرتی ہے، مگر زبان لڑکیوں

جیسی ہے۔ پتا ہے کتنے پاپا بیلے اس کی زبان ٹھیک کرانے میں۔ شکر ہے چھوٹی تھی تو سیکھ گئی ورنہ آج یہ (ہوگا) ہی بولتی۔

"میں نے کہا ناں کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔" انہوں نے سیکنہ بیگم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

☆.....☆.....☆

"ہیلو! ارے کوئی ہے کہ نہیں۔" شیریں کمرے میں داخل ہو کر بولی جیالانکہ سامنے فرہاد بیٹھا تھا مگر وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"کیوں تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ کوئی ہے یا نہیں۔" وہ کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بولا۔

"اوہ تو جناب ناراض ہیں۔" وہ اپنے آگے ہاتھ باندھ کر بولی۔ غصے سے فرہاد نے منہ موڑ لیا۔

"چلو چھوڑو غصہ، اور دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔" وہ اس کی فیورٹ چاکلیٹ سامنے کر کے بولی۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموش تھی۔

"چلو فرہاد پلیز، اب غصہ ختم کرو۔" وہ اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے بولی۔ مانا کہ اس دن کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور غلطی سے تم بھی میرے ہتھے چڑھ گئے تو بس کام ہو گیا۔ آئی ایم سوری!" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"اچھا بس! سوری کہنے سے میرا غصہ ختم نہیں ہوگا۔ سمجھیں تم۔" وہ غصے سے بولا۔

"تو کیا کرنا ہوگا تمہارا غصہ ختم کرنے کے لیے خود ہی بتادو۔" وہ بڑے مزے سے بیڈ پر پھیل کر بولی۔ اس پر فرہاد کا غصہ اور بڑھ گیا۔

"تم ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہو۔ پہلے مجھے اچھی طرح مار کیتی ہو پھر ایک آدھ چاکلیٹ دے کر سمجھتی ہو کہ غصہ ختم۔" وہ اسے انگلی کے اشارے سے بولا۔

"اور تم مان جاتے ہو۔ مجھے پتا ہے اس بار بھی میرا سب سے عزیز دوست مان جائے گا۔ ورنہ میں

اپنی باتیں کس سے شیئر کروں گی۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”تم آخر کب سدھرو گی شیری۔ کب بڑی ہو گی۔“ وہ آخر کار ہار مانتے ہوئے بولا۔

”ارے، ارے۔ تم مجھ سے صرف تین ماہ ہی بڑے ہو اور بول بالکل دادا کی طرح رہے ہو۔ وہ اپنے ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

”چلو اچھا چھوڑو۔ تم اس دن کچھ لائی تھیں میرے لیے۔“ فریاد نے اسے یاد دلایا۔

”ارے ہاں، دیکھوان چکروں میں بھول گی۔ چلو آؤ تمہیں دکھاؤں۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے روم میں لے گئی اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ فرہاد نے زیادہ غصہ نہیں کیا۔

”یہ دیکھو۔“ وہ ہاتھوں میں پہننے والے بینڈ نکال کر بولی۔ ”کیسے ہیں۔“ وہ تین طرح کے بینڈ کے دو دو جوڑے لائی تھیں۔ تین فرہاد کے اور تین اپنے لیے۔

”اوں اچھے ہیں Thanks۔“

”ارے یہ کیا۔ دوستی میں کوئی thanks نہیں۔“ وہ بڑے شاہانہ انداز میں بولی۔

”بس بس۔ ڈائلاگ نامارو۔ میں نے مردنا کہا تھا۔“ وہ اس کو چڑانے کے لیے بولا۔

”تم! تم ناں کبھی نہیں سدھرو گئے بندر۔“ وہ غصے سے بولی۔

سچ کہوں میں سدھرنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی بھر ایسے ہی رہنا ہے۔ تم بھی مت بدلنا۔ سچی جس دن تم سے جھگڑا نہ ہو اس دن کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ وہ اس کے بیڈ پر پھلتے ہوئے بولا۔

”تم سچ کہتے ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نہ تو تم سے ناراض رہ سکتی ہوں اور نہ ہی لڑے بغیر۔“

”ہم دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے کچے بلکہ جگری فرینڈز۔“ فرہاد نے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے شیری نے فوراً تھام لیا۔

”God promise پکا۔“ دونوں ہنس دیے۔ باہر سے ریمز نے گزرتے ہوئے دونوں کو دیکھا تو اطلاع دینے کے لیے گیا۔

”مبارک ہو۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔ سب کو بہت بہت مبارک باد۔“ ریمز نے زور سے بولا۔ سارے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

”بھئی کیا ہوا؟ بتاؤ تو سہی۔ کیا مبارک مبارک کی گردان لگائی ہوئی ہے۔“ ارسلان چڑ کر بولا۔

”بھئی ہمارے گھر میں جو دو عدد بیس ہیں ناں ان میں صلح ہوگئی ہے۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”شکر ہے۔“ سب کے منہ سے نکلا۔

”سچی صبح سے مزہ ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں تو اس گھر کی جان ہیں جان۔“ خلیل نے ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔ ”جب تک وہ دونوں نہ ہوں گھر میں رونق نہیں ہوتی۔“

”بھئی جو بھی کہو۔ شیری نے پیٹا بڑا خوب تھا۔ مزہ آگیا تھا۔“ نعمان ہنستے ہوئے بولا۔

”تو اور کیا بیچارے فرہاد کا برا حال تھا۔“ منان نے بھی حصہ لیا۔

”یعنی فرہاد کو چوٹ شیری کی وجہ سے لگی تھی۔“ سکیئرہ بیگم پتا نہیں وہاں کب آئیں۔ وہ زور سے بولیں تو سب متوجہ ہوئے۔ منان نے اشارے سے جلیل کو کہا کہ سنبھال لے۔ ارسلان نے ساتھ بیٹھے ریمز سے سرگوشی کی۔ ”اگر اگلے دو منٹ میں ان کا غصہ نہیں گیا تو شیری کی شامت کی I bet۔“ ریمز نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس لڑکی کو ذرا خیال نہیں۔ باہر تو پیٹ کر آتی ہے۔ اب گھر میں بھی شروع ہوگئی۔ اسے تو آج میں

پوچھوں گی۔“ وہ آگے بڑھنے لگیں کہ جلیل جلدی سے بولا۔

”چلیں غصہ چھوڑیں۔ رمیز ان دونوں کو خود دیکھ کر آیا ہے۔“ اس نے رمیز کی طرف دیکھا۔ سیکنہ بیگم نے بھی سوالیہ نظروں سے رمیز کو دیکھا۔ جس پر رمیز نے فوراً اشات میں گردن ہلائی۔

”جی چھوٹی امی، شیریں نے فرہاد کو بینڈ بھی دیے ہیں اور دونوں نے ہاتھ بھی ملایا ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اوں ٹھیک ہے، مگر دیکھ لینا ایک دن یہ لڑکی ضرور کچھ کرے گی اور یہ سب تم سب کی وجہ سے ہو گا۔ تم سب نے اسے بالکل لڑکا بنا دیا ہے۔“ وہ انہیں تنبیہ کر کے گئیں۔

”شکر ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ ”ورنہ آج تو پکا پٹی یہ لڑکی۔ ہمیشہ ہمیں ڈانٹ پڑاتی ہے۔“ خلیل بولا۔

”اور کیا واقعی یار، شیریں میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ سب حرکتیں ہماری جیسی ہی کرتی ہے۔“ رمیز کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

”بھئی لڑکیوں جیسی کیسے وہ بنے جبکہ ہم سب لڑکے ہیں۔ ایک فرہاد اور دوسری اس کی فرینڈ کیا نام تھا اس کا؟ وہ! ہاں فیروزہ۔ ایسے میں وہ لڑکی کیسے بنے گی۔ مگر جس دن اس کے دل میں کسی کی محبت نے دستک دی۔ دیکھنا وہ خود لڑکیوں کی طرح سوچنا شروع کرے گی۔“ منان شیریں کی سائیڈ لیتے ہوئے بولا۔

”مگر کب آئے گا وہ لڑکا۔ جو اسے لڑکی بنائے گا۔“ جلیل بولا۔

”آئے گا ضرور آئے گا۔ اللہ نے سب کے جوڑے بنائے ہیں اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔“ منان یقین سے بولا۔

”انشاء اللہ جلد آئے گا اور اللہ کرے ہماری زندگی میں ہی آجائے۔ پتا نہیں ہم شیریں کو کب سجتے

سنور تے دیکھیں گے۔ کب وہ ہاتھوں میں بینڈز کی بجائے چوڑیاں پہنے گی۔ کب جینز کی بجائے شلوار اور پاجامے پہنے گی۔“ ارسلان حسرت سے بولا۔ ”ویسے اسے لڑکا بنانے میں ہم سب کا برابر کا ہاتھ ہے۔“ نعمان نے یاد دلایا۔ ”ہم نے کبھی اسے لڑکیوں کی طرح ٹریٹ ہی نہیں کیا۔ ہمیشہ اسے لڑکوں کی طرح ٹریٹ کیا ہے اور اب جبکہ وہ لڑکوں جیسی ہو گئی ہے تو اب ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں اس گھر میں لڑکی چاہیے۔“

”بھئی جو بھی ہو۔ شیریں ہم سب کی جان ہے اور تم سب اس سے اتفاق کرتے ہو۔“ خلیل بولا۔

”وہ ہماری چھوٹی سی بہن ہے اور دیکھنا جب وہ سچے سنورے گی ناں تو تم ان دنوں کو یاد کرو گے۔ ویسے بھی اس کی شادی کے بعد کون سا اس نے لڑکیوں جیسے رہنا ہے۔ ابھی تو اس کا بچپنا ہے۔ so be relax“

☆.....☆.....☆

کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں اور شیریں کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ آج وہ صبح سے بور ہو رہی تھی تو کچن میں آگئی۔

”آج کیا بنا رہی ہیں بڑی امی۔ اس نے کچن میں گھسنے ہی چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے چندا، آج تو تمہارا فیورٹ کھانا یک رہا ہے۔“

”اچھا!“ وہ خوش ہو گئی۔ لائیں میں بھی آپ کی ہیلپ کرتی ہوں۔“ وہ نجانے کس موڈ میں تھی۔

چھری پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کیا کرنا ہے۔ وہ پیاز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

”ارے بیٹا! آج خیر تو ہے تم کچن میں! کہیں سورج مغرب سے تو نمودار نہیں ہوا؟ بھابی کہ میری صاحبزادی کچن میں۔“ سیکنہ بیگم کچن میں آتے ہی بولیں۔

”لو آج میں آگئی تو مجھے سنا رہی ہیں اور اگر نہ

آتی تو بھی مجھے ڈانتیں۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔
 ”آؤ ادھر آؤ شیریں بیٹا اور ذرا یہ سالن بھونو۔“
 اس کی توجہ بنانے کے لیے ذریعہ بیگم نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

وہ اٹھلا کر ان کے پاس چلی آئی تو سیکینہ بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم کچن میں دلچسپی ہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مما آپ کو میری بایک کا پتا ہے کہ کون لے کر گیا ہے۔“ نعمان لاؤنچ میں داخل ہو کر بولا۔
 ”نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون لے کر گیا ہے۔“ سیکینہ بیگم چائے کا کپ لیتے ہوئیں بولیں۔
 ”ریمز تجھے پتا ہے۔“ وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

”بھئی جہاں تک میرا خیال ہے تو..... نہیں۔ جلیل اور منان بھائی آفس گئے ہیں۔ خلیل یونیورسٹی میں ہو گا۔ بچا میں تو تمہارے سامنے ہوں اور ارسلان بھی ہے۔ رہ گئے پاپا اور چھوٹے پاپا، وہ بھی آ گئے۔“ منصور اور مقصود صاحب گلاس ڈور دھکیل کر داخل ہوئے تو ریمز نے ان کی طرف اشارہ کیا۔
 ”بھئی کیا ہوا؟ جو ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔“ مقصود صاحب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”کوئی کام ہے بھئی، ہمارے شہزادوں کو کیا۔“

”ارے نہیں پاپا۔ وہ میں بس اپنی بایک کا پوچھ رہا تھا تو ریمز بڑا تفصیلی جواب دینے لگا۔“ ارسلان نے اپنی صفائی دی۔

”اچھا، تو میں کہاں تھا۔ ہاں پاپا اور بڑے پاپا تو یہ ہیں۔“ ریمز سوچتے ہوئے بولا۔ ”بھئی نعمان برا مت ماننا۔ اب ماما اور چھوٹی امی تو سائیکل چلانے سے رہیں تو بچے دو ہی لوگ فرہاد اور شیریں۔ اب شیریں کو بایک چلانا نہیں آتی تو بچا فرہاد۔“

”تو تم سیدھا سیدھا بکواس نہیں کر سکتے تھے کہ فرہاد لے کر گیا ہے۔“ نعمان نے کشن اٹھا کر ریمز کو دے مارا۔

”ارے بھئی میں تو تمہاری مدد کر رہا تھا۔“ ریمز دانت نکال کر بولا۔

”لو فرہاد بھی آ گیا۔“ ریمز نے فرہا کی انٹری پر اس کی طرف اشارہ کیا۔

”السلام علیکم! ایوری بڈی۔“ وہ صوفے پر دھنس کر بیٹھ گیا۔

”اچھا ہوا تم آ گئے فرہاد۔“ نعمان نے اس سے کہا۔
 ”خیریت بھائی؟“ وہ متفکر انداز میں بولا۔

”ہاں یار۔ میری بایک تم لے کر گئے تھے ناں۔ چلو اب اس کی چابی دو۔ مجھے اپنے دوست کی طرف جانا ہے۔“ نعمان جلدی سے اس کے قریب آ کر چابی مانگنے لگا۔

”ارے بھائی میرے پاس تو نہیں ہے۔ میں تو آپ کی بایک پر نہیں گیا۔“ فرہاد حیرانی سے سب کو دیکھ کر بولا۔

”چوری، بایک چوری ہو گئی۔ وہ بھی گھر سے جبکہ گیٹ بند تھا اور چوکیدار بھی ڈیوٹی پہ تھا۔ ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔“ ریمز ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔
 ”تم اپنی فضول عورتوں والی ایکٹنگ چھوڑو۔“ نعمان کو غصہ آ گیا۔

”بھئی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور لے کر گیا ہو۔“ فرہاد نے نعمان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
 ”بھئی مجھے بہت ضروری جانا ہے۔“ نعمان چڑ کر بولا۔

”بیٹا تم گاڑی لے جاؤ۔“ منصور صاحب نے حل پیش کیا۔

”بڑے پاپا لے تو جاؤں لیکن پتا تو چلے آخر بایک کہاں گئی۔“

”ایک منٹ، ماما شیری کہاں ہے۔“ نعمان
 سکیزنہ بیگم کی طرف ایک دم پلٹ کر بولا۔
 ”بھئی وہ تو فیروزہ کی طرف گئی ہے۔ اپنی برتھ
 ڈے کا انویشن دینے۔“ انھوں نے وضاحت کی۔
 ”کس کے ساتھ۔“ نعمان نے اگلا سوال کیا۔
 ”ڈرائیور کے ساتھ گئی ہوگی۔“ وہ بولیں۔
 ”اے تھوڑی بائیک چلانا آتی ہے۔“ وہ اٹھتے
 ہوئے بولیں۔

”مما وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ
 ہی لے کر گئی ہے میری بائیک۔ کیونکہ ہیلمٹ بھی
 نہیں ہے۔“

”پر اسے کس نے بائیک چلانا سکھائی ہوگی۔“
 اس بار مقصود صاحب بولے۔ تو سب کی گردن ایک
 دم فرہاد کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ چور بن کر بیٹھا تھا۔ ایک دم بول اٹھا! وہ میں!
 میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ بھاگنے کے لیے بالکل تیار
 تھا۔ اس سے پہلے کہ فرہاد بھاگتا۔ نعمان اس کے
 سامنے آگیا۔

”مجھے سچ سچ بتا۔“

”وہ، وہ رونے لگ گئی تھی تو میں نے اسے
 بائیک چلانا سکھا دی۔“

”کیا۔“ سکیزنہ بیگم ایک دم پھٹ پڑیں۔
 ”تم نے اسے بائیک بھی چلانا سکھا دی۔ اے
 اللہ اب میں کیا کروں۔“ وہ انہوں نے سر ہاتھوں
 میں تھام لیا۔

”بھائی، وہ بہت اچھی بائیک چلاتی ہے۔ میں
 نے اسے چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔“ فرہاد نے
 صفائی دینا چاہی۔ نعمان اور رمیز ایک دوسرے کی
 شکل دیکھ رہے تھے۔

”بھائی اس سے پہلے آپ کی بائیک کو کچھ ہوا
 ہے بھلا؟ وہ بالکل ٹھیک تھی ناں۔“ فرہاد نے اسے

متوجہ کیا۔

”کیوں کیا پہلے بھی.....؟“ نعمان نے
 دیکھا۔ جیسے ابھی اسے کھا جائے گا۔

”بھائی پلیز۔“ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

”مجھے بتا فرہاد۔“ نعمان نے اسے گھورا۔

”بھائی تین بار پہلے بھی۔“ وہ بس اتنا کہہ کر

ایسے بھاگا جیسے پیچھے آگ لگی ہو۔

”رک..... رک فرہاد! آج تو تو میرے

ہاتھوں شہید کا رتبہ پائے گا۔“ وہ اس کے پیچھے دوڑا تو
 رمیز بھی اس کے ساتھ بھاگا۔

مقصود اور منصور صاحب ان کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

”دیکھا آپ نے شیری نے کیا کیا ہے۔ آنے

دو اسے میں چھوڑ دوں گی نہیں اور آپ کیوں خوش ہو

رہے ہیں۔“ سکیزنہ بیگم مقصود صاحب کے سامنے

بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کو شیری کی اس حرکت پر

شدید غصہ تھا۔

”بھئی کون سی بڑی بات ہے۔ وہ صرف بائیک ہی

لے کر نکلی ہے کہیں ہم دم تو نہیں چلایا اس نے۔“ مقصود

صاحب سکیزنہ بیگم کا غصہ کم کرنے کے لیے بولے۔

”دیکھا بھابی! انہیں اس ٹائم بھی مذاق سو جھ رہا

ہے۔“ وہ شکایتی لہجے میں زرینہ بیگم کی طرف رخ کر

کے بولیں۔ وہ بھی مسکرا دیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان

دونوں کی نوک جھونک چلتی رہے گی۔

”میں نے آپ کو کتنی دفعہ کہا ہے کہ اسے ذرا

سخت الفاظ میں سمجھائیں کہ وہ بچی نہیں ہے۔ ماشاء

اللہ سے کل سترہ سال کی ہو جائے گی۔ اب اسے

لڑکیوں والے طور طریقے اپنانے چاہیں۔“ مقصود

صاحب کچھ بولنے لگے اس سے پہلے وہ بول پڑیں۔

”اب پلیز یہ مت کہیے گا کہ اس کا بچپنا ہے۔“ وہ

تنبیہ والے انداز میں انگلی ان کی طرف کر کے بولیں۔

”کل کو وہ اگلے گھر جا کر ہماری کیا عزت

کرائے گی۔“ انہیں ابھی سے فکر ہونے لگی تھی۔ آخر ماں تھیں ناں اس لیے۔
 ”اچھا بیگم جیسا آپ کہیں۔“ مقصود صاحب بات ختم کر کے بولے۔ ”وہ آئے گی تو میں بات کروں گا۔“

☆.....☆.....☆

”باجی آپ سے کوئی لڑکا ملنے آیا ہے۔“ بچے نے اسے مخاطب کیا۔ اس کے ہاتھ سے برتن گرتے گرتے بچے۔ اس نے گھبرا کر تخت پہ بیٹھی دادی کو دیکھا۔ جو مسلسل اسے گھور رہی تھیں۔
 کوئی جواب نہ پا کر لڑکے نے پوچھا۔ ”کیا کروں ان کا وہ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ بایک پر ہیں اور ہیلمٹ پہنا ہوا ہے۔“ بچے نے تفصیلی جواب دیا۔
 ”کون ہے۔ بلال!“ وہ گھبرا گئی۔
 ”بھئی مجھے کیا پتا کون ہے۔ خود دیکھیں۔“ جا کر وہ پلٹ گیا۔

”خدا خیر کرے۔“ اس کے منہ سے نکلا اور وہ گیٹ تک آئی ذرا سا سر نکال کر باہر دیکھا۔
 تو بایک پر بیٹھا ہوا اسے دیکھتے ہی بایک لاک لگانے لگا اور پھر گیٹ کھول کر اندر زبردستی گھس گیا۔
 ارے ارے ایسے کہاں آتے جا رہے ہیں بتائیں مجھے۔“ وہ اس روکنے کی کوشش کرنے لگی۔
 جب اس نے ہیلمٹ اتارا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ”شیری کی بچی تو نے میری جان نکال لی۔“ وہ ہنستے ہوئے اس سے گلے ملی۔

”تو میرے گھراتے دنوں بعد آئی۔ ذرا خیال نہیں تمہیں میرا کہ میری اکلوتی دوست ہے (لڑکیوں میں) اس نے زور دے کر کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا ایک اور دوست ہے جو اسے بہت عزیز ہے۔
 ”بھئی فیروزے ٹائم ہی نہیں ملا۔ آج بھائی کی بایک مجھے جڑھی تو میں نے کہا کیوں ناں موقعہ کا

فائدہ اٹھایا جائے اور دیکھ تیرے گھر میں ہوں۔“ وہ اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔

”اے لڑکی! کون سا لڑکا تجھ سے ملنے آیا ہے۔“ دادی جان نے وہیں سے سوال دھرایا۔

”کوئی لڑکا وڑکا نہیں آیا ہے دادی جان۔ میری دوست آئی ہے۔ شرمین۔“ اس نے پورا نام لیا۔
 ورنہ شیری جیسا نام سن کر وہ یقیناً اسے کوئی لڑکا ہی سمجھیں اور لمحہ ضائع کیے بغیر، اسے چیک کرنے آ موجود ہوتیں اور پھر اس کے کپڑے اور حلیہ دیکھ کر وہیں پر اسے لیکچر دینا نہ شروع ہو جائیں۔

وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولی۔ ”تم یہاں کیسے کوئی کام تھا جو یہاں آئی ہو؟“
 ”ارے نہیں بھئی۔ کوئی کام وام نہیں تھا۔ بس ایسے ہی آ گئی۔ گھر میں بور ہو رہی تھی۔ بایک بائے چائس ہاتھ لگ گئی تو سوچا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے بس پھر کیا تھا۔ بایک اشارت اور میں یہاں۔“ وہ بڑے مزے سے اپنا کارنامہ سناتے ہوئے بولی۔

اوائے تم نے بایک چلانا کب سے سیکھی۔ فیروزہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
 ”بھئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا بس تھوڑے دنوں پہلے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
 ”اور تمہاری ممانہوں نے کچھ نہیں کہا۔“ وہ دوبارہ بولی۔

”وہ تو تب کچھ کہتیں ناں اگر انہیں پتا ہوتا۔ نا انہیں پتا ہے اور نا ہی میں بتاؤں گی ورنہ تم تو جانتی ہو مجھے ایک بھر پور لیکچر سننا پڑے گا۔ اس کا ٹاپک ہوگا ”بحیثیت لڑکی میرا کردار“ وہ ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ کر افسوسناک لہجے میں بولی۔

چلو دیسے تم نے بایک چلانا سیکھی کس سے۔ جہاں تک مجھے لگتا ہے تو تمہارے بھائیوں میں سے

تمہاری مہمانی کے خلاف جانے کی جسارت تو کوئی کرے گا نہیں۔ پھر کسی نے سکھادی؟

”بھئی ایک ہی تو ہے۔ جس پر میرے آنسو ہم بن کر گرتے ہیں۔ بس جب ہر طرف سے مایوسی نظر آئی تو میرا آخری حربہ.....“ وہ مزے لے کر جوس پیتے ہوئے بولی جو ملازمہ رکھ گئی تھی.....

”یعنی ایک دفعہ پھر فرہاد تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔“ وہ ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔

”تو اور کیا میں نے دو آنسو بہائے اور وہ صاحب تیار سکھانے کو۔ بھئی اسے بے وقوف بنانا میرے بانیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ وہ مزے سے چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

”لیکن شیری تجھے اس پر ترس نہیں آتا۔“ فیروزہ خفگی سے بولی۔

”ترس؟ کس بات کا بھئی۔ وہ پہلے میرا تایا زاد پھر میرا ہم عمر اور سب سے بڑھ کر وہ میرا سب سے بہترین دوست اور تم نے سنا ہی ہوگا 'A friend in need is a friend in deed' وہ چسپ سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔

”بھئی تمہیں کون سمجھائے جو تمہیں سمجھائے وہ خود اپنا سر کھپائے۔“ وہ ہارتے ہوئے بولی۔

”اچھا سب چھوڑو، میں تمہیں انوی ٹیشن دینے آئی تھی۔“ شیرمین اسے ناراض دیکھ کر بولی۔

”کیسا انوی ٹیشن؟“ اس کا موڈ بحال دیکھ کر اس نے بتایا۔

”بھئی کل ہماری شہزادی شیرمین مقصود شیرازی کا جنم دن ہے اور ہم بطور خاص آپ کو انوائٹ کرنے آئے ہیں۔“ وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

”اچھا جی! اسی لیے تم آئی ہو اور میں بھی کہ میری سہیلی کو میری یاد آئی اسی لیے وہ آئی ہے اور اگر تم مجھے انوائٹ نہ کرتی تب بھی مجھے یاد تھا کہ کل محترمہ کا

برتھ ڈے ہے اور میں نے گفٹ کا انتظام پہلے سے کر کے رکھا ہے۔“ فیروزہ اسے جتانے والے انداز میں بولی۔

”بھئی مجھے پتا ہے کہ میری سہیلی کو ہر سال کی طرح اس سال بھی میرا برتھ ڈے یاد ہوگا۔ میں تو فارمیٹی نبھا رہی تھی۔ خیر تم نے کل آنا ہے۔ کیونکہ میں نے چھوٹی سی پارٹی رکھی ہے۔ میرے گھر والے اور صرف تم۔ اس دفعہ میرا گریڈ پارٹی رکھنے کا موڈ نہیں تھا۔ ویسے بھی گفتگو تو مجھے گھر سے ہی ڈبھروں مل جائیں گے۔ اس لیے فکر نوٹ۔“ شیری ہنستے ہوئے بولی۔

”دیکھ شیری اس دفعہ میں نے خاص طور پر تیرے لیے زنانیوں والا گفٹ خریدا ہے۔ اب بس تو اس گفٹ کی عزت رکھنا اور اسے ڈھنگ سے پہننا۔“ فیروزہ اپنے گفٹ کا مستقبل دیکھ کر پہلے ہی تنبیہ کرنے لگی۔

”بھئی کہیں تو نے پراندہ و راندہ تو نہیں خریدا ڈالا۔“ شیری نے اسے چڑانے کے لیے کیا۔

”ارے نہیں بابا، بالکل نہیں۔ میں نے تیرے لیے بہت خوبصورت سے ایئر رنگ لیے ہیں۔ اپنے لیے دیکھے تو تیری یاد آگئی۔ تو بس لے لیے۔“ فیروزہ نے تفصیل بتائی۔

”اب پلیز اسے ڈھنگ سے پہننا یہ نا ہو کہ تُو اسے بھی جینز اور بھدی سی شرٹ کے ساتھ پہنے۔ وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔

”تو اور کیا۔ میں اس کی خاطر شلوار سوٹ تو بنانے سے رہی۔ شیری بولی۔

”میں دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں بناتی تُو۔“ فیروزہ بولی۔

”دیکھا جائے گا۔“ شیری جانے کے لیے اٹھ گئی۔ آنا ضرور میں تمہارا انتظار کروں گی۔ فیروزہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

”I am sorry“ ماما۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ معصومانہ انداز سے بولی۔

”میں اس بار تمہاری سوری ووری کے چکر میں نہیں آؤں گی اور اب تم سے کوئی بات بھی نہیں کروں گی۔“ وہ بولیں۔

”پلیز ماما ایسا مت کریں۔ کل میرا برتھ ڈے ہے۔ اگر آپ ناراض رہیں تو میرا دل کچھ کرنے کو نہیں چاہے گا۔ بس ایک بار صرف ایک بار معاف کر دیں۔ آئندہ بالکل ایسا نہیں کروں گی۔ صرف ایک بار۔“ وہ التجا کر کے بولی۔

”آخری بار! ہاں اور..... دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ کل تمہارا برتھ ڈے ہے اس لیے معاف کر رہی ہوں ٹھیک ہے۔“

”او کے ماما۔“ وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔ سالگرہ سے فارغ ہو کر وہ سب کے گفتگوں سے کر بیٹھ گئی۔ تب فرہاد آ گیا۔

”کیوں بھی بھوکی۔ تم سے ذرا صبر نہیں ہوتا کہ صبح گفتگوں کھول لیتیں۔“ وہ بھی ایک گفٹ پیک کھولنے لگا۔

”بھی نہیں ہوتا مجھ سے تو پھر کیا کروں۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”صبر کرنا سیکھ لڑکی۔ صبر کرنا سیکھ۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”تم مجھے نصیحت نہ کرو۔ تم میں کون سا صبر ہے تم بھی تو فوراً میرے گفتگوں دیکھنے آ گئے۔“

وہ بچپن سے ایسے ہی رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اپنی چیزیں شیر کرنا۔ ایک دوسرے کو دکھائے بغیر وہ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو

سنائے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی وہ ایک دوسرے کو سنا کر اپنا کھانا ہضم کرنے کی کوشش

وہ گھر میں داخل ہوئی تو خاموشی زیادہ ہی تھی۔ وہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے والی تھی کہ پیچھے سے سیکینہ بیگم کی آواز سے وہ ڈر گئی۔

”کہاں تھیں تم؟“

”وہ ماما! آپ کو بتایا تھا ناں کہ فیروزے کی طرف گئی تھی انوائٹ کرنے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”کس کے ساتھ۔“ انداز بالکل سپاٹ تھا۔

”مما ڈرائیور کے ساتھ۔“ اس نے بالکل صفائی سے جھوٹ بولا۔

”اچھا تمہارے ہاتھ میں یہ ہیلمٹ کیا کر رہا ہے۔“ انھوں نے فوراً سوال کیا۔

”شوکی قسمت!!“ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دابا۔

”اوہ یہ یہ تو مجھے باہر سے ملا تو میں نے سوچا کہ اندر جا کر رکھ دوں۔“ فرائے سے جھوٹ بولا۔

”اب تم جھوٹ بھی بولنے لگ گئیں۔ تم دن بدن بگڑتی جا رہی ہو شیریں۔ اب تمہارا کچھ کرنا پڑے گا؟“ وہ غصے سے بولیں۔

”مگر ماما میں نے کیا کیا۔“ دنیا جہاں کی معصومیت وہ اپنے چہرے پر سما کر بولی۔

”کیا کیا ہے۔ یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ تم میں شرم نام کی چیز ہے یا نہیں۔ یہ ہیلمٹ باہر نہیں تھا بلکہ تم یہ اور بایک لے کر گئی تھیں اور یہ بات گھر میں

سب کو پتا ہے۔“ وہ گویا ہوئیں۔ شیریں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ضرور یہ اس فرہاد کا کیا دھرا ہے۔ اس نے غصے سے سوچا۔ مگر اب کیا کرنا ہے۔ اس نے خود سے سوال کیا۔

”بولو اب چپ کیوں ہو۔ کہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ سیکینہ بیگم تمام حساب کتاب برابر کر دینا

کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”بھئی سب سے اچھا گفٹ کس کا لگا تمہیں۔“
جلیل بھائی اس سے پوچھنے لگے۔

”بھئی ہمیشہ کی طرح سے صرف فرہاد کا گفٹ ہی سب اچھا لگا ہوگا۔“ اس کے بولنے سے پہلے ہی منان بول پڑا۔

”جی بالکل، پہلے کی طرح اس بار بھی فرہاد کا گفٹ ہی مجھے سب سے بہترین لگا۔“ اس نے ہامی بھری وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ چونکہ آج سنڈے تھا لہذا تمام افراد اپنی روزمرہ کی روٹین سے دور تھے۔

”ہاں فرہاد نے اُسے کتوں والے پٹے دیے ہوں گے اسی لیے یہ اتنا خوش ہو رہا ہے۔ کیونکہ کتے کے پٹے دونوں کو ہی بہت پسند ہیں۔“ ارسلان چڑ کر بولا۔

”دیکھو بھائی! خبردار جو میرے بینڈز کو کتوں کے پنوں سے تشبیہ دی۔ چھوڑو گا نہیں میں آپ کو۔“ فرہاد زور سے بولا۔

”اور میں بھی۔“ شیریں نے بھی فرہاد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”چلو دکھاؤ کتوں کے پنوں کو۔ میرا مطلب ہے بینڈز کو۔“ رمیز نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ سب کو ہلسی آگئی۔ دونوں نے اپنے بازو آگے کیے دونوں نے ایک جیسے بینڈز پہنے ہوئے تھے۔

”بھئی یا تو فرہاد زنائیوں والی چیزیں پہنتا ہے یا پھر شیریں مردانہ چیزیں۔“ جلیل نے لقمہ دیا۔

”بھئی یہ آج کل کا فیشن ہے۔“ شیریں نے فوراً جواب دیا۔

”بھئی تم لوگ چپ کرو۔“ سکیٹ بیگم نے انھیں ٹوکا۔ ”بھابی کیا خیال ہے ہمیں اب جلیل اور منان

کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ انھوں نے کہا اور سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کیا سوچنا چاہیے بیگم۔“ مقصود صاحب نے کہا۔

”میرا مطلب ہے اب دونوں بزنس کرنے لگے ہیں۔ اب ان کی شادی کر دینی چاہیے۔ کیا خیال ہے۔“ سکیٹ بیگم نے جواب دیا۔

”واہ چھوٹی امی کیا بات کہی ہے۔“ خلیل پُر جوش لہجے میں بولا۔

”یعنی دونوں کو لگام ڈالو۔“ نعمان نے مختصراً وضاحت کی۔

”ہوں ٹھیک کہتی ہو۔ تم سکیٹ کوئی لڑکی وڑکی بھی تو ہو۔“ زرینہ بیگم نے ان کی تائید کی۔

”بھابی لڑکیاں تو دیکھنی پڑیں گئی ناں۔ اب وہ گھر چل کر ٹھوڑی آئیں گی۔ ہمیں ڈھونڈنی ہوں گی آپ کا کیا خیال ہے بھائی صاحب۔“ انہوں نے مقصود صاحب سے مشورہ کیا۔

”بالکل ٹھیک خیال ہے اب ان دونوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے کا کام شروع ہو جانا چاہیے انہوں نے مسکراتے ہوئے بھابی کی تائید کی۔“

یعنی کل سے بھابیاں ڈھونڈنا شروع ہرے!“ شیریں نے نعرہ لگایا۔

”ارے دیکھو! دونوں کیسے شرمارہے ہیں۔“ ارسلان نے سب کی توجہ ان دونوں کی طرف کی۔

”ہائے، بالکل لڑکیاں لگ رہے ہیں دونوں۔“ رمیز نے لقمہ دیا۔

”بھئی، آج کل تو لڑکیاں بھی ایسی نہیں شرماتی ہوں گی جیسے یہ دونوں شرمارہے ہیں۔“

”ٹوچ کر۔“ منان نے کشن اٹھا کر رمیز کو دے مارا۔

”چھوٹی امی یہ بتائیں کہ آپ اس چڑیل کی شادی کب کریں گی؟“ فرہاد نے موضوع کا رخ

شیری کی طرف کیا۔ چکا ہے۔ ناظرین و حضرات۔“ خلیل کنٹری کرتے۔

ہوئے بولا۔

”اب فرہاد شیرازی چلائیں گے مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گی، help me, help me, help me۔“ وہ مسلسل کنٹری کر رہا تھا۔ شیری نے فرہاد کو زمین پر پٹھا اور گھونسوں کی بارش شروع۔ تو میری شادی کروائے گا۔“ وہ اس کے اوپر دو زنانوں بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے پیٹ پر بیٹھی اسے مار رہی تھی کہ سکیزنہ بیگم چیخ کر بولیں۔

”شیری یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ سب کی ہنسی کو جیسے بریک لگ گیا اور شیری بھی فوراً ساکت ہو گئی۔ فرہاد نے خدا کا شکر ادا کیا مگر شیری اب بھی اس کے اوپر بیٹھی تھی اور اس کے بازو فرہاد نے پکڑے ہوئے تھے۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس سے پہلے انہیں اتنے غصے میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

”اٹھو فوراً سے پہلے، اب تم بچی نہیں رہیں کہ فرہاد کے ساتھ ایسی حرکتیں کرنی پھر دو۔“ شیری شرمندہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”تمہیں ہوش ہے کہ تم کیا کر رہی تھیں۔“

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ وہ زور سے بولیں۔ ”چپ کرو سکیزنہ غصہ مت کرو میں سمجھاؤں گی۔“ زورینہ بیگم نے انہیں صوفے پر بٹھالیا۔

”شیری اپنے کمرے میں جاؤ اور جلیل پانی کا گلاس لاؤ۔“ انہوں نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ سب لڑکے آہستہ آہستہ ادھر ادھر کھسک گئے۔ ”دیکھا بھابی آپ نے آج اس نے کیا حرکت کی۔ میں مانتی ہوں کہ یہ دونوں بچپن سے ایسے ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں مگر یہ.....“ سکیزنہ بیگم نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب شیری کو سمجھنا چاہیے ماشاء اللہ اب وہ

”بھئی جب ہمیں کوئی اچھا رشتہ ملا بس تب کریں گے۔“ سکیزنہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا! تو پھر آپ لڑکیاں دیکھنا شیری کے لیے کب شروع کریں گی۔“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ ”ہائے لڑکے باؤ لے ہوئے ہو کیا۔ ہم بھلا شیری کے لیے لڑکیاں کیوں دیکھیں اس کی شادی تو لڑکے سے ہوگی۔“ شیری نے حیرانگی سے فرہاد کو دیکھا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھی تھی جبکہ باقی سب کے چہروں پر دبی دبی ہنسی تھی۔

”ارے چھوٹی امی آدھا تو یہ لڑکا ہے اور آدمی لڑکی اور انشاء اللہ ہمارے ساتھ رہتے رہتے یہ اگلے دو تین سالوں میں مکمل طور پر لڑکا بن جائے گی تو پھر آپ اس کے لیے لڑکی ہی دیکھیں گی ناں۔“ ”بھئی کیا مطلب؟“ سکیزنہ بیگم نے کہا۔

”دیکھیں چھوٹی امی، شیری اپنے آپ کو لڑکا ہی سمجھتی ہے۔ اور اب ایک لڑکے کی دوسرے لڑکے سے شادی نہیں کر سکتے ناں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”فرہاد کے بچے رک! تجھے میں پوچھتی ہوں۔“ شیری اپنے بازو کو رول کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے کیا غلط کہا ہے۔ بھئی سب میری بات سے متفق ہیں۔“ وہ دوڑتے ہوئے بولا۔ سب مسلسل ہنس رہے تھے۔

”رُک تجھے میں بتاتی ہوں۔ یہ میری شادی لڑکی سے کروائے گا۔ رک تو ذرا۔“ وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے بولی۔

”لو آج کی رات پھر سے فرہاد کی ہائے ہائے کر کے گزرے گی۔“ ارسلان نے ریمز کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”اور فرہاد ایک بار پھر سے شیری کے ہتھے چڑھ

بڑی ہو گئی ہے۔ کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے۔
اب نہیں سمجھے گی تو کب سمجھے گی۔“ انھوں نے شکایتی
لہجے میں کہا۔

”ہاں میں سمجھتی ہوں۔ چلو میں خود اس سے
بات کروں گی تم فکر نہ کرو۔“

”بھابی پلیز اسے سمجھائیں۔ اسے میری باتوں
کا تو ذرا اثر نہیں ہوتا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی
باتیں سمجھے گی۔“

”ہاں میں اسے سمجھاؤں گی۔“ انھوں نے ان
کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

”شیری بیٹا! تم سوئی تو نہیں؟“ زرینہ بیگم اس
کے کمرے میں داخل ہو کر بولیں۔ وہ گھٹنوں میں سر
دیے بیٹھی تھی۔

”ارے بڑی امی! آئیں ناں۔“ اس نے مسکرا
کر انہیں دیکھا۔

”میری بیٹی کیا کر رہی ہے۔“ وہ اس کے پاس
بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”کچھ نہیں میں نے کیا کرتا ہے۔“

”پریشان ہو! تم ہاں۔“ انہوں نے پیار سے
اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے پوچھا۔

”بڑی امی آپ نے ماما کو دیکھا۔ انھوں نے
سب کے سامنے مجھے کتنی بری طرح ڈانٹا اور مجھے
میری غلطی بھی نہیں بتائی۔“ اس کے چہرے میں
بہت معصومیت تھی۔

”جان غلطی آپ کی تھی، مگر سب کے سامنے
بتانے والی نہیں تھی۔“ وہ اس کے بال سہلا کر بولیں
جوان کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔

”کیا مطلب؟ میں نے کیا کیا۔“ شیری نے
حیران ہو کر ان سے پوچھا۔

”جان اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔ ٹھیک ہے تم

اور فرہاد بہت کلوز رہے۔ ہو چپن سے ہی، مگر اب اتنا
کلوز ہونا ٹھیک نہیں۔ تم سمجھ رہی ہونا ہر چیز میں
ایک distance ہونا چاہیے۔ اب آپ بچی
تھوڑی ہیں کہ آپ کو ہر بات سمجھانی جائے۔“

”مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔“ وہ
ساری باتیں خود سمجھ جائے گی۔ ہیں ناں۔“ وہ ہنستے
ہوئے بولیں۔ ”ٹھیک ہے ہم نے آپ کو زیادہ
آزادی دے رکھی ہے۔ آپ اپنی مرضی سے
ڈرینگ کرتی ہو اپنی مرضی سے کہیں آ جاسکتی ہو مگر
چند باتیں تو آپ کو ہماری ماننی پڑیں گی۔ آپ مانو گی
ناں ہوں؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

”جی بڑی امی! میں سمجھ گئی کہ آپ کہنا کیا چاہتی
ہیں، مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میں لڑکیوں
والے کپڑے پہنوں گی اور فرہاد کی پٹائی نہیں کروں
گی۔“ وہ فوراً اٹھ کر بولی۔

”ٹھیک ہے بھئی، ہم نے مان لیا۔ اب تو آپ
کا موڈ ٹھیک ہے ناں۔“ وہ ہنستے ہوئے اسے پیار کر
کے بولیں۔

”جی بڑی امی فکر نہ کریں۔“ اس نے بڑے
وٹوق سے اپنی تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

ان دو سالوں میں زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ گھر
اور نہ گھر والے۔ بس شیری میں انیس بیس کا فرق
آ گیا تھا۔

اس کی ڈرینگ یا اس کے بچکانہ پن میں نہیں
وہ بس تھوڑی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ گھر میں اور گھر کے
کاموں میں اس نے دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔

اب وہ اپنے بھائیوں کے درمیان کم گھستی تھی۔
ہاں البتہ فرہاد کے ساتھ اب بھی وہ ویسی تھی۔ ان دو
سالوں میں گھر میں دو نئے افراد کا اضافہ ہو گیا تھا۔
فائقہ بھابی جو کہ پہلے جلیل کی خالہ زاد تھیں اب ان کی

شریک سفر ہونے کا اعزاز پا چکی تھیں اور سلمیٰ بھابی جو کہ پہلے منان کے ساتھ یونیورسٹی میں تھیں اب ان کے گھر میں آگئی تھیں۔

منان بھابی نے جب اپنی خواہش کا اظہار کیا تب سب نے انھیں چھپا رستم کا خطاب دیا کیونکہ ہمیشہ سب سے سنجیدہ وہی ہوتے تھے۔ البتہ سلمیٰ بھابی کے آنے کے بعد ان کے کئی پول کھلے تھے۔

سب کی طرح ان دونوں کو بھی شیری بہت عزیز تھی۔ اب سکیٹہ بیگم نے شیری کو لڑکیوں والے گن سکھانے کی ذمہ داری اپنی بہوؤں کے سپرد کر دی تھی، مگر سب کی طرح وہ بھی اس کوشش میں ناکام رہی تھیں۔

جب بھی وہ کچن میں ہوتیں شیری کو بلا لیتیں اور اسے اپنے مفید مشوروں سے نوازتیں۔ شیری صرف سننے کی حد تک استعمال کرتی البتہ ان دو سالوں میں اس نے اچھی سی چائے بنانا سیکھ لی تھی اور سکیٹہ بیگم نے چائے بنانے کی ذمہ داری اسے دے دی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اوائے ہوئے! کیا بات ہے۔ میری برتھ ڈے کی تیاری بڑے جوش و خروش سے ہو رہی ہے بھئی۔“ شیری گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی تو سب ہال کو سجانے میں مصروف تھے۔

”ہاں بھئی، بقول بھابیز ہماری اکلوتی نند ہے اس کا برتھ ڈے ہم خوب مزے سے سیلبریٹ کریں گے۔“ رمیز نے غبارے میں ہوا بھرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”چلو شیری جلدی سے اپنا بیگ ویک رکھ کر کام پر لگو، ہم سب کب سے کام کر رہے ہیں۔“ فرہاد نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، ہم نے کتنا پسینا بہایا ہے اور کہتے ہیں مزدور کا پسینا خشک ہونے سے پہلے اسے اس کی مزدوری مل جانی چاہیے تو ہمیں ہماری مزدوری کون دے رہا ہے۔“

ارسلان بھی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
”بھئی تم لوگوں نے کیا ہی کیا ہے جو مزدوری مانگ رہے ہو؟“ فائقہ بھابی نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”اس پورے ہال کو سجانے میں ہم نے تین گھنٹے صرف کیے اور بھابی کی نظر میں ہم بیچاروں نے کیا ہی کیا ہے۔“ ارسلان افسوس کرتے ہوئے بولا۔

سلمیٰ اور شیری ان کی نوک جھونک پر ہنس پڑیں۔ ”چلو شیری تم جلدی سے آ جاؤ۔“ سلمیٰ بھابی نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

”بس بھابی ابھی دو منٹ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔“ سچی آج یونیورسٹی میں تھک گئی۔ ابھی شاور لوں گی تو بالکل فریش ہو جاؤں گی پھر آپ لوگوں کی ہیلپ کر دوں گی۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے روم میں چلی گئی۔

”بھئی جو بھی کہو تمہاری بھابیوں نے محنت بڑی کی ہے۔“ جلیل نے کہا۔

”آہا واہ جی واہ! بھابیوں نے صرف محنت کی ہے اور ہم تینوں نے کیا یہاں جھک مارا ہے۔“ فرہاد ٹیبل پر چیزیں رکھتے ہوئے بولا۔ فائقہ اور سلمیٰ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

”یار جب سے بھابیز آئیں ہیں ہماری تو ویلیو کم ہو گئی۔“ رمیز ارسلان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
”یہ تو بس اپنی اپنی بیگم کے گن گاتے ہیں۔“ ارسلان نے بھی پورا پورا ساتھ دیا۔ ”اچھا چلو چھوڑو۔ یہ بحث یہ بتاؤ کہ نعمان کب آ رہا ہے۔“ منان نے بحث کو ختم کر۔ نے کی غرض سے سوال کیا۔

”ارے ہاں۔ شام کو فون تو آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ پوری کوشش کروں گا کہ برتھ ڈے سے پہلے پہنچ جاؤں۔“ ارسلان نے جواب دیا۔ ”اور ہاں کہہ رہے تھے کہ ایک بہت بڑا سر پرانز لے کر آؤں گا۔“

سب کے لیے۔“

”ارے لڑکی، اسے اندر تو آنے دو۔“ فائقہ

بھابی نے شیریں کو ٹوکا۔ ”کیسی ہو فیروزے۔“
”ٹھیک ہوں بھابی، آپ کیسی ہیں۔“ وہ جھپکتے ہوئے بولی۔

”ہم سب بالکل ٹھیک ہیں۔ ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو تم۔“ سکیئہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ ”آؤ فیروزے ادھر آ جاؤ ہمارے پاس۔“ سلمیٰ بھابی نے خلیل کو شرارت سے دیکھ کر کہا۔ جس کی والہانہ نظریں فیروزے پر جمی ہوئی تھیں سلمیٰ کو دیکھ کر اس نے فوراً اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور سلمیٰ بھابی فائقہ کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہنسی تو فائقہ نے آنکھ کے اشارے سے کہا۔ ”مجھے بھی پتہ لگ گیا ہے۔“

”بھئی کیک کب کاٹنا ہے۔“ فرہاد چیزوں کو لپٹائی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”بس نعمان بھائی آ جائیں تو کیک کاٹوں گی۔“ شیریں نے گھڑی پر نظر دوڑائی جہاں گیارہ بج رہے تھے۔ ”مجھے آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ شیریں مجھے گھر بھی جانا ہے۔“ فیروزے بھی گھڑی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ گھر پر گیارہ بجے کا ٹائم دے کر آئی تھی۔ اسے اتنی آزادی نہیں ملی تھی کہ اپنی مرضی سے دیر تک وہ باہر رہ سکے۔

”آپ فکر نہ کریں فیروزے ہم آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“ خلیل اس کی پریشانی دیکھ کر بولا۔

”ہاں بھئی ہمارے دیور تو کب سے تیار ہیں۔“ فائقہ معنی خیز انداز میں بولی۔ تو خلیل جھینپ گیا جبکہ فیروزے نا سمجھی والے انداز میں مسکرائی۔

”لو نعمان بھائی آ گئے۔“ رمیز نے گلاس ڈور سے انہیں داخل ہوتے دیکھا۔ ”تو شکر ہے خدا کا ورنہ مجھے لگا کہ کیک کل ہی کٹے گا۔ ویسے کل شروع ہونے میں صرف 25 منٹ باقی ہیں۔ فرہاد بولا۔

”چلو اچھا ہے وہ بھی آ جائے ورنہ شیریں کا موڈ خراب ہو جائے گا۔“ فائقہ بھابی نے کہا۔ وہ جانتی تھیں کہ شیریں اپنے بھی بھائیوں سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ کسی ایک کے بغیر کبھی بھی کیک نہیں کاٹے گی۔

”میں نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ کیک کٹنے سے پہلے آئے۔“ سلمیٰ بھابی اپنے دوپٹے کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ ”آج ہی اس کا انٹرویو تھا خدا کرے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔“

کیسا رہا پوچھا تم نے؟“ منان اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”لو بھلا جب خیر سے آئیں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔“ سلمیٰ میز پر رکھی چیزوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”چلو بھئی، کیک کب تک کاٹنا ہے 9 تو بج گئے ہیں۔“ فرہاد نے اپنے سامنے پڑی چیزوں کو دیکھ کر کہا۔ ”بھئی برتھ ڈے گرل کہاں ہے؟ وہ بھی تو آئے۔“ نعمان بھائی نے کہا۔

”میں یہاں ہوں۔“ بلوکلر کی جینز اور ڈارک پنک کلر کی ٹوپ میں بالوں کی اونچی سی پونی بنائے بغیر کسی جیولری کے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”ہائے لڑکی! آج کے دن تو کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہنتی۔“ سکیئہ بیگم نے اپنا روایتی درد دکھایا۔

”ارے چھوڑیں ناں چھوٹی امی۔ دیکھیں تو ہماری گڑیا کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“ فائقہ بھابی نے جلدی سے کہا۔ اس کے پہلے کہ وہ ناراض ہوتیں۔

”السلام علیکم!“ خوبصورت سی آواز ہال میں گونجی۔ ”وعلیکم السلام میڈم صاحبہ! اب آرہی ہو۔“

ٹائم دیکھا ہے تم نے۔“ شیریں نے فیروزے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ پرل اور گرین کلر کے کبھی نیشن والے سوٹ میں میچنگ ہلکے پھلکے ایئر رنگ کے ساتھ بالوں کی پونی کیے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نعمان کے ساتھ ایک اور شخص بھی اندر داخل ہوا۔ ”ہیں یہ کون ہے؟“ سلمیٰ بھابی نے اس شخص کو دیکھ کر نعمان سے سوال کیا۔ سب نے اس شخص کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا جو اپنی طرف سب کو ایسے متوجہ دیکھ کر کچھ کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

”بھئی بوجھو تو جانیں.....“ نعمان نے جیسے سب کا تجسس بڑھایا پھر مسکراتے ہوئے اس اجنبی کو دیکھا ”آپ بتائیں گے تو ہم جانیں گے۔“ ”نہیں پہچان پائے ناں آپ؟ دیکھا میں نے کہا تھا ناں شہود یہ لوگ تمہیں نہیں پہچان پائیں گے۔“ ”شہود کون شہود؟“ ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی یہ ہماری پھوپھو کا بیٹا ہے۔“ نعمان نے آخر تجسس کو ختم کر ہی دیا۔

”جہاں تک مجھے پتا ہے تو پھوپھو کے تین بچے ہیں ستارہ، اروہ اور شہود زاب یہ شہود کب پیدا ہوا تو مجھے پتا نہیں۔“ ارسلان کندھے اچکا کر بولا۔ ”ارے ماشاء اللہ شہود بیٹے! تم تو لندن میں ہوتے تھے۔ اپنے چچا کے پاس۔“ ”زیرینہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ تو شہود کی کچھ ہمت بندھی۔ اپنے اتنے سارے کزنز دیکھ کر اسے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”ارے شہود تمہاری پھوپھو کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ وہ جب پیدا ہوا تو اس کو اس کے چچا نے اپنا بیٹا بنا لیا اور اسے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر یہ وہیں رہا ہے۔“ ”سیکنڈ بیگم اسے پیار کر کے تفصیل بتانے لگیں۔ وہ سب سے مل کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”مجھے پتا نہیں آپ میں سے کون؟ کون ہے؟، بس میں اُن سب میں سے ایک شخص کو پہچان سکتا ہوں اور وہ شیریں ہے۔“ اس نے شیریں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تو شیریں نے شا کو ہو کر اسے دیکھا۔ ”مجھے..... مجھے کیوں بھلا؟“ وہ کچھ الجھ سی گئی۔

”بھئی سارے راستے نعمان نے آپ کی جو تعریف کی اور جو حلیہ بیان کیا مجھے وہ کسی اور میں نظر نہیں آیا۔“ اس نے گہری نظروں سے شیریں کو دیکھا۔ ”آؤ بھئی آؤ شہود Wel come to the family۔“ فائقہ بھابی نے شیریں کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے جلدی سے موقف بدلا۔

”بھئی تفصیل تم سے بعد میں سن لیں گے پہلے کیک کاٹ لیں۔ آج شیریں کا برتھ ڈے ہے۔“ مقصود صاحب نے شیریں کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا تو سب کیک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رات کو شہود سے سب لندن کی باتیں سنتے رہے۔ جس طرح شہود نے شیریں کا مذاق بنایا تھا۔ شیریں کو اس شخص سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اسے شہود میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سو وہ حسب معمول اپنے گفتگوں کھول کر بیٹھ گئی اور بڑبڑانے لگی۔ ”ہونہہ حلیہ! اپنا حلیہ دیکھا ہے کیسا بندر لگتا ہے۔ میرا حلیہ بتا رہا ہے اور بھائی! انھیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گی اور یہ فرہاد کہاں رہ گیا۔ ابھی تک وہ میرے گفتگوں دیکھنے نہیں آیا۔“ وہ بار بار باہر دیکھتے ہوئے ابھی جا رہی تھی بول رہی تھی۔ سب کی ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں اور اسے اور غصہ چڑھ رہا ہے۔

اسے کوئی بلا نے نہیں آیا۔ اس بات پر اس کا پارہ اور ہائی ہو گیا۔ صبح جب وہ کچن میں پانی لینے کے لیے گئی تو فائقہ اور سلمیٰ بھابی بڑے مزے سے ناشتا بنا رہی تھیں۔ ”شہود کتنا زبردست لڑکا ہے۔“ سلمیٰ بھابی سینڈوچ بناتے ہوئے بولیں۔ ”ہاں لگتا ہی نہیں کہ یہ پاکستان میں نہیں رہتا اور پہلی بار آیا ہے۔“ فائقہ بھابی نے پراٹھا تو بے پردہ التے ہوئے سلمیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کتنی مزے کی باتیں کرتا ہے۔ ارے شیریں آؤ بھئی ہماری تھوڑی ہیلپ ہی کر دو۔“ سلمیٰ بھابی

استدلال کر بولیں۔

”نہیں نہیں آپ پہلے ”شہود نامہ“ ختم کر لیں تو میں کچھ کہوں اس تک چڑے کے بارے میں۔“ وہ نمٹے سے چھری اٹھاتے ہوئے بولی۔

”کیوں بھئی اس نے تمہارے بارے میں کیا کہہ دیا جو تم اتنی آگ بجولہ ہو رہی اس کے بارے میں۔“ فائقہ بھابی نے پوچھا۔

”لو اور سنو کھل اس نے جو میری انسلٹ کی وہ کسی کو یاد ہی نہیں۔“ ٹماٹر کاٹتے ہوئے شیرینے خفگی سے ان کو دیکھا۔

”ارے بھئی اس نے تو مذاق کیا اور دیکھو اس نے کہا تھا کہ وہ صرف تمہیں پہچانتا ہے یہ تو تمہارے لیے اعزاز کی بات ہے۔ جان!“ سلمیٰ بھابی اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”جو بھی ہے بھابی۔ مجھے وہ شخص بالکل پسند نہیں اور آپ میرے سامنے اس کی تعریف ناں ہی کریں تو اچھا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”بھابی ایک گلاس پانی ملے گا۔“ شہود کی آواز پر وہ تینوں چونکیں۔

”ہیں..... ہاں ہاں بالکل۔“ فائقہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس نے ایک سرسری نظر شیریں پر ڈالی اور گلاس لے کر نکل گیا۔ ایک لمبے کو گڑ بڑا سی گئی۔ سلمیٰ اور فائقہ نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ لا پرواہی سے نہین دی ”ارے تو اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اچھا ہے میرے خیالات، اس تک پہنچ گئے۔ اس کے ہٹ دھرم لمبے پردہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”اسلام علیکم ممانی جان! کیسی ہیں آپ؟ کل سے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔“ شہود لاؤنج میں داخل ہو کر بولا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹے! تم بتاؤ کیا کر رہے تھے؟

آرام سے تو ہوتاں تم؟ یہاں کوئی چیز چاہیے ہو تو بلا جھجک کہہ دینا یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ زرینہ بیگم نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔

”ارے شہود بیٹا تم اٹھ گئے۔ ارسلان تمہارا پوچھ رہا تھا۔ ابھی وہ باہر نکل گیا ہے۔“ سکینہ بیگم لاؤنج میں داخل ہو کر بولیں۔

”جی ممانی جان! میری بات ہو گئی ہے اور بھابی آپ لوگ کیا کر رہی ہیں۔“ وہ دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ”ارے کچھ نہیں بھئی۔ میں اپنا ایک سوٹ کڑھائی کر رہی ہوں اور فائقہ اسے خراب کرنے میں لگی ہے۔ سلمیٰ نے شرارت سے فائقہ کو دیکھا فائقہ کو دیکھ کر بولی۔ جو پوری کوشش کر رہی تھی مگر بیچاری ایک پھول بھی سج سے کاڑھ نہیں پار رہی تھی۔

”ایک تو تمہاری مدد کر رہی ہوں اور اور سے مجھے سنا رہی ہو۔“ فائقہ کے لمبے میں مصنوعی خفگی تھی۔

”مدد؟ تم اسے مدد کہتی ہو۔ تم غلط بناتی ہو اور پھر مجھے دوبارہ سے ادھیڑ کر ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔“ سلمیٰ بھابی سر کو ہلاتے ہوئے بولیں۔

”کیا...؟ اس کا مطلب میں نے جو اتنی محنت سے پھول کاڑھے تم نے ادھیڑ دیے۔“ وہ حیرت سے چہنچیں۔

تو اور کیا کرتی بھئی! میرے سوٹ کا سوال ہے۔“ سلمیٰ بھابی ترکی بہ ترکی بولیں۔

”ہائے میری محنت۔“ فائقہ بھابی نے سر پر ہاتھ مارا تو سب ہنسنے لگے۔

ان دونوں کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اس لیے تو گھر میں مسکراہٹوں کا راج تھا۔

”بھئی واہ!! بہت اچھے ٹائم پر چائے لائی ہو شیریں۔ اللہ تمہیں اچھا سا دولہا دے۔“ سلمیٰ بھابی ٹرے سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”بھابی دعا دینی ہے تو اچھی سی دیں۔ یہ دولہا

دولہا والی دعائیں نہ دیا کریں۔“ شیری مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لو اور دیکھو یہ واحد لڑکی ہے۔ جو کہہ رہی ہے کہ اچھے دولہا کی دعا میں نہ دیں۔ ورنہ لڑکیاں تو پرنس چارمنگ کی دعائیں لیتیں ہیں۔“ فالقہ نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

شیری نے ابھی چائے کا کپ لیا ہی تھا کہ زرینہ بیگم ٹھکا۔ ”شیری بیٹا تم شہود کے لیے چائے نہیں لائیں۔“ اس کا منہ اس کا نام سنتے ہی کڑوا ہو گیا۔ ”تمہیں کب عقل آئے گی شیری؟“ سکیمنہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔ ماما مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ موصوف بھی یہاں موجود ہیں۔ ورنہ ان کے لیے بھی لے آتی۔“ وہ روکھے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے میٹرھیوں سے اترتے دیکھ لیا تھا۔“ وہ اسے نگاہوں کے حصار میں لپیٹے ہوئے تھا۔

”اونہ!“ شیری کے منہ سے نکلا۔ سکیمنہ بیگم نے اسے گھورا اس سے پہلے کہ وہ بولتیں وہ چائے لینے کے لیے اٹھ گئی۔ ”یہ لیں۔“ وہ اس کے سامنے کپ رکھتے ہوئے بولی۔ شہود نے شیری کو دیکھا۔ بلیک جینز کے اوپر ڈھیلی سی شرٹ میں دوپٹے سے بے نیاز وہ اسے اپنی سی لگی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کپ پکڑا تو شیری کے نقوش اور تن گئے۔

”آپ اسی صلیے میں رہتیں ہیں کیا؟“ اُس نے اسے مخاطب کیا۔

”کیوں آپ کو کیا اعتراض ہے۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

”نہیں اعتراض تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ بھابیوں جیسے کپڑے نہیں پہنتیں۔“ اس نے دونوں کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ وہ دونوں اپنا کام چھوڑ کر ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ ”مجھے ایسے ہی پسند ہے۔“ شیری نے مختصر سا جواب دیا۔

”مگر۔۔۔“ وہ کچھ بولتے بولتے رکا۔ شیری نے اسے گھورا۔ شاید وہ الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

”میرا مطلب ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ جینز پہنتی ہیں مگر ضروری تو نہیں کہ آپ یہ مردانہ شرٹس پہنیں آپ کچھ اور بھی تو جینز کے ساتھ پہن سکتیں ہیں۔

میرا مطلب ہے کہ جب سے میں آیا ہوں میں نے آپ کو ایسے بے ڈھنگے کپڑوں میں ہی دیکھا ہے۔ میں نے آپ کو کبھی شلوار میض میں نہیں دیکھا اور نہ آپ نے کبھی دوپٹا اوڑھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ اتنی بڑی تو ہیں کہ آپ کو گھر میں دوپٹا لینا چاہیے۔ گھر میں آپ کے بھائی اور فادر ہوتے ہیں۔“

”ہمارے ملک میں اور یورپ میں اتنا تو فرق ہونا چاہیے آخر ہم مشرقی لوگ ہیں اور سب سے بڑھ کر مسلمان ہیں اور جہاں تک میں اسلام کو جانتا ہوں تو اس نے عورت کو پردہ کرنے کا کہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ آج کل یہ سب کرنا مشکل ہے کیونکہ ہماری جنریشن بہت تیزی سے مغربی رنگ میں ڈھل رہی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا آپ بھول جائیں۔ تھوڑا بہت فیشن ٹھیک، مگر اتنا نہیں کہ آپ بالکل ہی الگ دنیا کے باسی لگیں۔ تو مجھے یہ پسند نہیں۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھا اور گلاس ڈور سے باہر نکل گیا۔ شیری میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہاں سے اٹھ جائے۔

☆.....☆.....☆

”ہائے اللہ کہاں رکھ دیا“ میں نے وہ سوٹ؟“ وہ اپنی الماری کے سارے کپڑے نکال کر بولی۔ ”ارے کیا ڈھونڈ رہی ہو شیری!“ فالقہ بھابی کمرے کا حلیہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور تم نے کیا کباڑ خانہ بنا رکھا ہے اپنے کمرے کو؟“

ان کے صاف گوئی سے کہے جملے جیسے پتھر بن کر شیری کو اپنے منہ پر پڑتے ہوئے محسوس

ہوئے۔ خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا فایقہ اور سلمیٰ بھی حیرانی سے اس کو دیکھ رہی تھیں جبکہ زریںہ اور سکینہ بیگم ساکت ہی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”ارے بھابی، وہ جو آپ لوگوں نے مجھے پچھلے سال زبردستی کا ایک سوٹ دلوایا تھا ناں! وہ ڈھونڈ رہی ہوں۔“ وہ الماری میں منہ دیتے ہوئے بولی۔

”بھئی تمہیں وہ کیوں چاہیے۔“ وہ اس کے کپڑے سمیٹتے ہوئے بولیں۔

”ارے وہ نہیں چاہیے اس کا دوپٹا چاہیے۔ اچھا تو تم پر شہود کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔“ وہ ساری بات سمجھ کر بولیں۔

”ارے بس کریں بھابی۔ اس الو کا تو نام بھی میرے سامنے مت لیں۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں۔ اور جس طرح اُس نے مجھے کل کہا دل کرتا ہے کہ اس کا منہ توڑ دوں۔“ وہ غصے سے الماری کا دروازہ پٹختے ہوئے ان کی طرف پلٹی۔

”تو جان! پھر کیوں دوپٹا ڈھونڈ رہی ہو تم۔“ فائقہ بھابی کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔

”ارے بھابی! میں نے سوچا ہے جب تک وہ یہاں ہے میں کم سے کم تب تک تو وہ کپڑے پہنوں ورنہ پتا نہیں وہ کیا کرے گا۔ وہ تو شکر کریں کوئی بھائی نہیں تھا ورنہ پتا نہیں وہ پھر کون سا لیکچر سننے کو ملے گا۔“

”ارے تم دونوں یہاں ہو؟ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔“ سلمیٰ بھابی اندر داخل ہوتے بولیں۔

”بھئی ہم دونوں شہود کی باتوں کو ڈسکس کر رہے تھے۔“ فائقہ بھابی کے جواب پر سلمیٰ نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے شیریں کو سوچتے ہوئے دیکھا۔

”ہوں مجھے لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم میں اور مغرب میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے ہے ناں!“

”شیریں یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہیں غلط ٹھہرا رہے ہیں مگر شہود کی باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ تم جس ماحول میں

پلی بڑی ہو۔ تم اس کے مطابق ڈھل جاؤ گی مگر جان تم نے اگلے گھر بھی تو جانا ہے ناں۔ تمہارا بھی پرنس چارمنگ آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ تو میری جان لڑکیوں میں بھوڑی بہت نسواہنت کا ہونا لازمی ہے وہ شیریں کے پھولے ہوئے منہ کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ ”بھئی دیکھنا ہماری پرنس کے لیے پرنس چارمنگ سے بھی زیادہ ہینڈسم زیادہ ڈیشنگ اور زیادہ خوبصورت اور زیادہ۔“

”بھئی بس بس بس.....“ فائقہ سلمیٰ کی بات پر بریک لگا کر بولی۔ ”ہمیں پتا چل گیا محترمہ بس کریں۔“

شیریں کو ہنسی آئی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ ارے دیکھو میں بھول گئی۔ باہر بارش ہونے والی ہے تو میں تمہیں بلانے آئی تھی اور یہاں باتوں میں لگ گئی۔ چلو بھئی چلیں انجوائے کریں اس خوبصورت موسم کو۔“ سلمیٰ بھابی ان دونوں کو گھسیٹتے ہوئے بولیں۔

”بھابی کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ قریب کی آواز پر وہ رک گئیں۔

”ارے بھئی بارش شروع ہو گئی ہے تو سوچا بارش میں نہائیں۔“ فائقہ نے جواب دیا۔

”تو شیریں کہاں ہے۔“ اس سے پوچھا۔ ”وہ بھی آرہی ہے۔ کیوں کوئی کام تھا۔“

”نہیں بس میں اس کے لیے کچھ لایا تھا وہ ہی دکھانا تھا۔“

”تم نے غور کیا سکینہ کہ شیریں اب بدل رہی ہے۔“ بارش میں تینوں کو نہاتا دیکھ کر زریںہ بیگم نے سرگوشی کی۔

”جی بھابی! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ بس یہ کپڑے بھی انسانوں والے پہننا شروع کر دے تو بس.....“ وہ چائے کا سپ لیتے

ہوئے بولیں۔

”ہوں۔ سب اس لیے ہوا ہے کہ اب گھر میں فاقہ اور سہمی آگئیں ہیں۔ اسے کچھ کمپنی مل گئی ہے۔ اب وہ زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ وہ شیری کو سمجھائیں۔ تم دیکھنا یہ دونوں مل کر کوشش کر رہی ہیں۔ ہماری شیری بھی ایک دن مکمل طور پر گھرداری سیکھ لے گی۔ ابھی تو اس میں بچپنا ہے۔ اپنے ابا کے گھر لاؤ نہیں اٹھوائے گی تو اور کہاں اٹھوائے گی۔“ زرینہ بیگم نے محبت سے ان تینوں کو دیکھا جو دنیا سے بے خبر بارش کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ”ہوں۔ اللہ کرے اسے اگلا گھر بھی نیک ملے اور میری بچی خوشی و خرم رہے۔ آمین۔“

”آمین!“ زرینہ بیگم کے لبوں سے بھی اس بچی کی خوشیوں کے لیے دعا نکلی۔ کوئی اوپر سے شیری کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا بچپنا اسے بہت پسند تھا اور وہ اسے ایسے ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ زندگی بھر۔

☆.....☆.....☆

”بھئی آج گھر میں بڑی خاموشی ہے۔ خیریت تو ہے۔“ جلیل نے کچھ حیرانی سے نعمان سے پوچھا۔ ”ہاں گھر کی خواتین باہر گئیں اور لڑکے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔“ نعمان نے جواب دیا۔

”بھئی کیا ہو رہا ہے۔ آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہیں۔“ وہ دوپٹا سنبھالتے ہوئے نیچے اتر رہی تھی۔

”ارے شیری! آج کوئی تہوار وغیرہ تو نہیں ہے جو تم شلوار قمیض میں نظر آ رہی ہو۔“ نعمان اس کو دیکھ کر بولا۔ ”ہاں کچھ لوگوں کو میرا اس گھر میں اپنی مرضی سے گھومنا پسند نہیں۔“ اس نے بہت حقارت سے شہود کو دیکھتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا جو بظاہر بہت انجان بنا میگزین پڑھنے میں گم تھا۔ ”ارے! ہماری پرنس کو کس نے کچھ کہہ دیا۔“ جلیل اسے

اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”کسی کی اتنی ہمت جو مجھے کچھ کہے اس کا حلیہ ناں بگاڑ دوں۔“ وہ مسلسل اسے گھور رہی تھی۔ اچھا چلو غصہ چھوڑو بتاؤ تمہاری بھابی کب آئیں گی۔“ جلیل نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ”پتا نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”ارے واہ جی واہ! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ شہود بھائی ذرا مجھے چٹکی کاٹیں۔“ فرہاد کمرے میں داخل ہو کر جیسے حیران رہ گیا۔ ”کیوں خیریت؟“ شہود اسے دیکھ کر بولا۔

”آج ہمارے گھر کی رانی اپنے روایتی حلیے میں نہیں ہے۔“ وہ شرارت آمیز حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”رک فرہاد تو پٹے گا میرے ہاتھوں۔“ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”چل چھوڑ شیری چل“ آتھے اپنی نئی سی ڈی دکھاؤ۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”نہیں“ مجھے نہیں دیکھنی تمہاری سی ڈی۔ وہ منہ بسور کر بولی۔ ”تیری فیورٹ گیم ہے اس میں۔“ فرہاد نے سرگوشی کی۔ شیری نے ہنسی اچکا کر دیکھا۔ ”چل آتھے تیری فیورٹ چاکلیٹ بھی دوں گا۔“ وہ اسے کندھے سے تھام کر کے جاتے ہوئے بولا۔

”یہ دونوں ایسے ہی ہیں۔“ شہود نے انہیں جاتا دیکھا تو نعمان سے پوچھنے لگا۔

”یہ تو کچھ نہیں تم نے کبھی انہیں لڑتے نہیں دیکھا۔ خدا کی پناہ۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”سچ پوچھو تو ہمارے گھر کی رونق انہی کی وجہ سے ہے۔ شیری اور فرہاد بچپن ہی سے بہت کلوز رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنی ہر بات شیئر کرتے ہیں۔ ان کی لڑائی ان کا پیار بہت منفرد ہے۔ شیری تو اسے اپنا جگری دوست کہتی ہے۔ جب تک لڑائی نہ کریں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ جلیل ہنستے ہوئے

بتا رہا تھا۔ جبکہ شہود کسی گہری سوچ میں تھا۔

☆.....☆.....☆

”جی ای..... سب ٹھیک ہے۔“

”جی ماموں وغیرہ سب ٹھیک ہیں۔ آپ کا بہت پوچھتے ہیں۔ ہوں۔ ہوں، جتنا آپ نے اس کے بارے میں بتایا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ ہاں تھوڑی بہت جو کسر ہے ناں وہ میں پوری کر دوں گا جی۔“

شہود بڑے مزے سے اپنی والدہ سے باتیں کر رہا تھا جب شیریں آئی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ ”جی ای آپ بالکل فکر نہ کریں۔ پسند ہے، بس آپ تیاری رکھیں۔ باقی میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔“ شیریں انتظار میں تھی کہ وہ کب فون بند کرے اور کب وہ اس سے آنے کو کہے۔ مگر وہ ڈھیٹوں کی طرح مسلسل بات بڑھائے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے شیریں کو تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا تھا اور وہ کوئی چالیں مٹ نہیں کرتا تھا۔ اسے اس کا غصے سے بھرا سرخ چہرہ بہت پسند تھا۔ ”اچھا امی گھر میں سلام کہیے گا۔ اللہ حافظ۔“

وہ فون بند کر کے شیریں کی طرف مڑا۔ ”کوئی کام تھا آپ کو۔“

”مجھے آپ سے کوئی کام نہ تھا اور نہ ہوگا۔ نیچے آپ کو سب کھانے پر بلارہے ہیں۔“

وہ کہہ کر رکی نہیں اور چل دی۔ شہود بھی مسکرا کر اس کی پیروی کرنے لگا۔

”ارے بیٹا! کتنی دیر لگا دی تم نے کیا کر رہی تھیں۔“ منصور صاحب نے شیریں سے پوچھا۔ ”بڑے ابو یہ صاحب فون پر بڑی تھے۔“ اس نے تپے ہوئے انداز میں شہود کی جانب دیکھا۔

”Sorry ماموں! وہ میں ماما سے بات کر رہا تھا۔“ شہود نے معافی دی۔ ”ارے کیسی ہیں وہ۔“

سیکنہ بیگم نے پوچھا۔ ”اچھی ہیں آپ سب کو سلام کہہ رہی تھیں۔“ آئیں گی وہ بھی چند دنوں میں۔“ شہود سلاڈ پلیٹ میں ڈال کر بولا۔ ”آگے کیا کرنے کے ارادے ہیں تمہارے؟“ جلیل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ابھی تو پاکستان آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ سوچا نہیں کہ کیا کرنا ہے۔ ذرا دیکھ لوں اچھی طرح، پھر سوچوں گا کہ بھائی کے ساتھ بزنس کرنا ہے کہ خود کچھ کرنا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ہوں اچھی بات ہے۔ تم یہاں کا سسٹم سمجھ لو پھر کچھ کرنا۔“ منان نے بھی ہائی بھری۔

”اچھا بس۔ کیا ہم سکون سے کھانا کھالیں۔“ شیریں جو اتنی دیر سے باتیں سن رہی تھی چڑ کر بولی۔ ”جی مہارانی صاحبہ۔ جیسا آپ چاہیں۔“ منان ہاتھ جوڑ کر بولا۔ جبکہ شہود کو اس کا لہجہ ناگوار گزرا۔ مگر اس نے نظر انداز کر دیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آج مجھے کوئی کام دام کرنے کے لیے نہیں کہے گا۔ آج کے بعد میری چائے کی ڈیوٹی بھی ختم۔“ شیریں سب خواتین کو پا کر اونچی آواز میں بولی۔ ”کیوں؟ کیا آج سے مانیوں بیٹھ رہی ہو۔“ فائقہ بھابی نے شرارت سے سلمی بھابی کو آنکھ ماری۔

”ایک تو اس گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور

موضوع ہوتا ہی نہیں۔“ وہ چڑ کر فلور کشن پر بیٹھ کر بولی۔ ”دنیا شادی پر ختم نہیں ہوتی کسی کو پتا ہے کہ

نہیں کہ مہینے کے بعد میرے فائل پیپر ہیں۔ اس کے لیے مجھے تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک ہے کہ

نہیں۔“ وہ سب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ہوں ٹھیک ہے۔ تم دل لگا کر پڑھائی کرو اور اچھے نمبرز لاؤ۔“

سیکنہ بیگم نے اسے پیار سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تو میری شام کی چائے کی ڈیوٹی ختم۔“ وہ ایک بار پھر دل کی تسلی کر لینا چاہتی تھی۔ سودو بارہ بولی۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“ زورینہ بیگم نے کہا۔ اس

نے خدا کا شکر ادا کیا پھر ز کے بہانے ہی سہی اس کی جان تو چھوٹی۔

”بھابی اس کے لیے کوئی اچھا سارشتہ ڈھونڈنا شروع کریں ماشاء اللہ سے گریجویشن کرنے والی ہے۔“ سیکمنہ بیگم نے اسے جاتا دیکھ کر ز رینہ بیگم سے کہا۔ ہوں ماشاء اللہ۔ یہ اور فرہاد دونوں گریجویشن کر لیں گے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر بور ہو گئی تھی تو لاؤنج میں آگئی کہ چائے پی لے اور ساتھ تھوڑا سا T.V دیکھ لے تاکہ فریش ہو جائے۔

تبھی وہاں پر شہود آ گیا۔ طریقے سے بال بنائے ہوئے بڑی تہذیب سے پینٹ شرٹ پہنے ہوئے۔ اس نے دل میں سوچا کہ کہیں سے نہیں لگتا کہ یہ بندہ لندن میں پلا بڑھا ہے۔ خالصتاً دیہاتی لگتا ہے۔ وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ بولا۔

”آپ نے نعمان کو دیکھا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ایک فنکشن میں جانا ہے۔“ وہ خود ہی تفصیل بتانے لگا۔ ”نہیں میں نے نہیں دیکھا انھیں۔ ویسے کیا آپ ہمیشہ بھی بنے رہتے ہیں۔“ وہ پتا نہیں کیوں ایسا بول گئی بعد میں خود ہی پچھتائی۔ ”جی؟ کیا مطلب۔“ وہ حیران ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ ”میرا مطلب ہے آپ بھائی کے ساتھ فنکشن میں جا رہے ہیں۔ وہاں پر لڑکیاں بھی ہوں گی۔ وہ ایسے لڑکے پسند نہیں کرتیں Mama's boy جیسے۔ انھیں تو Rough اینڈ Tough لڑکے پسند ہوتے ہیں۔“ وہ پتا نہیں کیوں اس سے اتنی بات کر رہی تھی۔ وہ اس کا مطلب جان کر مسکرا دیا۔ ”یعنی میں آپ کو ایسے اچھا نہیں لگتا۔ ہیں ناں؟“ شہود نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”مجھے آپ ویسے بھی اچھے نہیں لگتے۔“ ترکی بہ ترکی جواب آیا۔ آپ ایسے رہیں یا ویسے dam care ادہ غصے سے بول کر اٹھنے لگی۔

”کیا آپ ہمیشہ انکارے چبائے رکھتے ہیں یا صرف مجھ سے بات کرتے ہوئے ایسی ہو جاتی ہیں۔“ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اور شیریں کو ز ہر لگ رہا تھا۔ وہ جانے لگی تو شہود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیریں کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ ایک بے اختیار جھٹکے سے مڑی۔

”ہم سے بھی مسکرا کر بات کر لیا کریں۔ ہمیں اچھا لگے گا۔“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئی جبکہ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر نہ جانے کیوں اسے غصہ نہیں آیا بلکہ پہلی بار دل عجیب طرح دھڑکا تھا۔ رات کو ٹیرس پر وہ کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی جب فرہاد آیا۔

”کیا کر رہی ہو تم یہاں؟ سب کو لگ رہا ہے کہ تم پڑھ رہی ہو اور وہ سارے مجھے باتیں سن رہے ہیں کہ تم بھی پڑھو۔ دیکھو شیریں کتنی محنت کر رہی ہے۔ انھیں کیا پتا کہ یہ صاحبہ یہاں چاند رات سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔“ اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے تشویش ہو گئی۔ ”تم ٹھیک ہو۔“ وہ اس کی طرف مڑی۔ ”لگ تو نہیں رہا کہ کچھ ہوا ہے۔“ فرہاد فکر مند ہو گیا۔ وہ اس کے لیے ایسا ہی تھا اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خاص خیال رکھنے والا۔ اسے یہ پتا نہیں کیوں معصوم سی لڑکی اپنے دل کے بہت قریب لگتی تھی۔

”اچھا چلو سو جاؤ۔ کافی رات ہو گی ہے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہوں ابھی جاتی ہوں تم جاؤ جا کر تھوڑا پڑھ لو ورنہ واقعی کم نمبر آئیں گے۔“ وہ جبراً مسکرائی۔ ”ہوں ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ عجیب سی شکل بنا کر بولا۔ ”Take care goodnight“ وہ کہہ کر چلا گیا۔

شیریں کو شام والی بات یاد آ گئی۔ شہود کا اس کا ہاتھ پکڑنا اور اس کے بدن میں سنسنی کا دوڑ جانا۔ فرہاد نے نہ جانے کتنی مرتبہ اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر

شیری کو ایسی فیلنگز کبھی نہ ہوئیں تھیں۔ یہ کون سا احساس تھا جو اسے بے محل کر رہا تھا ایک بہت خوبصورت ساجد بہ جیسے بہت خاموشی سے، اس کے دل میں اتر رہا تھا جسے شاید وہ

☆.....☆.....☆

اللہ اللہ کر کے اس کے پیپر ختم ہوئے۔ اسے لگا جیسے ایک اور زندگی ملی ہو جسے وہ کھل کر انجوائے کر سکتی ہو۔ اس نے اور فرہاد نے مل کر شاپنگ کا فیصلہ کیا۔ ”ہم دونوں شاپنگ پر جا رہے ہیں کسی نے چلنا ہو تو بتائے۔“ فرہاد نے لاؤنج میں آ کر کہا۔ ”ہم؟ ہم سے مراد۔“ فالقہ بھابی نے پوچھا۔

”ہم یعنی میں اور شیری۔ پیپر ختم ہوئے تو سوچا کہ کیوں نہ مل کر چند جینز اور شرٹس ہی لے لیں۔“ ”اچھا In! short تم لوگ کتوں کے پٹے لینے جا رہے ہو۔“ خلیل نے لقمہ دیا۔ ”خبردار جو کسی نے ہمارے بینڈز کو کچھ کہا۔“ فرہاد نے پر زور احتجاج کیا اور سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”بھئی یہ Dog bands کیا ہے۔“ شہود نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”لو اسے بھی بتاؤ کہ کتوں کے پٹے کسے کہتے ہیں۔“ ریمز ہنسی رد کرتے ہوئے بولا۔

”ارے وہ جو بینڈز نہیں ملتے وہ کیا کہتے ہیں؟“ ”Friendship Bands انھیں ہم In short کتوں کے پٹے کہتے ہیں۔“ نعمان نے تفصیل بتائی۔ اور ایک دفعہ پھر سب پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”چلو شیری ان سے خدا ہی نپٹے گا۔“ وہ اس کو گھسیٹتا ہوا لے گیا ورنہ شیری کا ارادہ تھا سب سے دودو ہاتھ کرنے کا۔

☆.....☆.....☆

”بھئی رمضان کی آمد آمد ہے کچھ انتظامات ہی کر لیں۔“ فالقہ نے سلمیٰ سے کہا جو کہ حسب معمول اپنے سوٹ کی کڑھائی ختم کرنے کے فراق میں تھی۔

”ارے سن رہی ہیں مسز منان! میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ وہ اس کے کان میں چیختی۔

”ارے بابا سن لیا۔ بتاؤ کرنا کیا ہے۔“ وہ اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

”بھئی کرنا کیا ہے۔ ذرا صفائی ستھرائی کرتے ہیں۔ گھر کی ماسی تو ہے ہی اب شیری بھی ہاتھ بٹا دے گی۔ وہ بھی فارغ ہے۔“ انھوں نے کہا۔ ”ہوں ٹھیک ہے تو کل صفائی کا دن ہے۔“ سلمیٰ نے کہا اور دوبارہ مصروف ہو گئی۔

”واہ بھئی۔ آج ہمارے گھر میں دو اور ماسیوں کا اضافہ ہو گیا۔“ شیری سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔ نہیں، تمہاری غلط فہمی ہے دو نہیں تین ماسیوں کا۔“ فالقہ جھاڑو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”سلمیٰ ذرا شیری کے ہاتھ میں Dusting والا کپڑا اٹھانا۔“ فالقہ نے اونچی آواز میں سلمیٰ کو آواز دی۔

”ارے..... نہیں نہیں! میں کوئی ڈسٹنگ ڈسٹنگ نہیں کروں گی میری اسکن خراب ہو جائے گی۔“ شیری سیڑھیوں پر ہی رک گئی۔

”بھئی! آپ یہ کام بخوبی کر سکتی ہیں تو مجھے کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے میری دونوں ہڈیاں بہت سکھڑ ہیں۔“ وہ مسکا لگاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں اور ہم اپنی نند کو خود سے زیادہ سکھڑ بنانے والے ہیں۔“ سلمیٰ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”اب آ جاؤ نیچے۔ تم کیا سیڑھیوں پر قبضہ جما کر بیٹھی ہو۔ دیکھو بیچارہ شہود کب سے تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔ میڈم! کیا سیڑھیوں پر براجمان رہنا ہے۔“ فالقہ بھابی نے کہا تو اسے جیسے کرنٹ لگا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کی پچھلی سیڑھی پر اس کے بہت نزدیک کھڑا تھا۔ شیری کی سانسیں اٹھل پٹھل ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے اسے جگہ دے دی۔ وہ آگے بڑھا تو اس کا ہاتھ شیری سے مس ہوا۔

اس کی سانسوں کی رفتار میں تیزی آگئی۔

شیری نے خود کو نارمل کیا اور نیچے آگئی۔ ”چلیں بھائی! کیا یاد رکھیں گی؟ کیسی اچھی نند ملی۔ چلیں خوش ہو جائیں۔ مابدولت آپ کی help کرنے کو تیار ہیں۔“

”بڑی مہربانی ملکہ صاحبہ! اب اچھی ماسیوں کی طرح ڈسٹنگ کرو کہ تمہاری شکل نظر آئے۔“

ارے واہ واہ، شیری مقصود شہزادی نے اپنے لیے نئی جاب ڈھونڈ لی۔ ویسے کتنی Pay ہے تمہاری۔“ فرہاد سوکراٹھا تھا اور اپنے روم سے باہر نکلا تھا تو دیکھا شیری بڑی دل جمعی سے صفائی میں مصروف تھی۔

”کاش اتنی محنت کا مجھے پھل ملتا مگر افسوس صد افسوس۔ ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔“ شیری فلمی ہیروئینوں کی طرح ایک بازو ماتھے تک لے جا کر بولی۔ ”اچھا ہے تم فٹ رہو گی۔ ویسے بھی تم کچھ موٹی ہو گئی ہو۔“ فرہاد پانی کی بوتل منہ کو لگاتے ہوئے بولا۔

”ہائے اللہ! کیا میں موٹی ہو گئی ہوں؟“ وہ فوراً جھاڑنے والا کپڑا پھینک کر آئینے کے آگے ہوئی۔ ”واقعی فرہاد میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ وہ شرٹ کو ٹائٹ کر کے بولی اور کھلاؤ مجھے اپنی فیورٹ چاکلیٹز میں بھی اتنی بے وقوف ہوں تمہارے ساتھ کھائے جاتی ہوں۔ خود تو جم جا کر کے فٹ رہتے ہو اور مجھے موٹا کر رہے ہو۔“ وہ منہ بسور کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ارے نہیں بابا! اب اتنی بھی موٹی نہیں ہو رہی ہو۔ میں ہوں ناں تمہیں فٹ کرنے کے لیے۔ آج سے ہم دونوں واک پر جائیں گے میں بھی فٹ رہوں گا اور تم بھی۔ بس خوش۔“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب جلدی سے ناشتا دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ مما کچن میں ہیں تم وہاں جاؤ۔“

”یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر انھی

اور چل دی۔

”اس لڑکی کم لڑکے کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو بھی ہے مجھے بہت پسند ہے۔ وہ سب سے ہٹ کر ہے۔“ فرہاد نے محبت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور جیسے خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا تھا۔

”ہوں چوری چوری کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ دیور جی! فائقہ بھابی نے فرہاد کے کان پکڑ لیے۔ ارے بھابی چھوڑیں بھئی میں نے کیا کہا ہے جو آپ مجھے اس طرح پکڑ رہی ہیں۔“ فرہاد جان بوجھ کر انجان بنا۔

”لو اور سنو تم جو شیری کے لیے کہہ رہے تھے۔ کہیں معاملہ سیریس تو نہیں؟“ وہ بولیں۔ ”نہیں بھابی بس وہ ایسے ہی۔“ فرہاد نے جھوٹ بولا۔ ”چلو بنومت مجھے سب معلوم ہے۔“

”ہیں کیا معلوم ہے۔“ فرہاد گھبرا گیا۔ ”یہ ہی کہ تم شیری کو بحیثیت دوست سے کچھ زیادہ پسند کرتے ہو۔“

”ہاں وہ میری کزن بھی تو ہے۔“ وہ پھر انجان بنا۔ ”چلو بنومت تم مجھے اپنا راز دار بنا سکتے ہو۔“ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر بولیں۔

”پکا۔“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”بالکل پکا ایک دم صد بوٹ جیسا۔“ وہ ہنس کر بولیں۔ ”ٹھیک ہے پارٹنر صرف یہ بات آپ کے اور میرے بیچ رہنی چاہیے۔“

”کوئی بات؟“ فائقہ ایک دم انجان بن گئی۔ ”بھابی Not fair ہاں۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”ہوں میں تمہارے لیے دعا کروں گی کہ تمہیں تمہارا پیار جلدی مل جائے۔“ ”آمین۔“ فرہاد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

☆.....☆.....☆

”ہائے مرگئی۔ میری بھابیوں نے مجھ پر بڑا

قلم کیا جو سارے گھر کی ڈسٹنگ کروا ڈالی۔“ شیری نے صوفے پر ڈھینچتے ہوئے وہابی دی۔

”واہ جی واہ! آج ہماری نند نے تھوڑا کام کیا کر لیا ساتھ ہی جتنا شروع۔“ فائقہ بھی اس کے ساتھ صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے بولی۔

”بھابی واقعی آج ہم بہت تھک گئے ہیں مگر گھر صاف ہو گیا۔“ وہ اپنے پاؤں کو دباتے ہوئے بولی۔

”ہاں جنہوں نے صدیوں میں کوئی کام کرنا ہو وہ تو تھکیں گے ناں۔“

فرہاد نے انٹری ماری۔

”تم تو دفع ہی ہو جاؤ۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ ذرا جو تمہیں میرا خیال ہو۔ بس شروع ہو جایا کرو۔“

”اچھا بھئی! بہت تھک گئی میڈم۔ بولیں میں آپ کی کیا خدمت کروں۔“ وہ اس کے سامنے جھکتے ہوئے بولا۔

”دھپ۔“ ساتھ ہی سسلی بھابی نے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔ ”اس نے انوکھا کام کیا ہے دیور جی۔ ذرا ابھائیوں سے بھی پوچھ لیتے کہ بھابی میں آپ کی کیا خدمت کروں۔“ وہ اس کے انداز میں جھکتے ہوئے بولی۔ تو سب بے اختیار ہنس دیے۔

”اچھا اچھا چلیں۔ کیا یاد کریں گی۔ آج کی چائے میری طرف سے خوش۔“ وہ کچن میں گھستے ہوئے بولا۔

”جیو فرہاد۔“ فائقہ نے نعرہ لگایا۔

”ہاں بھئی آج گھر صاف لگ رہا ہے۔“ سکیڈ بیگم اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔

”جی می۔ آج سارے گھر کی صفائی ہو گئی۔ آپ بس کچن دیکھ لیں کہ رمضان کی مناسبت سے سامان آجائے۔“

”ہاں میں اور بھابی وہ دیکھ لیں گے۔ تم لوگ رہنے دینا۔“

☆.....☆.....☆

”تمہارے رزلٹ میں کتنی دیر ہے۔“ جلیل نے فرہاد سے پوچھا جو پتا نہیں خلا میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

”ہوں، پتا نہیں۔“ وہ اس انداز سے بولا۔

”اوئے، کہاں کھوئے ہوئے ہو فرہاد۔“

شہود اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ارے کہیں نہیں شہود بھائی۔ آپ بتائیں سارا دن کہاں ہوتے ہیں نظر نہیں آتے۔“

”ارے یار نہیں ہوتا ہوں۔ وہ آج ذرا اپنی پھوپھی کی طرف گیا تھا۔“

”ہیں آپ کی پھوپھی بھی ہیں؟“ شیری نے حیرت سے پوچھا جو ابھی ابھی نیچے آئی تھی۔

”ہاں، میری ایک پھوپھی ہیں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہیں اس شہر میں ہوتیں ہیں۔ بس ان کی طرف گیا تھا۔“

”کبھی ذکر ہی نہیں سنا۔“ جلیل بھی حیرت سے بولا۔

”ہاں ہم ان سے بہت کم ہی ملتے ہیں۔ پھوپھا کو زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ بس وہ ذرا گرم مزاج کے بندے تھے۔ جب سے آیا ہوں میں بس یہ دوسری بار گیا ہوں۔ حالانکہ مجھے آئے مہینہ ہونے کو آیا ہے۔“

”شکر ہے اسے یاد تو آیا کہ کب سے ڈیرہ جمائے بیٹھا ہے۔“ شیری نے دل ہی دل میں سوچا۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گھر میں ہر طرف رمضان کا احترام چل رہا تھا۔ ہر کوئی اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ شیری کے بھی رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے اب وہ باقاعدہ سیر پر دوپٹا اوڑھے رہتی تھی۔ ”واہ بھئی واہ بی بی حاجن آگئیں۔“ فرہاد نے ہانک لگائی۔

لاؤنج میں بیٹھے سب ہی گھر والے مسکرانے لگے۔ چونکہ آج سنڈے تھا لہذا کبھی موجود تھے۔

”سنیں مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“
 سکیمنہ بیگم نے مقصود شیرازی کو ہلاتے ہوئے
 کہا۔

”کیا بات ہے بیگم! آج پھر سے شیرزی نے کچھ
 کر دیا ہے کیا؟“ انھوں نے فائلوں سے سر نکالا۔
 ”ارے نہیں۔ کیا کچھ نہیں ہے۔ مگر بات اس کی
 ہی کرنی ہے۔“

”وہ کیا؟“ انھوں نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”آپ نے دیکھا نہیں وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔
 ماشاء اللہ سے گریجویشن بھی کر لیا ہے۔ اس کی شادی
 وادی کرنی سے کہ نہیں۔“

”ہوں! کہتی تو ٹھیک ہو۔“ انھوں نے اپنی
 عینک اتاری۔ ”میری نظر میں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا
 شہود ہے ناں۔ آپا بھی آرہی ہیں تو کیوں ناں بات
 کر لیں۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے۔ زرا بھابی سے مشورہ
 کر لوں۔“

☆.....☆.....☆

”بڑی امی آپ نے فرہاد کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے
 مل نہیں رہا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لے کر جانا
 ہے۔“

”نہیں بیٹا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ شاید
 رمیز اور ارسلان کے ساتھ نکلا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے آنے دیں ذرا۔ اسے بتاؤں
 گی۔“ وہ غصے سے اپنے روم میں واپس چلی گئی۔

زرینہ بیگم مسکرا دیں۔ انھیں یہ بچی بہت عزیز
 تھی۔ ”امی کیا خیال ہے؟ شیرزی کو ہمیشہ کے لیے اسی
 گھر میں رکھ لیں۔“ فائقہ نے انھیں مسکراتے ہوئے
 دیکھ کر کہا۔

”ہوں! کیا بات کر رہی ہو؟ اللہ کرے کہ بچی
 جس گھر جائے خوش رہے۔ بھلا ہم اس کو اس گھر میں

شیری نے فرہاد کو آنکھیں دکھائیں۔ تو وہ شرارت
 بھرے انداز میں سکیمنہ بیگم کے پیچھے چھپ گیا۔
 ”رمضان ہے۔ اس لیے بخش دیا، جاؤ۔ کیا یاد
 کر دے۔“ شیرزی شاہانہ انداز میں بولی۔ ”ہاں فرہاد
 واقعی ورنہ آج تیری ساری رات ہائے ہائے کرتے
 گزرتی۔“ رمیز نعمان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔
 سب ہنس پڑے۔

”بھی کوئی شاپنگ واپنگ کرنی ہے کہ نہیں؟“
 ارسلان نے پوچھا۔ ”ہاں ابھی سے شاپنگ شروع
 کر و بعد میں ٹیلر کپڑے نہیں سینے گے۔“ خلیل نے
 بھی کہا۔

”اس دفعہ ہم کچھ نیا کرتے ہیں۔“ فرہاد نے
 کہا۔

”کیا نیا؟ اس دفعہ تم کیا نیکر اور بنیان میں نماز
 عمید پڑھنے جاؤ گے؟“ منان نے بھی حصہ لیا۔ سب
 نے قہقہہ مارا جبکہ فرہاد کا موڈ آف ہو گیا۔

شہود ان سب باتوں سے بہت لطف اندوز ہو
 رہا تھا اس کے لیے یہ باتیں بہت منفرد اور بہت
 مزے دار تھیں۔

”اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو۔ مابدولت تمہارے
 ساتھ شاپنگ پر چلیں گے۔“ شیرزی فرہاد کو کھسکا کر
 اس کے ساتھ صوفے پر کھس گئی۔

”ہاں تم جاؤ۔ اس کو بھی کتے کے پٹے دلوانا اور
 خود بھی لے لیتا۔“ خلیل نے کہا اور اس بار دونوں
 نے ہی اس کو آنکھیں دکھائیں۔

”مامی جان! امی چند دنوں میں آئیں گی۔“
 شہود نے سکیمنہ بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں یہ ان کا اپنا گھر ہے۔
 جب چاہیں آئیں۔“ انھوں نے خوش ہو کر اسے
 دیکھا۔

☆.....☆.....☆

کیوں رکھ لیں۔“

”ارے امی! ذرا اپنی نظر سے ماں کی عینک اتار کر اور ساس کی عینک لگا کر دیکھیں۔“

”ہیں کیا؟ میں سمجھتی نہیں۔“

”ممی میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں ناں اسے آپ

میری دیورانی کا درجہ دے دیں۔“

زیرینہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”ہاں بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے تو خود یہ

بچی بہت عزیز ہے اور پورے گھر میں رونق بھی تو اس

کی اور فرہاد کی وجہ سے ہے۔ میں اسے اپنی بہو بنانے

کے لیے منصور صاحب سے بات کروں گی۔

ماشاء اللہ میرے ابھی تین بیٹے ہیں۔“

”امی صرف دو۔ خلیل نے اپنی ڈھونڈ لی ہے۔“

”ہیں! کیا کہہ رہی ہو۔“

”جی امی وہ فیروز سے نہیں ہے شیر کی

دوست.....“

”ہوں! بچی تو وہ بھی بہت اچھی ہے۔ آج ہی

بات کروں گی۔ خلیل کی بھی اور شیر کی بھی۔“

انھوں نے تہیہ کر لیا۔

”ارے کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ شہود نے

اسے پیچھے سے آواز دی۔

وہ بہت جلدی میں سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ رک

گئی۔ عجیب حلیہ تھا اس کا۔ نائیٹی سوٹ پہنا ہوا اپنے

پرانے جو بن میں وہ جا رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے

تھے لگتا تھا جیسے سوکراٹھی ہو۔

اس نے اس کا مکمل جائزہ لیا۔

اس کے گھورنے پر وہ کچھ بزل سی ہو گئی۔

”وہ..... وہ میں فرہاد کو دیکھنے جا رہی تھی۔“

”آپ ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں

کوئی کام ہے تو مجھ سے کہہ دیں۔ میں کر دوں گا۔“

وہ چلتے چلتے اس تک آ گیا۔

اس کی سانس مزید تیز ہو گئیں۔

”مجھے فیروز سے کی طرف جانا تھا۔“ وہ چاہ کر

بھی اسے انکار نہیں کر سکی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ ذرا درست حلیے میں باہر

آئیں۔ میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔“ وہ اس کے

حلیے پر طنز کرتا چلا گیا۔

اس نے اپنے اوپر نگاہ دوڑائی تو کچھ شرمندہ ہو

گئی۔ وہ واقعی بہت برے حلیے میں تھی، مگر جلدی

میں اس نے دھیان نہیں دیا۔

جب تیار ہو کر باہر آئی تو وہ اس کا بائیک کے

پاس انتظار کر رہا تھا۔ ”اف.....! کہا کار نہیں ہے۔“

”نہیں، ساری گاڑیاں تو چلی گئیں۔ بس یہ

بائیک ہے۔“ وہ اسے اشارت کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ چلیں۔“ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے

اس کے پیچھے بیٹھ گئی لیکن دل کی دھڑکن کو سنبھالنا

مشکل لگ رہا تھا لیکن شہود کے کپڑوں سے اٹھتی

خوشبو اسے اپنے حواسوں پر سوار ہونی محسوس ہو رہی

تھی۔“

مجھے بتائیں اس کا گھر کہاں ہے۔

”ہوں کیا کہا؟“ وہ اس کے قریب ہوتے

ہوئے بولی۔ ”شور کی وجہ سے آواز صحیح نہیں سنائی

دے رہی ہے۔“ وہ چلائی۔

شہود نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا ہلکا سا

لمس شیر کی کے جسم میں ایک ارتعاش سا بکھیر گیا۔

”میں نے کہا کہ راستہ بتادیں۔ سن رہی ہیں؟“

اس کی آواز جیسے اسے اپنے حواسوں میں واپس لے

آئی۔ ”ہوں! ہاں یہاں سے رائٹ لے لیں۔“ اس

نے خود پر قابو پایا۔

نہ جانے کیوں وہ اسے لمبے راستے سے لے کر

گئی اور واپسی پر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

”شیری! شیر کی کدھر ہو یا؟“ فرہاد تو تقریباً چیخا

ہوا اے ڈھونڈنا آیا اور اسے گاڑن میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ کہیں کھوئی ہوئی تھی اور اس اداس سے کونے میں اس کا حصہ لگ رہی تھی۔
 ”شیری یہاں کیا کر رہی ہو؟“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تو مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہے۔“ وہ گھاس اکھاڑ رہی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھ کر بولا۔

”محبت کیا ہوتی ہے فرہاد؟“ اس کے اچانک سوال پر وہ ہلکا بکا رہ گیا۔ نا چاہتے ہوئے وہ قہقہے مار کر ہنس پڑا۔ ”تو کیوں پوچھ رہی ہے۔“

فرہاد میں مذاق نہیں کر رہی۔ محبت کیا ہے؟“ اس بار وہ سیریس ہوا۔

”محبت!“ وہ رکا۔ مجھے زیادہ پتا نہیں، مگر اس میں انسان خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسے اس شخص کے ساتھ وقت گزارنا، اس کے قریب رہنا اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ اس کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے وہ۔ وہ۔ وہ۔ بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں پتا۔“ ”ہوں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”تجھے ہو گئی ہے کیا؟“ اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ مگر شیری نے جواب نہ دیا اور اٹھ کر چل دی۔ ”تیرا تو پتا نہیں مگر مجھے ہو گئی ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ بار بار شہود کو سوچ رہی تھی۔ تو کیا وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھا۔

شلوار میض میں سلیقے سے دوپٹا لیے بالوں کی پونی کیے وہ ایک مکمل مشرقی لڑکی لگ رہی تھی۔ ”تو کیا میں لا شعوری طور پر خود کو اس کی مرضی کے مطابق

بدل رہی ہوں؟ کیا میں واقعی شہود کو چاہنے لگی ہوں؟“ اس نے آہستہ سے آئینے میں ابھرتے اپنے عکس سے سوال کیا اور ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

”ارے می آپ نے شہود کو دیکھا ہے؟“ ارسلان نے پوچھا۔ ”نہیں بیٹا! وہ تو اپنی پھوپھو کے گھر گیا ہے۔ کہہ کر گیا تھا کہ رات کو کھانے پر نہیں ہوں گا۔ ادھر سے کھا کر آؤں گا۔“ سکیمنہ بیگم نے کہا۔ ”بھابی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ ”ہاں کہو کیا بات ہے؟“ لان میں بیٹھی چائے پیتی ہوئی زرینہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے سکیمنہ کو دیکھا آپ کو شہود کیسا لگا۔

”اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ فرمانبردار ہے خوبصورت ہے۔ خوب سیرت ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ انہوں نے چائے کا کپ لے کر کہا۔ ”وہ بھابی میں اور شیری کے پاپا شیری کے لیے شہود کا رشتہ مانگنے کے بارے میں سوچ رہے تھے میں نے سوچا آپ کا اور بھائی صاحب کا مشورہ بھی لے لوں۔ تھوڑے دنوں میں آیا آئیں گی تو بات کر لیں گے اگر شیری اپنوں میں جائے گی تو دل مطمئن رہے گا۔“ سکیمنہ بیگم کے پر جوش لہجے پر زرینہ بی ساکت سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”آج گھر میں افطاری پر بہت اہتمام ہو رہا ہے خیر تو ہے۔“ شیری کچن میں گھس کر بولی۔ ”جی بالکل۔ آج گھر میں پھوپھو آ رہی ہیں۔“ سلمیٰ نے کہا۔ ”مزہ آجائے گا۔“ شیری نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں مزہ تو واقعی بڑا آئے گا۔“ سلمیٰ نے پراسراری ہنسی ہنسی تھی۔ جسے شیری نے محسوس کیا مگر آگے سے کچھ نہیں کہا۔ وہ باتیں کر رہی تھی کہ باہر سے فرہاد کی آواز آئی۔ السلام علیکم پھوپھو جان۔“

”وعلیکم السلام جیتے رہو آباد رہو۔“ وہ اسے پیار دے کر بولیں۔ ”سلام پھوپھو شیریں ان کے گلے جا لگی۔“

”ارے جیتی رہو۔“ انہوں نے اسے جوش سے گلے لگایا اور ماتھا چوم لیا۔ ”کیسی ہے میری بیٹی۔“
”بالکل فٹ فٹ۔ آپ کو لگ نہیں رہی۔“
اس سے پہلے کہ وہ بولتی فرہاد نے لقمہ دیا۔
”چل ہٹ نظر نہ لگانا میری بیٹی کو۔“ وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اوں.....“ شیریں نے فرہاد کو منہ چڑھایا۔
”ای آپ آرام کر لیں اتنے لمبے سفر سے آئی ہیں۔“
شہود نے شیریں کو ان کے ساتھ لیٹے بیٹھے دیکھ کر کہا۔
تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”پھوپو آپ آرام کر لیں تھوڑی دیر۔ ویسے بھی افطاری میں ابھی کافی وقت ہے۔“

☆.....☆.....☆

پھوپو کے آنے سے گھر بھر میں رونق ہو گئی تھی۔
ہر کوئی پھوپو کے ساتھ لگا رہتا۔ پھوپو آپ میرے ساتھ عید کی شاپنگ پر چلیں گی۔“ شیریں نے کہا۔
”ارے نہیں بیٹا میں نہیں جاؤں گی اب مجھ میں اتنی طاقت کہاں۔“ ”ارے! آپ کو کیا ہوا ماشاء اللہ سے ابھی جوان ہیں۔“ ”ہاں بھئی عید کے ساتھ ساتھ ہمیں اور بھی شاپنگ کرنی ہے۔“ ”زیرینہ بیگم نے بھی حصہ لیا۔ سبھی نے ان کو دیکھا سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بولیں۔“ میں نے سوچا کہ کیوں ناں اپنے دوسرے بیٹوں کے سر پر بھی سہرا سجا دوں۔ ہم نے یعنی میں نے اور سیکینہ نے خلیل اور نعمان کی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور حیران ہوئے می پر۔

اس سے پہلے کہ خلیل بولتا ”فاقہ بھابی نے اسے کہنی ماری۔“ ”پوری بات تو سن لیں دیور جی۔“

”ہاں می آپ کہاں تھیں ذرا لڑکیوں کے ہارے میں تو بتادیں۔“

”ہاں ہاں بھئی۔ میں کہہ رہی تھی کہ میں نے اور سیکینہ نے خلیل کے لیے فیروزے اور نعمان کے لیے فاقہ کی بہن دعا کو پسند کیا ہے۔“ ”ہرے! کیا بات ہے می۔“ خلیل کے منہ سے اچانک نکلا۔
انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔ تو وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔

”بھئی! تمہیں میرا اور سلمیٰ کا اور سب سے بڑھ کر شیریں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تمہارے دل کی کہانی کو Translate کر کے سنایا در نہ تم تو.....“
خلیل نے شیریں کو دیکھا جو بہت خوش تھی۔ ”تم بھی بتا دو نعمان تمہیں دعا پسند ہے۔“ سیکینہ بیگم نے پوچھا۔

”جی می!“ نعمان نے ہنس کر کہا۔ ”واہ! واہ یعنی دونوں ہی گھنے نکلے۔“ ”ریمز نے ارسلان کو دیکھ کر کہا۔“ ”چل ارسلان اب ہماری جوڑی کی باری۔ آج سے اپنے لیے لڑکیاں ڈھونڈنا شروع کیونکہ ان کے بعد تو پکا اپنا نمبر ہے۔“ ”ریمز نے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”نہیں تم سے پہلے شیریں کی باری۔“ سیکینہ بیگم نے کہا۔

شیریں کا چہرہ جیسے بے اختیار شرم سے گلابی ہو گیا، جسے بالخصوص شہود اور فرہاد نے محسوس کیا۔
”لو جی! یعنی کم از کم تین سے چار سال انتظار۔ ارسلان منہ بنا کر بولا۔“ ”نہیں بھئی، لڑکا بس دیکھ ہی لیا سمجھ لو۔“ انہوں نے کہا۔ ”ہیں؟“ اس بار سب کے منہ سے نکلا..... ”ہوں۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھنسیں جبکہ شیریں کے اندر ایک عجیب بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

آج سیکینہ بیگم کا ارادہ رضیہ باجی سے شیریں اور شہود کے لیے بات کرنے کا تھا۔ آج وہ صبح سے ہی

بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”بھابی آج افطاری کے بعد آپ میرے ساتھ باجی سے بات کریں گی شیری اور شہود کے لیے۔“ انھوں نے کلام الہی پڑھتی ہوئی زرینہ بیگم سے پوچھا۔ ایک منٹ کے لیے وہ رک گئیں پھر ہمت جمع کر کے بولیں۔ ”کیوں نہیں؟“ ”آخر شیری ہماری بیٹی ہے اور شہود اس کے لیے نہایت مناسب ہے۔“ حالانکہ وہ دل سے شیری کو اپنے فرہاد کے لیے چاہتی تھیں۔ انھوں نے قرآن بند کیا اور سچے دل سے شیری کے لیے دعا کی۔

”شیری تم چائے ڈرائنگ روم میں لے آنا۔“ سکینہ بیگم نے شیری کو چائے بناتے دیکھا تو بولیں۔ ”جی ماما! میں لے آتی ہوں۔“ وہ چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔ ”باجی آج مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ سکینہ بیگم جوش سے بولیں۔ ”ہاں کہو کیا بات ہے۔“

”باجی! وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ان کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیسے کہیں۔“ باجی میں چاہتی ہوں بلکہ ہم سب چاہتے ہیں کہ شیری اور شہود کا رشتہ طے ہو جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ شیری ہم سب کی جان ہے۔ بڑے تازوں سے پالا ہے۔ وہ اپنوں میں جائے گی تو ہمیں فکر نہیں ہوگی۔“ سکینہ بیگم نے ہمت کر کے بول ہی دیا۔

شیری کی دل کی دھڑکن ایک دم سے بہت تیز ہو گئی۔ فرہاد نے پیچھے سے اسے ڈرایا تو اس کے ہاتھ سے ٹرے گرتے گرتے پگی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اسے اس کی نانی یاد دلادیتی مگر اس نے نظر انداز کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اندر سے آتی آوازوں کی طرف وہ دونوں متوجہ

ہوئے۔ رضیہ بیگم عجیب شش و پنج میں مبتلا تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بات کیسے کہیں۔ ”یقین مانو میری اپنی بھی یہی خواہش تھی۔“ سکینہ بیگم کے چہرے پر خوشی جھلک گئی۔ زرینہ بیگم بھی مسکرا دیں۔ ”لیکن کیا باجی؟“ اس بار زرینہ بیگم بولیں جبکہ سکینہ بیگم ایک دم پریشان ہو گئیں۔

باہر کھڑی شیری اور فرہاد کا سانس بھی رک گیا۔ ”میں شرمندہ ہوں۔“ رضیہ بیگم نے کہا۔ ”میں نے شہود کو اسی نیت سے یہاں بھیجا تھا کہ وہ شیری کو دیکھے۔ میں تو بہت پر اُمید تھی کہ شیری جیسی بچی اسے ضرور پسند آئے گی۔“ مگر وہ کہتا ہے کہ اسے لا ابالی سی لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔ اسے سکھڑ اور گھر کو سنبھالنے والی لڑکی چاہیے جو اگرچہ خوبصورت نہ ہو لیکن سلیقہ شعار ہو۔“

شیری کے ہاتھ سے ٹرے چھلک گئی جسے فرہاد نے سنبھالا۔ ”میں نے اسے سمجھایا کہ بچپنا ہے وہ سنبھال جائے گی لیکن وہ تیار نہیں ہے۔ اس نے اپنے لیے اپنی پھوپھی کی بیٹی پسند کی ہے۔ میں اس پر زبردستی نہیں کر سکتی۔ وہ میرے ہاتھوں کا پلا بڑھا نہیں ہے ناں۔ بس اس بات پر چپ ہو جاتی ہوں۔“

شیری اس سے زیادہ نہ سن سکی اور ٹرے فرہاد کو پکڑا کر تیزی سے گھر چلی گئی۔ اس سے زیادہ وہ کنٹرول نہیں کر سکی تھی۔ فرہاد نے اس کو جاتے دیکھا تو ساری بات سمجھ گیا۔ چھن..... سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا۔

سکینہ اور زرینہ بیگم دونوں ایک دم چپ ہو گئیں جبکہ رضیہ بیگم خاموشی شرمندہ لگ رہی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں آکر خوب روئی۔ اسے سکینہ بیگم کی ساری باتیں یاد آنے لگیں جو وہ اسے سمجھاتی تھیں۔ سکینہ بیگم بہت افسردہ تھیں۔ انھوں نے مقصود صاحب کو بتایا تو انھیں دکھ ضرور ہوا، مگر انھوں نے

سیکنہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اللہ نے ہماری بیٹی کا جو ضرور اچھا ہی بنایا ہوگا۔“

”مگر مقصود صاحب میں کتنا سمجھاتی تھی کہ کچھ تو لڑکیوں والی حرکتیں کرو، مگر اس وقت مجھے سب کہتے تھے بچی ہے۔ اب دیکھیں لوگوں نے اس کے بچپن کے ہی طعنے دیے ہیں۔“ وہ غصے سے منہ موڑ گئیں جبکہ مقصود صاحب نے خاموشی میں عافیت جانی۔ انھیں اپنی بیٹی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

آج سیکنہ بیگم جب نیچے آئیں تو وہ سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم اسے نظر انداز کر گئیں۔ اس دفعہ عید بھی بہت خاموشی سے گزری۔ لڑکوں کو تو پتا نہیں تھا سب مصروف رہے۔ البتہ شیری کی خاموشی سبھی نے محسوس کی مگر پوچھا کسی نے نہیں۔ رضیہ بیگم عید کے بعد چلی گئی تھیں۔ انھوں نے اگلے ہفتے شہود کی منگنی کرنے آنا تھا۔ سیکنہ بیگم نے اور زریہ بیگم نے شہود کی منگیتر کے لیے کپڑے پسند کرنے کے لیے بازار جانا تھا۔ انھوں نے سلمیٰ اور فائقہ کو کہا کہ وہ بھی چلیں شیری سے بھی کہا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

فرہاد اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی مگر ہمت نہیں کر سکا۔

شہود سے رشتے کی بات صرف وہ چاروں ہی جانتے تھے اور گھر میں کسی کو پتا نہیں تھا۔

آخر وہ ہمت کر کے شیری کے کمرے میں گیا۔ وہ کانوں میں ہیڈفون لگائے گانے سن رہی تھی۔

وہ دھڑام سے بیڈ پر گر اس طرح وہ ماحول کو ہلکا بنانے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ شیری کے دل کی ساری بات جان سکے۔ وہ اس کے کانوں سے ہیڈفون اتار کر بولا۔ ”کہاں پر ہو یا میں کب سے یہاں ہوں تو بات نہیں سن رہی۔“

”فرہاد! میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے اس لیے تو پنکا مت لینا۔“ وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔

”سب ٹھیک ہے ناں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ہاں کیوں؟“ وہ نظر انداز کر گئی۔

”یار سچ سچ بتا کہ کہیں تو شہود سے محبت.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شیری کو دیکھا ”ہاں!“ وہ اس سے زیادہ سنجیدگی سے بولی۔ ”فرہاد کے چہرے کا رنگ ایک دم ماند پڑ گیا۔ تو اس دن محبت کا اس لیے پوچھ رہی تھی؟“

”شاید ہاں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ میرا بچپنا تھا۔“ وہ اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کا غبار نکال دے۔ وہ جانتا تھا کہ شیری اپنے دل کی بات اس کے سوا کسی سے اتنا کھل کر نہیں کرے گی۔

”تو نے سنا نہیں کہ شہود صاحب (اس نے زور دیا) کو لا ابالی لڑکیاں پسند نہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ مجھ میں بچپنا بہت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے۔“

وہ اٹھ کر ٹیرس میں چلی گئی۔ وہ بھی سر جھٹک کر پیچھے چلا آیا۔

رات کے تقریباً 9 بجے تھے اور ہوا میں خنکی بہت تھی۔ جاتے دسمبر کے دن تھے۔ ”مگر فرہاد وہ رک کر بولی۔ بچپنا ہی سہی، محبت تو محبت ہی ہوتی ہے ناں۔“

”ہاں محبت، محبت ہی ہوتی ہے۔“ وہ پتا نہیں کیسے بولا، مگر ضروری نہیں جسے ہم چاہیں وہ بھی ہمیں چاہے۔“

”ہاں ضروری نہیں مگر.....“ وہ خاموش ہو گئی۔

”تم نے کبھی اظہار کیا تھا؟“ وہ بولا

”نہیں۔“

”تو پھر اتنا یقین کیوں؟“

”پتا نہیں۔“

”مجھے محبت کا زیادہ نہیں پتا پھر، میں نے کہیں

میری قسمت۔“ وہ سر کے قریب ہاتھ لا کر بولا۔
”میرے بچے جو پتا نہیں کہاں ہیں۔ لوگ انھیں یاد
کرتے ہیں اور زندہ سالم ایک فرہاد نظر نہیں آتا۔“ وہ
ایک دم شپٹا گئی۔

”یار تم مجھے اگنور کیوں کر رہی ہو۔“ وہ سنجیدگی
سے بولا۔
”میں تمہیں اگنور کیوں کروں گی۔“ وہ نظریں
چرا کر رہ گئی۔

”شیری یار تم سے معافی مانگنی تھی۔“
”کس لیے؟“
”اُس دن کے لیے شاید میں جذباتی ہو
گیا تھا۔“

وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔
”I am sorry۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
جبکہ وہ چپ چاپ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔
☆.....☆.....☆

وہ ٹیرس پر کھڑی نہ جانے کن سوچوں میں
گم تھی کہ فایقہ بھابھی اس کے پاس چلی
آئیں۔ ”شیری ادھر آؤ۔“ وہ کپڑوں کا بیگ بیڈ پر
رکھ کر بولیں۔

”جی بھابی۔“ وہ ٹیرس سے ان کے پاس آ کر
بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”تم بتاؤ کہ کون سا ڈیس شہود کی سنگنی پر پہنوں۔
کب سے سلگنی سے کہہ رہی ہوں مگر وہ بے چاری
اپنے میاں کے ساتھ مصروف ہے۔ تم بتاؤ۔“ وہ اس
کی طرف دیکھ کر بولیں تو ٹھٹک گئیں۔ ”کچھ ہوا ہے
شیری؟“ انھوں نے اس سے پوچھا۔ ”نہیں بھابی
کچھ خاص نہیں۔ وہ ٹال گئی۔“

”آج کل میں نوٹ کر رہی ہوں کہ تمہارے
اور فرہاد کے بیچ کچھ چل رہا ہے۔ وہ بھی چپ چپ
ہے اور تم بھی۔ کہیں۔ تمہارا کوئی جھگڑا تو نہیں

پڑھا تھا۔“ زندگی اس کے ساتھ گزارو جو آپ کو چاہے
جیسا کہ آپ ہو۔ وہ آپ کو نہ بدلے بلکہ دیے ہی
چاہے۔ آپ کی تمام خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ۔
وہ شخص آپ سے زیادہ محبت کرے گا۔“ جو آپ کو
آپ کے اصل کے ساتھ اپنائے گا۔“ تم نے شاید
جانا نہیں کہ کوئی تمہیں تمہارے اصل کے ساتھ اپنانا
چاہتا ہے۔“ وہ خلا میں گھور کر بولا جبکہ شیری کو ہزار
دولت کا جھٹکا لگا۔

”تم.....“ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ وہ کیسے نہ
جان پاتی کہ فرہاد کیا کہہ رہا ہے کیونکہ وہ بھی تو اسی
منزل کی راہی تھی۔ ”تم.....“ وہ کچھ بولتی اس سے
پہلے فرہاد بول پڑا۔

”تمہاری شاید قریب کی نظر کمزور ہے میڈم! جو
تمہیں یہ ہینڈ سم نہیں دکھا۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر اپنی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جو نہ جانے کب
سے تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔ تمہارے اصل اور بچنے
کے ساتھ۔ مگر تم نے دھیان ہی نہیں دیا۔“ شیری کی
آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آنسو
خوشی کے ہیں غم کے ہیں یا شرمندگی کے۔
”ذرا غور کرنا.....“ وہ کہہ کر چلا گیا۔
جبکہ وہ منجھدار میں اکیلی رہ گئی۔

نہ جانے وہ شہود کے لیے اپنے دل میں محبت کا
جذبہ کیسے پیدا کر پائی۔ اس نے فرہاد کو بھی اس نظر
سے نہیں دیکھا تھا۔ یا شاید محسوس نہیں کیا تھا۔ یا
شاید.....؟؟

☆.....☆.....☆
آج کل گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ سب ہی
شہود کی سنگنی کی تیار یوں میں لگے تھے۔ شیری اس
دن سے فرہاد سے کتر رہی تھی۔ آج فرہاد نے اسے
پکڑ ہی لیا۔ ”ہاؤ.....“ اس کی چیخ نکل گئی۔
”فرہاد کے بچے تجھے میں بتاتی ہوں۔“ ”ہائے“

”ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔ شاید دل سے کوئی بوجھ

ہٹ گیا تھا۔

شہود کے لیے اسے اپنی فیلنگز بے جان سی محسوس ہونے لگیں۔ بھالی نہ جانے کب کی چلی گئی تھیں اور وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

وہ جتنا سوچ رہی تھی اتنی ہی پُر سکون ہوتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج سب بہت دنوں کے بعد لاؤنج میں موجود تھے۔ شیریں چائے لے کر آئی۔

”واہ واہ! ہماری مہارانی چائے لائیں ہیں۔ لوگو جگہ دو۔“ ارسلان نے ہانک لگائی۔

اس نے چائے کی ٹرے ارسلان کو تھما دی۔

”چلو ذرا جگہ عنایت کرو۔“ وہ فرہاد کو کہنی مار کر بولی اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

فائقہ بھابی نے انگوٹھا اٹھا کر شاپاش دی۔

وہ واپس اپنے جو بن پر آگئی تھی جیسے سب ہی نے محسوس کیا۔

”یار شیریں! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ تو اتنے دن چپ چپ رہی اور عید بھی پھکی گزری۔“

ریمز نے لقمہ دیا وہ منان کے ساتھ بیٹھا کسی میگزین سے ڈریس چوز کر رہا تھا۔

”ہاں، ہاں! بس تھوڑا سو رہنے کا موڈ تھا۔ اس لیے تھوڑے دن چپ رہی۔ مگر اللہ تو بہ کتنا مشکل کام ہے چپ رہنا۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

”واہ! آج ہماری بیٹی نے بڑی مزے کی چائے بنائی ہے۔“ مقصود صاحب بولے۔ ”ہاں بھئی ہماری پری تو expert ہو گئی ہے۔“

چائے بنانے کی زرینہ بیگم نے بھی تعریف کی جبکہ شیریں نے جھک کر داد وصول کی۔

”تم لوگوں کی تیاری مکمل ہے۔ کل شہود کی

وہ چپ رہی۔

”تم چاہو تو شیریں کر سکتی ہو جیسا کہ فرہاد کرتا ہے۔“

”ہیں؟“ اس نے مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔“ انہوں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا شیریں کیا ہے فرہاد نے؟“ اسے ڈرتھا کہ کہیں شہود والی بات تو شیریں نہیں کی!

”یہ ہی کہ اس نے تم سے شاید اپنے دل کی بات کہہ دی ہو

”ہوں اور؟“

”اس سے بڑی بھی کوئی بات ہے؟“ وہ دوبارہ اس سے سوال کر کے بولیں۔

”نہیں بھابی۔ میں سمجھ نہیں پا رہی۔ میں نے کبھی فرہاد کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ میرا سب سے بہترین دوست ہے۔“

”تو دیکھ لو جان! اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اس نے تم کو اس نظر سے دیکھ لیا ہے ناں۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔ اس سے بڑی کیا بات ہوگی کہ تم اپنے سب سے بہترین دوست میں اپنا ہم سفر پاؤ۔ وہ دوست جو تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات جانتا ہے۔ تم دونوں کے بیچ کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ لڑکیاں بہت خوش قسمت ہوتی ہیں جو اپنے شوہر میں اپنا بہترین دوست پائیں۔ اور تم تو اور بھی لگی ہو کہ تم اپنے بہترین دوست میں اپنا شوہر پاؤ گی۔ سچ تم دونوں ساتھ میں کتنے مکمل لگتے ہو۔“

”Made for each other“ کتنے خوبصورت انداز میں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

”کتنے

خوبصورت انداز میں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

”کتنے

خوبصورت انداز میں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

خوبصورت انداز میں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

انجمنٹ ہے۔“ خلیل بولا۔

”ہاں میری تو مکمل ہے۔“ رمیز نے کہا۔ ”میں نے سب سے پوچھا ہے۔ تجھ اکیلے سے نہیں پوچھا۔“ خلیل نے لقمہ دیا۔

”ہاں تقریباً سبھی کی مکمل ہے سوائے شیری کے۔“ سسلٹی بھابی بولیں۔ ”ارے! فرہاد نے بھی تو کپڑے نہیں لیے ابھی تک۔“ نعمان بھی بولا۔

”واہ جی واہ! آخر کسی کو ہماری یاد آ ہی گئی۔“ فرہاد اپنے اور شیری کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”لو بھلا، تم دونوں وہ بلائیں ہو جنہیں فراموش کرنا ناممکن ہے۔“ جلیل نے لقمہ دیا۔

”ہم بلائیں سکتے ہیں۔“ شیری بولی۔ ”پوچھو ذرا بڑی امی سے۔ جان! جان ہیں ہم دونوں اس گھر کی۔“

زرینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”خبردار جو کسی نے اس ہنسون کی جوڑی کو کچھ کہا تو مقصود صاحب نے بھی پیار سے ان دونوں کو دیکھا۔“

”واہ چھوٹے پاپاچی دل جیت لیا آپ نے۔“ فرہاد بولا۔

”کیا خطاب دیا ہے ہنسون کی جوڑی۔“ منصور صاحب بھی مسکرائے جبکہ سکیمنہ بیگم کچھ خاموش تھیں۔

”چل یار شیری! ہم دونوں شاپنگ کر کے آتے ہیں۔“ فرہاد اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے شیری نے فوراً تھام لیا۔ فائقہ بھابی اور زرینہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی جبکہ باقی سب نے نوٹس نہیں کیا۔

”لو جا رہے ہیں دونوں۔“ ارسلان نے کہا۔ ”کتوں کے پٹے لینے۔“ رمیز نے ساتھ ہانک لگائی۔

وہ دونوں مال میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

”کچھ کھالیں مجھے بھوک لگی ہے۔ دو گھنٹے سے کپڑے لینے آئے ہیں اور کچھ لیا بھی نہیں ابھی تک۔“ فرہاد شیری سے بولا۔

”ہاں۔ پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔“ وہ بھی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں برگر سے مکمل انصاف کر رہے تھے۔ جب ایک دم شیری کو جیسے کچھ یاد آیا۔

”یار فرہاد! اس دفعہ میں چوڑی پاجامہ پہنوں گی اور پراندہ لگاؤں گی اور جو مجھے فیروزے نے ایئر رینگ دیئے تھے ناں اس کے ساتھ کاکلروں کی اس دفعہ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے۔“ وہ اس نے تہمتا تے ہوئے چہرے کے ساتھ فرہاد کو دیکھا۔

فرہاد جس کا منہ ابھی تک کھلا تھا اس نے صرف سر ہلایا۔

”اور تو کسی کو کچھ مت کہنا۔ میں اس بار سب کو سر پرانزدوں گی ٹھیک ہے۔“

”ہوں بالکل!“ وہ صرف اتنا ہی بول پایا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور تصور کر رہا تھا کہ شیری مشرقی حلیے میں کیسی لگے گی۔ فرہاد نے اس کی شاپنگ کرنے میں مدد کی اور شیری نے اس کے کپڑے سلیکٹ کرنے میں اس کا ساتھ دیا۔ وہ صبح سے تیاری میں لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یار کوئی میری مدد کر دے مجھے میرا جوتا نہیں مل رہا۔“ ارسلان لاؤنج میں زور سے چلا رہا تھا۔

”فرہاد کے کپڑے اس کے ساتھ اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے وہی لے گیا تیرے جوتے۔“ رمیز نے کہا۔

”یار اس فرہاد کی تو میں ابھی خبر لیتا ہوں۔“ آج سکیمنہ بیگم کچھ خاموش تھیں۔ انھیں اپنی بیٹی کی زیادہ فکر ہو رہے تھی۔ ابھی تو اپنوں نے ٹھکرا

دیا تھا۔ کل غیروں نے بھی اس کے بچپن کو لے کر اسے ٹھکرا دیا تو کیا کریں گے۔ بس یہ ہی فکر انھیں کھائے جا رہی تھی۔

مقصود صاحب نے ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بولے۔ ”بیگم اس طرح منہ مت بناؤ۔ رضیہ بہن کیا سوچیں گی کہ ہم ان کی خوشی میں خوش نہیں ہیں۔ تم دیکھنا ہماری شہزادی کے لیے کوئی شہزادہ ضرور آئے گا۔ تم اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو اور موڈ ٹھیک کرو۔“ تب ہی دستک کے ساتھ زرینہ بیگم اندر آئیں۔ ”اچھا ہوا بھابی آپ ذرا اسے سمجھا میں۔“ ”ہاں ضرور۔ تم ذرا جاؤ تمہارے بھائی بلا رہے ہیں تمہیں۔“ ”جی بھابی!“ وہ کہہ کر چلے گئے۔

”بھابی آپ ذرا انھیں سمجھا میں یہ کیوں نہیں سمجھ رہے۔ ماشاء اللہ شیری بانیس کی ہونے والی ہے۔ اب وہ بچی نہیں رہی۔“

”ارے میں آج تم سے اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔ ہماری شیری کے لیے رشتہ آیا ہے۔“

”ہیں بھابی۔“ ”اُن کے چہرے کا رنگ کھل گیا۔“ ”کون ہے بھابی؟ کہاں رہتا ہے؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”بتاتی ہوں بھئی بتاتی ہوں۔“

”لڑکا بہت ہی اچھے گھرانے کا ہے۔ چار بھائی ہیں۔ وہ سب سے چھوٹا ہے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو گئی ہے۔ دوسرے کی منگنی وغیرہ کی تیاری ہے اور تیسرے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کا۔“

”اچھا بھابی! کہاں رہتے ہیں۔ وہ لوگ؟“

”بھئی اس گھر میں رہتے ہیں وہ لوگ اور لڑکے کی ماں ہی تمہارے آگے بیٹھی ہے۔“

”ہیں! بھابی یہ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

”ہاں سیکنہ مجھے شروع ہی سے شیری بہت عزیز

ہے۔ میں اپنے ابا سے لپکتے لپکتے جا رہی ہوں۔ بس تم ہاں لو۔“ شیری اسی گھر میں رہے گی۔“

”لیکن بیگم کی آنکھوں میں آنسو آٹے تھے۔“

”ارے ہنگامی روکیوں رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی ساری زندگی اس گھر میں رہے گی اور تم دیکھنا میرا فریاد اتنے بہت خوش رکھے گا بہت چاہتا ہے اے وہ۔“

”جی بھابی! میں نے بھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں اتنا ہی کم ہے۔“ ان کی آنکھوں میں مہلوریت کے آنسو تھے۔

”بھئی ابھی میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ پہلے تم سے ہی بات کر رہی ہوں۔ اب تمہاری رضا مندی کے ساتھ پورے رسم و رواج سے رشتہ مانگوں گی سب کے سامنے۔“ ”بھئی فریاد نے آکر بتایا کہ پھوپھو وغیرہ آگئے ہیں آجائیں۔“

”بھئی سب آگئے ہیں تو چلیں۔“ مقصود صاحب بولے۔ ”جی ماموں! نکلنے میں کافی دیر ہو گئی ہے۔“ ”شہود لی بڑی بہن بولی۔“

”ارے بھئی! یہ شیری کہاں ہے؟“ ”سلمیٰ بھابی نے کہا۔ فریاد جونہ پانی پی رہا تھا بولا۔“ ”آج لگتا ہے وہ لڑکیوں کی طرح تیار ہو رہی ہے۔ کافی ٹائم لگا رہی ہے۔“ ”ہاں بھئی کہاں ہے یہ؟“ ”ریمز کو بھی جستجو ہوئی۔ تبھی فیروزے بھی داخل ہوئی۔“

”السلام علیکم! ایوری بڈی۔“

”وعلیکم السلام بیٹا آؤ بھئی بڑے ٹائم پر آئی ہو۔ ہم بس نکل رہے تھے۔“ منصور صاحب نے اسے پیار دیتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو آپ کو شہود بھائی۔“ وہ شہود کو پھول دیتے ہوئے بولی۔ ”Thank you“ ”فیروزے۔“ ”شہود نے مسکرا کر تحفہ قبول کیا۔“

”آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو فیروزے۔“

سیکنہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے خلیل کو دیکھا۔ تو وہ جھینپ گیا۔
 ”ارے یہ لڑکی کون ہے ہمارے گھر میں جو اوپر سے آرہی ہے۔“
 ارسلان حیرت سے دیکھ کر بولا تو سارے متوجہ ہو گئے۔

”ماشاء اللہ بہت حسین لگ رہی ہو میری بچی۔“
 زرینہ بیگم نے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔
 فیروزی اور گولڈن کنٹراسٹ کی لونگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں بڑا سادو پیٹھ اوڑھے میچنگ جیولری، پراندہ اور کھسے میں وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔
 سبھی نے اس کی تعریف کی۔ اس نے فرہاد کو فخریہ انداز میں دیکھا اور فرہاد نے آگے سے Victory کا نشان بنایا۔
 جسے صرف شہود نے دیکھا۔

فیروزے سے ملتے ہوئے اس نے جتانے والے انداز میں۔
 ”لو دیکھ لو! میں نے تمہارے دیئے ہوئے ایئر رننگز کی خاطر یہ سوٹ بنایا ہے۔“
 ”ہائے میری ایئر رننگز کی قسمت! دیکھو کتنے خوش نصیب ہیں۔ ان کی خاطر شرمین شیرازی نے جوڑا بنایا۔“ دونوں مسکراتے ہوئے گلے ملیں۔
 ”تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے صدق دل سے تعریف کی۔

”سلام پھوپھو جانی آپ کیسی ہیں اور آپنی آپ لوگ کیسی ہیں؟“ وہ فردا فردا سب سے ملی اور گول مثول بچوں کو پیار کرنے لگی۔
 ”بھئی میری بچی کی نظر اتارو سیکنہ۔“ رضیہ بیگم نے اسے نار ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

”جی بالکل باجی!“
 ”آج تو میں واقعی شکرانے کے نفل ادا کروں

گی۔ میری بیٹی لڑکی، لڑکی سی لگ رہی ہے۔“ وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولیں۔
 ”مما بھئی اب بس کریں۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے جس کو کریڈٹ جاتا ہے۔“ وہ بولی۔
 ”کون ہے بھئی وہ۔“ سلمیٰ نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بھئی ایک ہی ہوگا اور کون ہو سکتا ہے۔“ فائقہ بھابی نے دخل دیا۔
 ”فرہاد۔“ اس بار جلیل بولا۔
 ”جی بالکل ٹھیک اندازہ لگایا اس نے میری بہت ہیلپ کی ہے۔“
 ”Thanks buddy۔“ وہ فرہاد کو دیکھتے ہوئے بولی۔
 وہ تو مسکرا دیا۔ ”آپ کو بہت بہت مبارک ہو شہود۔“ شیری شہود کو اکیلا کھڑے دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”Thanks۔“ وہ صرف اتنا ہی بول پایا۔ وہ جانے لگی تو شہود نے اسے روک لیا۔ ”رکیں مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“
 وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ ”جی؟“
 ”I am sorry۔“
 ”کس بات کے لیے۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔
 ”آپ جانتی ہیں کس بات کے لیے۔“
 ”اوہ اچھا! اُس بات کے لیے۔“ وہ ایسے بولی جیسے اس کچھ یاد آ گیا ہو۔

”O its OK بلکہ مجھے آپ کو Thanks کرنا چاہیے آپ کی وجہ سے مجھے میرے بہترین دوست میں ایک اچھا ہم سفر ملا ہے۔ اگر آپ مجھے نہ ٹھکراتے تو شاید میں نہ جان پاتی۔

کیا مطلب؟“ وہ حیرانگی سے بولا۔
 ”مطلب پھر کبھی بتاؤں گی۔ ابھی آپ کی مگنی

کی تقریب کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“
وہ اسے حیرانگی میں چھوڑ کر چلی گئی۔ جہاں
سارے جانے کی تیاری میں تھے۔

”بھئی جانے سے پہلے کیوں نہ کچھ تصویریں
لے لی جائیں۔“ نعمان نے رائے دی۔

”ہاں موقعہ بھی ہے اور دستور بھی۔“ منان نے
ہانک لگائی۔ ”لو بھئی میں کیمرے لے آیا۔ چلو سارے
اچھے اچھے پوز دو۔“ ارسلان بولا۔

”کیوں نہ سب سے پہلے ایک گرد پ فوٹو ہو
جائے سارے اکٹھے ہو جائیں۔“ جلیل نے کہا
سارے جلدی جلدی اکٹھے ہو گئے۔

”یا خدا، اتنی بڑی فیملی ہے کہ ایک فریم میں پوری
نہیں آ رہی۔“ ارسلان فریم سیٹ کرتے ہوئے بولا۔

”لو بھلا! ابھی کہاں بڑی ہے۔ ابھی تو ہم
پانچوں کی دلہنوں نے بھی آنا ہے پھر بڑی ہوگی یہ
فیملی۔“ جلیل بولا۔ ”غلط، غلط، بات۔ پانچوں کی
نہیں صرف تینوں کی۔ دو کی تو اسی فریم میں ہیں۔“
فائقہ بھابی نے جلیل کی بات کاٹی۔ ”ہیں دو کون؟“
نعمان بولا۔

”ایک تو فروزے ہوگی۔ دوسری کون؟“ رمیز
بولا۔ سبھی کی آنکھوں میں حیرانی تھی جبکہ زرینہ بیگم،
سیکنڈ بیگم فائقہ، فرہاد اور شیریں مسکرا رہے تھے۔

”بھئی آپ پانچوں کو کیوں ہنسی آ رہی ہے۔
ہمیں بھی پتا چلے۔“ منصور صاحب بولے۔

”بھئی ہنسی کہاں آ رہی ہے۔ ہم تو بس مسکرا رہے
ہیں۔“ سیکنڈ بیگم بولیں۔ ”چلیں وجہ تو بتائیں۔“

”بھئی ہماری ہنسون کی جوڑی ہے ناں۔ یہ
جوڑی زندگی بھر بنی رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ انہوں

نے گول مول بات کر دی۔ اب بندہ پوچھے ہم سب
میں سے ہنس کہاں سے پیدا ہو گئے۔ امی بھی ناں
عجیب و غریب باتیں کرتی ہیں۔“ رمیز نے ہنس کر

انہیں دیکھا۔ ”اوئے ہوئے۔ ایسا کیسے ہو سکتا
ہے۔“ ارسلان حیرانی سے بولا۔ ”یار! شیریں لڑکے
سے شادی کیسے کر سکتی ہے اس کے لیے تو ہم نے
ابھی لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔“

سب بے اختیار ہنس دیے۔ جبکہ شیریں آگے
بڑھنے ہی والی تھی کہ فرہاد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”ٹھنڈ رکھ کڑیے ٹھنڈ رکھ!“

”کیا واقعی یہ ہنسون کی جوڑی ایک ہونے والی
ہے۔“ سلمیٰ بھابی تقریباً چیختے ہوئے بولیں۔
”ہوں!“ سیکنڈ بیگم نے کہا۔

شیریں ایک دم شرم سے سمٹ گئی جبکہ سبھی نے
ہرے کانچہ لگایا۔

”یہ دونوں تو چھپے رستم نکلے۔ دیکھو ذرا ہمیں
بھنک بھی نہیں لگنے دی۔“ ارسلان بولا۔ ”اور کیا ہم
سمجھے کہ ابھی ان کی عمر کتوں کے پنوں سے کھیلنے والی
ہے اور یہ ہم سے بھی پہلے بینڈ باجا بجوانے کی تیاری
کر رہے ہیں۔“ نعمان بولا۔
سبھی ہنس پڑے۔

رضیہ بیگم نے بڑھ کر اس جوڑے کی نظر
اتاری۔ ”جیتے رہو۔ میرے بچو سدا آباد رہو۔“

”بلو بھئی۔ اب سارے ذرا جوڑوں میں آؤ
تصویر کے لیے۔“

ارسلان کیمرہ دوبارہ سنبھالتے ہوئے بولا۔
”سب سے پہلے دولہا اور اس کی امی کی جوڑی،

پھر بہنوں کے ساتھ اور پھر.....“ نعمان مزید بولتا
اس سے پہلے ہی رمیز نے ٹانگ اڑائی۔ ”ہمیں پتا
ہے اور ذرا جلدی کریں دلہن والوں کا کھانا کہیں ٹھنڈا
نہ ہو جائے۔“

”اچھا ہے بھئی یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ ہمیں
ان لمحوں کو یادگار بنا لینا چاہیے۔“ شہود نے نعمان
کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سب اپنے اپنے پارٹنر کے ساتھ تصویر بنوانے لگے۔ ”شیری یار! آج تم واقعی ہی حسین لگ رہی ہو۔“ فرہاد نے شیری کو اکیلا کھڑے دیکھا تو موقع غنیمت جان کر بولا۔

”ہاں پتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ شیری کوئی کام دل سے کرے اور وہ خراب ہو۔“

”ہاں بھئی! مگر پتا ہے جب تم نے اس آئیڈیا کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے لگا تھا کہ تم کارٹون لگو گی۔“ میں دل ہی دل میں تم پر ہنس رہا تھا۔

”فرہاد کے بچے تو رک ذرا تو مجھے کارٹون تصور کرتا ہے۔“

وہ کارٹون والی بات سن کر اس پر چڑھ دوڑی۔ ابھی دو تین ہی گھونٹے مارے ہوں گے کہ شہود آگیا۔

”اوہوں.....“ وہ ان کا دھیان اپنی طرف کرنے کی خاطر کھٹکھارا۔

”اوہ بھائی آپ! چھوڑ شیری!“ فرہاد اپنے آپ کو چھڑا کر بولا۔ شیری بھی ایک دم سنبھل گئی۔

”Congratulations“ میں تم دونوں کے لیے بہت خوش ہوں۔ تم دونوں واقعی ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ اور شاید یہ بات تم بھی نہیں جانتے۔ میں نے شیری کے لیے انکار بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ تمہاری ہو جائے۔ شیری I am really

sorry مگر میں جب بھی تم دونوں کو دیکھتا تھا تو لگتا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر بالکل ادھورے ہو۔ اور اگر کوئی تیسرا بندہ تم دونوں کے درمیان آ جاتا تو شاید تم دونوں ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔“

”مگر شہود آپ نے تو.....“ شیری حیرانگی سے بس یہ ہی بول پائی۔

”تم لا ابالی سی ہو۔ یہ ہی ناں؟ امی سے میں

نے ہی کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کوئی تو مضبوط ریزن ہونا چاہیے ناں انکار کے لیے اور یہ بالکل سچ ہے۔“

”مگر آج تم بالکل لا ابالی سی نہیں لگ رہی اور سچ کہوں تو آج مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ شاید غلطی ہو گئی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”اچھا جی! ابھی بتاتا ہوں نیلہ بھابی کو کہ شہود بھائی کو افسوس ہو رہا ہے۔“

فرہاد بات کو سنبھالتے ہوئے اور ماحول کو ہلکا بنانے کے لیے بولا۔

”نہیں وہ بہت اچھی ہے۔ اور I am sure میں اس کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزاروں گا۔ انشاء اللہ۔“

شہود کے جانے کے بعد فرہاد نے شیری کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

”تمہیں تو کوئی افسوس نہیں ہے ناں شیری۔“

”ہوں! نہیں! بالکل نہیں میں اپنے خدا کے اس فیصلے سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم جتنے اچھے دوست ہو اس سے کہیں زیادہ اچھے جیون ساتھی ثابت ہو گے۔“

”میں دعویٰ نہیں کرتا مگر کوشش پوری کروں گا۔ چلو ہم بھی چل کر تصویر بنوالیں کہیں ہمیں چھوڑ کر نہ چلے جائیں یہ لوگ۔ کوئی بھروسا بھی تو نہیں ہے۔“

فرہاد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے شیری نے بہت گرم جوشی سے تھام لیا۔

دونوں کے خوشی سے چمکتے چہروں کو شہود نے مسکرا کر دیکھا تھا لیکن اس مسکراہٹ میں چھپے درد کو کوئی بھی نہ مان پایا تھا۔

آج شیرازی ولا میں محبت اور خوشیوں نے ایک بار پھر ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

ہر طرف محبت کی بڑ سکون ہوا چل رہی تھی۔

☆☆.....☆☆

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہدار یوں، طبقہ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے دار ناول کی اٹھارویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو دینی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانفرنس سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جولائف بھر پور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُم فروا اُم زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُم فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیروہ کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیروہ کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُم فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیروہ کی کال آگئی.....

میڈم فیروہ نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُم فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُم فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کا شان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کا شان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح چمکڑ جانے پر دہمکی ہے۔ کا شان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کا شان احمد کا اظہار محبت اُس کی زندگی میں کچھل چکا ہے۔

ماہین کے دل میں کا شان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے چھچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں ٹکراؤ ہونے لگی ہے۔ میڈم فیروہ بلال کو اُم فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُم فروا کی رام کھانا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد والا میں لے جاتا ہے اور انیسویں میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیروہ بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنادیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں



ہو پاتی۔ وہ ماں کے سگھاس پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی بوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ اہل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہر النساء بیگم سے اہل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ ادھر مہر النساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائیں کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اس صورت حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر.....

(اب آگے پڑھیے)

”ہر شخص دوسرے کے بارے میں کتنی سہولت سے قیاس آرائیاں لگا لیتا ہے۔“ خاموشی کی زبان اُم فردا کے اندر واویلا برپا کر گئی۔ زیست کے ان گنت لمحوں کا حساب وہ کس سے مانگتی۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ اُن کی گھمبیر آواز نے خاموشی کے قفل اچانک توڑے، پل بھر میں دونوں کی نگاہیں ملیں، ایک باریک ملک مصطفیٰ علی کو محسوس ہوا کہ اُم فردا کی آنکھوں کی پتیلیوں پر اُن کا عکس تھر تھرا رہا ہے۔

”کچھ نہیں۔“ حالانکہ اس کے اندر ایک الاؤ تھا دہک رہا تھا۔

”اُم فردا آپ کے دل میں کوئی بھی اندیشہ، فکر مندی کھٹک رہی ہے تو آپ بلا جھجک مجھ سے شیر کر سکتی ہیں۔“ اس وقت وہ کچھ کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ آخر کس برتے پر اس کی آنکھیں شکوے ڈکاتیں۔ اس وقت ملک مصطفیٰ علی کا دل چاہ رہا تھا اس کے چہرے کی مقدس اُداسی ہمیشہ کے لیے چن لیں، جو پھر کبھی نہ اس شاداب چہرے پر چھلکے، دونوں ہی خاموش تھے، بس خاموشی گفتگو کر رہی تھی۔

☆.....☆

”اے اللہ! ہمیشہ کی طرح میری مدد فرماتے رہنا۔ میں بندہ بشر ہوں بس میرے لیے وہ کر دے جو میرے لیے بہتر سمجھتا ہے۔ تجھ سے بہتر جاننے والی کوئی ہستی نہیں۔ اے رب کل رب دو جہاں سمیع علیم میرے لیے آسانیاں فرماتے ہوئے مجھے قوی ہمت عطا کر۔“ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کب سے جاء نماز پر بیٹھتی اپنے رب سے باتیں کر رہی تھی۔ کبھی گڑ گڑاتے ہوئے رقت آمیزی سے سر بسجود ہو جاتی، کبھی دوزانو بیٹھی ہاتھوں کی گلابی ہتھیلیاں جوڑے انہیں پیشانی سے ٹیکے رب سے ہمکلام ہو جاتی تھی۔ اچانک سے اس کے بے قرار دل کو گہرا سکون میسر آ گیا۔

اس کی زندگی کے بے شمار لمحات بلال حمید نے ایک انٹ سیاہی سے رقم کیے تھے، جنہوں نے اُم فردا کی زندگی کو رنجیدہ کر دیا تھا۔

”اُم فردا گزشتہ لمحوں کا مت جواب دو، اُن کی بار بار کی پکار کو اُن سنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ رب نے تم پر کرم کیا بس اُس کی عنایت کو یاد رکھو۔ وہی تو تمہارے اس درد کو تمہاری روح سے کھینچ نکالنے والی ہستی ہے۔“ مبہم احساس بار بار اُسے سنہال رہا تھا۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ کب کی جاء نماز پر بیٹھتی تھی۔ نم پلکوں کو اُس نے ملائم پوروں پر نکالیا تو گداز ہتھیلی کے بیچوں بیچ تمام نمی جذب ہو گئی۔ وہ کھل کھلا کر مسکرائی اور کھڑے ہوتے ہوئے عشاء کی نماز پڑھنے لگی۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ اپنے لیے ایک کپ چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ آج اس نے پورا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے نئے تیلے قدموں میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔ فریق کھولا تو فریق کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے دودھ کا پیکٹ نکالا اور چائے بنانے لگی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دوپٹہ درست کرتی بنا آہٹ نرم نرم پاؤں مار بل فرش پر جماتی۔ دروازے تک آئی۔

دو شیشہ 212

”کون؟“ دروازہ کھولے بغیر اس نے پوچھا۔

”مصطفیٰ علی ہوں۔“ دوسری جانب سے جواب آیا۔ دروازے کے اُس پار کھڑی ام فرات نے دل میں عجیب سی بے کلی ابھری جو تیزی سے اُس کے اطراف کھڑکی ڈالنے اپنے اندر جھلکی چلی گئی۔ یہ کیسی غمناکیت آمیز چہچہائی تھی جو اسے بے قرار کر رہی تھی۔ سماعتوں میں سیٹیاں بچتی چلی گئیں۔ اپنی اس کیفیت سے ہراساں ہوتے ہوئے وہ سٹ پٹائی۔

”میرے رب یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ بس تو ہی مجھے ہدایت دینے والا ہے۔“ کتنے لمحے گزر گئے اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اب بھی ایک لرزش تھی جو اس کے وجود پر طاری تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگی۔ دل کی دھڑکنیں اب قدرے اعتدال پر آچکی تھیں لیکن نفس بدستور تیز تھا۔

”اندرا آ سکتا ہوں۔“ ملک مصطفیٰ علی ابھی تک دہلیز کے اُس پار تھے۔

”ضرورت شریف لائیے۔“ وہ اندر آ گئے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ انہوں نے بغور اُم فروا کی متورم آنکھوں کی طرف بظاہر طائرانہ نگاہ ڈالی لیکن وہ اس کی آنکھوں کا احوال اندر تک جان گئے تھے۔ تب اُن کے بچے بھاری ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ ابھرتے ہوئے دوسرے لمحے معدوم ہوتی چلی گئی۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی بے قرار دل کو قرار عطا ہو گیا۔ کیسا قیامت خیزی لیے ہوئے ہے، اس کا اُداس سوگوار حسن..... مجسم کر دینے کی قدرت جس کے اندر کوئی کثرت کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ خداوند کیا یہ اس کے اس بے انتہا بے پایاں حسن کا ہی کرشمہ ہے جو مصطفیٰ علی وہ نہیں رہا جو وہ تھا۔ ہر بار ایک نئے انداز سے وہ ٹھٹھکتے تھے۔ اُم فروا متذبذب کنفیوز سی اُن کے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سیاہ چہرے کی خوشامی کھینچی میں اُن کے شفاف پیر چمک رہے تھے۔ اُم فروا نے دونوں ہونٹوں کو آپس میں ملا کر دبا دیا۔ ملک مصطفیٰ علی کے احساس کی بار آوری اُم فروا کو اپنے ایوانوں سے نکلنے ہی نہ دے رہی تھی۔ اُم فروا کی سیاہ آنکھوں پر لرزتی پلکیں جن میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے ایک بار اُس کی جانب کن اکھیوں سے دیکھا۔ وہ آہستہ روی سے چلتے لاؤنج میں آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں چند شا پرزد کچھ کرا اُم فروا نے سوالیہ نگاہوں سے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔ تمام چیزیں انہوں نے سینئر ٹیبل پر رکھ دیں اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے نظریں جھکا کر کھڑی اُم فروا کی طرف دیکھا، جس کے حسن کا تابناکی لیے فسوں بہت بھیل رہا تھا۔

”کیا ہو رہا تھا؟“ ملک مصطفیٰ علی کی گداز نگاہیں بدستور اُم فروا کے صبح چہرے پر ٹھہرتی جا رہی تھیں۔

”جی.....!“ بر جستگی میں اُس نے جی..... کو خاصا لمبا کھینچا تھا۔ وہ اس خاص الخاص ہستی کے انداز پر مخطوط ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

”وہ میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔“ گردن پر مخروطی انگلیوں کی پوری سرسرا تے ہوئے وہ ہکلا کر گویا ہوئی۔

”پلیز دو کپ بنا لیجیے، مجھے بھی چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔“

”جی اچھا۔“

”یہ گرم گرم ٹکٹس اور پیزا ہے یہ بھی لے آئیں بھوک لگی ہے۔“ ملک مصطفیٰ علی نے نرمی سے اپنے بائیں گال پر انگشت شہادت سرسرائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایزی ہو کر بیٹھ گئے۔ اُم فروا بلاوجہ بار بار دوپٹے کو درست کر رہی تھی۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، پہلے ہی فریج بھرا پڑا ہے۔“
 ”اُم فروا یہ کیا تکلف ہے۔“ ملک مصطفیٰ علی مسکرائے۔ اس وقت وہ گھبرائی ہوئی لڑکی دوپٹہ درست کرتی تو
 کبھی اپنی انگلیاں مسلّتی خطرناک حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ تب اُم فروا نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی اور
 کچن کی طرف بڑھ گئی۔ انہوں نے دیوار گیریل سی ڈی آن کیا، اسکرین کی بجائے اُن کا دھیان کچن میں موجود
 اُم فروا کی طرف ہی تھا۔ خداوند قدّوس نے ملک مصطفیٰ علی کے سینے میں اُم فروا کے انس کے کیسے مشکبار شہر بسا
 دیے تھے، جن سے رہائی چاہتے ہوئے بھی اب ناممکن تھی۔ وہ کیا نام دیتے اس احساس کو جس نے ملک مصطفیٰ
 علی کے دل کی ہر ریش کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ دوپٹے کے ہالے میں قید اُس کا نورانی چہرہ دور سے جھلک رہا تھا۔ تب
 اچانک سے ملک مصطفیٰ علی نے آنکھوں کو مضبوط انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔ وہ سرگوشی میں بڑبڑائے۔

”اے اچھی لڑکی! تیرے چہرے کے یہ پاکیزہ رنگ اب تو ہمیشہ کے لیے میری زیست کے موسم بن گئے
 ہیں۔“ تب انہوں نے خلوص دل سے اپنے رب سے التجا کی تھی۔

”میرے پیدا کرنے والے! اسے میرا کر دے یا مجھے اسے سوپ دے۔“ غیر ارادی میں اُن کے پاؤں
 ہونٹ ہل رہے تھے۔ تب آنکھوں کی کوروں میں کہیں دور ملک سی نمی اُترتی تھی۔ اُن مختصر پلوں میں ملک مصطفیٰ علی
 کے دل میں گہری شدتیں و جذباتیت عود آئی تھی۔ اُن کا دھیان اب بھی کچن کی طرف تھا، جہاں اُم فروا موجود
 تھی۔ دیز شلفٹنگی و تازگی میں مقید تھا اُس کا چارمنگ سراپا۔ اس وقت انوکھی طمانیت ملک مصطفیٰ علی کے چہرے پر
 عیاں تھی۔ وہ اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔ وہ تو صرف اور صرف اُم فروا کو ہی سوچنا چاہتے تھے۔ جس نے اس
 کڑیل مضبوط ملک مصطفیٰ علی کو ایک دم سے نکما کر دیا تھا۔ وہ چونکے کیونکہ اُم فروا اُٹرائی گئی تھی اُن کے قریب آ چکی
 تھی۔ وہ عالم بے خودی سے عالم ہوش میں لوٹ آئے۔ جب اُم فروا نے چائے کا کپ اُن کے سامنے رکھا تو وہ
 دل سے مسکرائے۔ اب وہ پلیٹ اُن کے ہاتھ میں پکڑا رہی تھی۔ اُم فروا کی کپکپاتی انگلیاں دیکھ کر وہ مسکرائے اور
 اُس کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ لی۔

”اُم فروا، آپ نے دوپہر کو کھانا کھایا تھا؟“ وہش پیش اٹھاتے ہوئے بولے۔

”نہیں۔“ اُس نے نظریں کترائیں۔

”واٹ؟“

”بھوک نہیں تھی۔“

”اُم فروا مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ آپ نے لंच نہیں کیا۔“ لہجہ ذومعنی تھا متحیر سی وہ خاموش تھی۔
 اُم فروا چائے کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتی پلیٹ میں پیزا کا پیس رکھ کر۔ سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ ملک مصطفیٰ رغبت
 سے شش کھا رہے تھے۔

”میں دوپہر کو سائٹ پر چلا گیا تھا، اسی چکر میں میرا لंच بھی رہ گیا۔“ وہ بلاوجہ فضول بے نیکی گفتگو کر رہے
 تھے۔ وہ خاموش تھی۔ ان چار دنوں میں وہ جس فیصلہ پر پہنچ پائی تھی، آج ہر صورت اُسے ملک مصطفیٰ علی کو آگاہ
 کرنا تھا۔ اُم فروا کے پاس کیسی طلسمانی جادوئی چھڑی تھی کہ جب بھی ملک مصطفیٰ علی اس حسن بانو کے سامنے
 آتے غیر محسوس انداز میں اسے ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ بالکل ایسے ہی جس طرح اصلی اطلس وریٹیم کی فرل والی
 قالین کی محالیں گداز سطح میں تھکے ماندے ہیر گم کر کے دلنشین لطف کا احساس روح کے ایوانوں میں رچ بس جاتا

ہے۔ کمیز کی سے آتی تازگی بھری خوشبو کی مہک سانسوں سے کمراتی، گزرتے لمحوں کی دبیزی میں خاصا اضافہ کر رہی تھی۔ سفید مہین نائیلون کے پردوں کی شوخ سرسراہٹ کے ساتھ مغرب کی جانب سفر کرتے سورج کی بنفشی و نارنجی کرنیں چھن چھانی اس نشست گاہ کو انوکھی دلکشی بخش رہی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے پر، پریشانی، روشنی منعکس ہو ہو اٹھتی، تب زندگی سے کشید کیے گئے یہ چند سے ان نفوس کو خاصا متبرک بنا گئے تھے۔ وجاہت آمیزی کے ضمیر سے گندھا کسرتی سراپے والا مرد اور حوروں جیسا تقدس رکھتی سحر کار لڑکی..... ساکن ساعتوں کے محور میں اسیر ہو چکے تھے۔

دونوں کے درمیان اچانک گہری خاموشی آٹھہری تھی۔ اُم فروا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھی۔ آج وہ ہر صورت ملک مصطفیٰ علی سے بات کرے گی لیکن گلے کی کھٹن سانسوں کو اعتدال پر نہ آنے دے رہی تھی۔ پورس کرتے گلے کی کھچ کھچ پر وہ قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں مضجحل تھیں۔ آواز تھی کہ کہیں اندر ہی سو گئی تھی۔ لبوں پر کچھ کہنے کی آمیزش چل رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے۔ اس کے ہاتھ زور سے کانپے، اُس نے چائے کا گلدی سے واپس رکھ دیا۔ غیر ارادی طور پر اُم فروا کی نگاہیں ملک مصطفیٰ علی کی جانب اٹھیں، ہونٹوں کے درمیان ہلکی سی مسکان دبائے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اُم فروا کی طرف دیکھا۔ ملک مصطفیٰ علی کی پُرشوق نگاہیں، جن میں اُم فروا کے لیے احترام تھا، اُم فروا کے نازک اندام سراپے کو پگھلا گئیں، جو اس کے بوند بوند ہو میں سرایت کرتی چلی گئیں۔ یہ اُس شخص کی ایسی بھرپور توجہ کا کمال تھا۔ اُم فروا کی روح کیوں اس غیر محرم شخص کے اطراف ہلکورے کھا رہی تھی۔ وہ ایک رئیس زادہ تھا۔ لیکن اُن کے روبرو ایسی نزدیکی میں بیٹھنا اُم فروا کے وجود کے دشت میں آشفٹگی کی آمیزش کی مدھر خوشبو بوسا جاتا۔ اُم فروا نے اپنے رب کو خلوص دل سے مدد کے لیے پکارا۔ مجھے ہمت دے! میرے لیے بہترین فیصلہ فرما۔ اچانک اُس نے ملک مصطفیٰ علی کو مخاطب کیا۔

”ملک صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”فرمائیے!“ اُن کی روشن چمکتی آنکھیں اُم فروا کے شہابی چہرے پر لمحہ بھر ٹھہریں۔ اُم فروا کے ہونٹوں کی لرزش بڑھی اُس نے ڈپٹ کر خود کو زچ ہونے سے بچایا۔ اس سے پہلے کہ چائے چھلک کر اس کے ہاتھ پر قہر برسا جاتی اُس نے نگ ٹھیل پر رکھ دیا۔

”ملک صاحب آپ نے مجھے اختیار دیا ہے ناں میرے فیصلے کو آپ مقدم جانیں گے۔ میں سوچ کر اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دوں۔“

”جی فروا میں نے کہا تھا، فرمائیے؟“ ملک مصطفیٰ علی کے لہجے کی پور پور میں نرمی بھری شیرینی گھل رہی تھی۔

”آپ مجھے میرے پیرنس کے پاس بھجوادیں۔“ سراپے کی کیفیات سے دو چار وہ سائیس رو کے ملک مصطفیٰ علی کو ٹھٹھکی باندھے دیکھتی رہی۔ جانے اُسے کیا جواب ملے۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کے جواب کی منتظر تھی۔

”اُم فروا آپ نے فیصلہ کر لیا۔“ چند ثانیے بعد وہ گویا ہوئے۔

”جی! میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔“ عرق ریز پیشانی پر اُس نے سپید انگلیاں

سرسراہیں۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی خوشی۔“ یک لخت ملک مصطفیٰ علی کی شہد آگئیں براؤنش آنکھوں میں اداسی کی لہر پھیلی تھی۔ لیکن ہونٹوں پر بدستور زچ سی مسکان کھلی تھی۔

”ملک صاحب آپ مجھے آج ہی بھیج دیں۔“ ملک مصطفیٰ علی نے سرعت سے گہری سیاہی سے مزین اُم فروا کی لابی آنکھوں کی طرف بغور دیکھا۔ شاید وہ ایک پل بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ جاں کنی کی حالت ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی تھی جس قدر جلد ممکن ہو وہ اس قیامت خیز گھڑی سے گزر جائے جو اس کے گھر والوں پر ٹوٹنے والی تھی۔ ایسی ساعتوں کو اب مزید جھیلنا سوہان روح تھا۔ اُم فروا کے لیے، ملک مصطفیٰ علی نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا۔ اُم فروا کے یہاں سے جانے کے تذکرے نے انہیں ہولا دیا تھا۔ اُم فروا کی قربت کے چند لمحے ملک مصطفیٰ علی کی دسترس میں آ جاتے جہاں اُن کے لیے عجیب سی سرشاری کا عالم تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کے لیے یہ احساس ہی باعث راحت تھا کہ وہ ملک مصطفیٰ علی کے روبرو ہے۔ ایسے ارفع لمحات ہی انہیں مسرور کر دیتے اگر تمام عمر بس اتنی سی نزدیکی ہی انہیں میسر آ جائے تو وہ اسی پر ہمیشہ خوش رہیں گے۔ وہ اس مقدس لڑکی کو روح سے چاہنے لگے تھے۔ روح جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

”کیا اب وہ اُم فروا کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟“

”وہ اس کی دید سے محروم ہو جائیں گے؟“ یہ خیال کس قدر سفاک اور کٹیلا تھا جو اُن کی روح میں چھید کر رہا تھا۔

”اُم فروا میں ایک دم تو آپ کو مولوی صاحب کے پاس نہیں لے جاسکتا۔ ایک دو دن تک میں خود انشاء اللہ آپ کو وہاں لے کر جاؤں گا۔ اچانک وہاں آپ کو چھوڑ دینے کی وجہ کیا بیان کروں گا۔ ڈائریکٹ تو اُن پر ایسی قیامت نہیں توڑی جاسکتی ناں کہ آپ کی شادی کی بنیاد ہی فریب اور دھوکے پر رکھی گئی تھی۔ بلال حمید جو دکھائی دیا اصل میں وہ نہیں تھا اور پھر انہیں یہ بھی تو یقین دلانا ہے کہ آپ آج بھی ویسی ہی اُجلی ہیں جیسی مولوی ابراہیم کے گھر سے رخصت ہوئی تھیں۔ صبح نور کے اولین شبنمی قطرے اب بھی آپ کی روشن پیشانی پر سجدے کرتے ہیں۔“

یہ سب کہتے ہوئے ملک مصطفیٰ علی اُس سے نظریں کترارہے تھے۔ اُم فروا خاموش تھی، خوفزدگی بدستور اُس کے چہرے پر کھنڈی تھی۔ دوسو سے اس کے گرد اپنا حصار تنگ کر رہے تھے۔ یہ دو مرد مل کر جانے میری ذات کا کیسا تماشا بنانے والے ہیں۔“

اُم فروا نے یک بارگی کانپ کر ملک مصطفیٰ علی کی مقناطیسی کشش کی حامل براؤنش آنکھوں کی طرف دیکھا جہاں آنکھوں سے نیچے سیاہ کھنٹی تراشیدہ مونچھوں تلے گلابی بھرے بھرے ہونٹ شدید سختی کے عالم میں بھیجے جا رہے تھے۔

”ملک مصطفیٰ علی مجھے آج کیوں نہیں چھوڑ کر آتے۔ آخر انہوں نے کیوں ٹال دیا ہے مجھے؟ کیا یہ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ ان کی نیت میں کھوٹ ہے، دوسو سے تھے کہ اس کے اطراف کنڈلی ڈال کر بیٹھے تھے۔ اچانک اُس کا پورا وجود لرز اٹھا۔ اُم فروا ایسا مت سوچو خدا ناراض ہوگا۔ اُس کی رحمت کو کیوں نہیں یاد رکھتیں۔ کفران بھری سوچوں میں خود کو مت الجھاؤ، خدا نے اب تک تمہیں بچا کر رکھا، تمہاری عزت محفوظ ہے، یہ اُس مالک کا کرشمہ ہے۔ ایسے معجزے خدا اس لیے اپنے کمزور بندوں پر عیاں کرتا ہے تاکہ بندہ مکمل اُس کی ذات پر بھروسہ کرنا سکھے، اُس پر توکل رکھے۔ اُس کی اعلیٰ قدرت کو ماننے۔“

”اُم فروا کیا سوچ رہی ہیں؟ شاید میری بات سے آپ پریشان ہو گئی ہیں۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں، تیار ہو جائیں۔ میں ابھی آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

وہ ہول اٹھی۔ اُسے لگا وہ اباجی کے سامنے مجرم بنی کھڑی ہے۔ میں اُن سے کیا کہوں گی کہ میں طلاق لے کر آپ کے پاس آ گئی۔ ملک مصطفیٰ علی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ وہ پہلے اباجی کو طریقے سے تمام حالات بتائیں

گے۔ ممکن ہے تب میں ابا جی اور بے بے جی کا سامنا کرنے کی ہمت کر پاؤں۔
 ”اُم فروا کیا سوچ رہی ہیں؟“
 ”کچھ نہیں۔“

”اپنا ضروری سامان لے لیں اور چلیں۔“

”ملک صاحب پہلے آپ ابا جی سے بات کر لیں۔“

”یہی تو میں آپ کو سمجھا رہا تھا۔ پہلے میں مولوی صاحب سے بات کر لوں، انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے تمام حقیقت سے آگاہ کروں گا۔ بس آپ دعا کریں اللہ پاک مجھے اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔“
 ”آمین۔“ اُم فروا نے دل میں کہا۔

”اس وقت تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ کل میں فیکٹری سے واپسی پر مولوی صاحب سے جا کر ملوں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ ہماری نیک نیتی کو آسمانوں میں براجمان مالک دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ کیسے ہماری مدد نہیں کرے گا؟ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی۔“ انہوں نے مسکرا کر اُم فروا کو دیکھا۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھے۔ اُم فروا اب انہیں قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

”میں تازہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ اُم فروا نے اُن سے نگاہیں کترائیں اور کپ اٹھائے کچن کی جانب بڑھ گئی۔ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ توقف بعد دوکشن کہنیوں کے نیچے رکھے اور کچن کی جانب دیکھا جہاں اُم فروا انہیں چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔

سکوت بھری گھمبیر خاموشی غلسماتی سحر کی بازگشت ان کے گرد جالے بن رہی تھی۔ مہین پردوں سے چھن کر آتی کرنوں کی دانے دار جھللاہٹ اطراف میں ناچتی منعکس ہوتی رہی لیکن ملک مصطفیٰ علی کی تمام توجہ کچن کی طرف مبذول تھی۔

☆.....☆.....☆

بلال حمید سانسیں تو لے رہا تھا لیکن ایسی سانسیں اُسے خود پر بو جھلگ رہی تھیں۔ وہ لمحہ لمحہ موت کا ذائقہ جیتے جاگتے چکھ رہا تھا۔ پشیمانی تھی کہ جس کی انتہاؤں کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ اُسے خود سے گھن محسوس ہو رہی تھی۔ جس نے پیسے کی خاطر کس قدر غلط کام سرانجام دیے تھے۔
 ”میں نے ایسا کیوں کیا۔“ وہ بالوں کو مٹھیوں میں مضبوطی سے جکڑ لیتا۔

”کیا ایک بار بھی میرے دل میں خوفِ خدا نہ آیا۔ میں تو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا، جس کی پیدائش کے وقت ہی کان میں اذان دی جاتی ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ پھر مجھے اس مفہوم کی آگہی کیونکر نہ ہوئی۔ اے رب اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنائے گئے تھے تو ہمیں اتنے مقدس بندھن میں کیوں باندھ دیا گیا۔ اچانک اس کا موبائل بجا تو وہ چونک گیا اور خیالوں کی ڈوریاں گم ہوتی چلی گئیں۔ اس نے خشک ہاتھ پسینہ سے تر پیشانی پر پھیرا۔ موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ بلال حمید نے اٹھنا چاہا تو وہ اٹھ نہ پایا اس کی ٹانگیں شل تھیں۔ جیسے کسی نے تمام طاقت کھینچ لی ہو۔ صوفے کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھے وہ بمشکل اٹھ پایا اور موبائل تک پہنچا۔ موبائل اسکرین پر کوئی آن نون نمبر تھا۔ مجھے کون یاد کر سکتا ہے؟“ گلا تر کرتے ہوئے اُس نے سوچا۔

”ہیلو“

”بلال صاحب؟“ لہجہ سوالیہ تھا۔ کھٹکتی نسوانی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”جی بلال بات کر رہا ہوں، فرمائیے۔“

”پہلے مابدولت کا تعارف حاصل نہیں کریں گے؟“

”فون کرنے کی زحمت کی ہے تو یہ زحمت بھی کر لیجیے۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں ثمرین بات کر رہی ہوں۔“

”سوری میں کسی ثمرین کو نہیں جانتا۔“ بلال حمید نے سیل آف کر دیا۔ اُس نے سامنے لگے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی رات کا ایک بج رہا تھا۔ نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ وہ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھ کر آیا تھا۔ تب سے اس صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُم فروا کے خیال نے گزرتے وقت کے احساس سے اسے غافل کر دیا تھا۔ بلال حمید کو اُم فروا کو طلاق دیے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ یہ دو ہفتے جیسے کسی دار پر لٹکتے ہوئے بیتے تھے۔ کسی پل اسے قرار نہیں آتا تھا، دل بین کرتا تھا۔

اس کی آنکھیں نیند کے لیے ترس گئی تھیں۔ تمام رات اس پر غنودگی کا غلبہ طاری رہتا۔ وہ پُر سکون نیند کئی دنوں سے سونہ سکا تھا، نزع جیسی کیفیات میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اُم فروا کے نازک مخروطنی انگلیوں والے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ اب وہ اپنے خالی ہاتھوں کو بغور دیکھتا تھا۔ اُم فروا کا لس بلال حمید کے ہاتھوں کو پسینے سے بھگو جاتا اور وہ سسک پڑتا۔ آنکھوں میں کب سے رُکے آنسو پکے پھوڑے کی طرح ٹیسیں پیدا کر جاتے۔ دل پر تیر برسنے لگتے۔ کیا میں تمام عمر بے آب مچھلی کی طرح تڑپتا رہوں گا۔

”ہاں بلال حمید تمہیں تڑپنا ہی ہوگا۔ یہ سزا ابھی بہت کم ہے۔ تمہیں تو ہر لمحہ مرنے جینے کے عمل سے دوچار ہونا ہوگا۔ اب تو تمہاری تمام زندگی رب سے سکون کی بھک مانگتے ہوئے گزرے گی۔ تمہاری سزا کی تو ابھی شروعات ہیں۔ یہ سزا تو عمر بھر کے لیے تمہارے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔“ تب اُس کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ کتنی دیر تک اندھیرے کمرے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ اُسے کسی پل سکون نہ ملتا۔ تہجد کا وقت آتا تو وہ وضو کر کے مصلے پر کھڑا ہو جاتا۔ جب وہ بارگاہ الہی میں سجدہ ریز ہوتا تو اُسے گہرا سکون مل جاتا۔ اس وقت وہ اپنے خدا کا شکر ادا کرتا۔ رات کو اُسے نیند تو آتی نہیں تھی لہذا وہ آفس کا کام گھر پر اٹھالاتا۔ اس دوران ایک دو بار اس نے اُم فروا کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی جب وہ کچن سے کچھ لینے جا رہا ہوتا تو وہ اُسے دکھائی دے جاتی۔

☆.....☆.....☆

اُم فروا کی رشتوں سے بھری زندگی کس قدر اجاڑ ہو چکی تھی۔ اکثر گھر سے فون آتے رہتے، اُم زارا شور مچاتی کہ آپی آپ کے لیے سب بہت ادا ہیں۔ ایک چکر لگا جائیں۔“ لیکن اُسے مصلحت کی چادر میں ہی رہنا تھا۔ وہ کہتی کہ زارا تمہارے بھیا بہت مصروف ہیں۔ اُن کا شیڈول ان دنوں بہت ٹف ہے۔ آنا مشکل ہے، تم آ جاؤ۔“ ایک دو مرتبہ اُم زارا اور اسماعیل آئے بھی تھے۔ اُس وقت بلال حمید دفتر میں ہوتا تھا، عزت کا بھرم رہ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس چلے جاتے تھے۔

”آپی بھائی بھی آج کل بہت مصروف ہیں۔ ان کا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ خطاطی کے زیادہ سے زیادہ آرڈرز آرہے ہیں۔ انہیں کافی بڑی رقم ایڈوائس ملی ہے۔ وہ پیسے اباجی کے مشورے سے انہوں نے بینک میں جمع کرادیے ہیں۔“

اسماعیل بخش نے یا سترز مکمل کر لیا تھا۔ یہ ہنرخص شوق کی بنا پر اُس نے شروع کیا تھا۔ اُس کی آرٹسک انگلیوں میں اتنی مہارت تھی کہ اکثر وہ خود دنگ رہ جاتا۔

”بھائی نے ابا جی سے مشورہ لیا ہے کہ کوئی دوکان کمرشل ایریا میں کرائے پر لے کر اس کام کو مزید آگے بڑھائیں۔ موچی گیٹ والے گھر کو کرائے سے اٹھا لیا ہے۔ اسے بھائی ٹھیک کر رہے ہیں۔ ہم سب وہیں شفٹ ہو جائیں گے کیونکہ وہاں بھائی کی دوکان نزدیک ہے۔ ابا جی کہہ رہے ہیں فی الحال اس گھر کو رینٹ پر دے دیں گے اور جو ہماری دوکان کرائے پر تھی، تین ماہ تک بھائی اُس میں اپنا کام شفٹ کر دیں گے۔“

”اُم زارا آج تو تم مجھے بہت اچھی اچھی خبریں سنارہی ہو۔ میرا دل خوش کر دیا تم نے۔ شہر میں آ جاؤ تو اچھی بات ہے ناں۔ موچی گیٹ والا ہمارا گھر بہت بڑا ہے اور اچھا بھی بنا ہوا ہے۔ گلیاں بھی اب تو کھلی ہو کر پکی ہو گئی ہیں۔“

”ہاں آپی میں اُسے اپنی مرضی سے سیٹ کروں گی۔ بھائی نے کہا ہے کہ ہم وہاں پر سارا نیا فرنیچر لیں گے۔ آپی بہت مزہ آئے گا۔ اب ابا جی بھی بھائی پر زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے۔ بے جی انہیں سمجھاتی رہتی ہیں۔ دیکھا آپی سیانے ہو گئے ہیں ناں ہمارے ابا جی۔“ اُم زارا اپنی بات کے اختتام پر زور سے ہنسی تھی۔

بہت عرصہ بعد آج اُم فروا کے ہونٹ مسکائے تھے۔

”بھائی کی خطاطی کی تمام حروف تہجی میں ایگزٹیشن بھی عنقریب ہوگی، پھر تو انہیں خوب شہرت ملے گی۔“

”اُم زارا تم دعا کرتی ہو بھائی کے لیے؟“

”آپی میری دعائیں تو ہوتی ہی آپ سب کے لیے ہیں۔“

”اُم زارا میرے لیے خاص طور پر دعا کیا کرو۔“ یہ کہتے کہتے اُس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ آبدیدہ ہو رہی تھی۔

”اچھا بہت دیر ہو گئی ہے میں فون رکھتی ہوں۔ سنو سب کو میرا بہت بہت سلام دینا اور دیکھو اسماعیل کے ساتھ ایک چکر لگا جاؤ۔“

”میں بھائی سے آپ کا کہوں گی، پھر تو مجھے ضرور لے آئیں گے۔“

”آنے سے پہلے فون ضرور کرنا۔“

”ہاں ضرور کروں گی۔“

آج وہ پورا دن خوش رہی تھی۔ اس کا بھائی اب اچھا کمانے لگا تھا۔ ”اللہ پاک ہمیشہ رزق حلال عطا کرنا اور میرے بھائی کو پل پل اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ ابا جی سے کہوں گی، اب اچھی سی لڑکی دیکھ کر اسماعیل کی شادی کر دیں۔ لیکن میں کب ملوگی اُن سے؟ اتنا سب کچھ جاننے کے بعد کیا وہ مجھ سے بات کریں گے؟ مالک ٹو نے ہی اس آزمائش سے مجھے نکالنا ہے۔“

☆ ☆ ☆

اس رات بلال حمید اپنے سامنے پیپر پھیلائے بیٹھا تھا۔ شام دفتر سے آتے ہوئے وہ چند فائلیں ساتھ لیتا آیا تھا۔ صرف وقت گزارنے کے لیے چند روز سے وہ ایسا کر رہا تھا۔ چائے پینے کو اُس کا دل چاہا تو ہال کی طرف کھٹنے والے دروازے سے وہ کچن میں آ گیا اور اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ آہٹ پا کر اُم فروا نے اپنے کمرے سے کچن کی طرف جھانکا تو اُسے بلال حمید نظر آیا۔ اُم فروا نے پیچھے ہٹنا چاہا تو بلال حمید نے اُسے پکارا۔

”اپنے لیے چائے بنا رہا ہوں آپ پیس کی چائے۔“

”شکریہ۔“ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی، شاید اسے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ جیسی اس کے کمرے سے سی ڈی پلیئر پر تلاوت کلام پاک کی آواز آرہی تھی۔ اس وقت بے سکونی کی کیفیت میں وہ تلاوت سن رہی تھی۔ بلال حمید چائے کا کپ لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ گرم گرم چائے نے اس کے تھکے جسم کو خاصی حرارت اور چستی سونپ دی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اچانک اس کا موبائل بجا۔ بلال حمید نے ٹائم دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے۔“ اس نے کاہلی سے سیل فون اٹھایا۔

وہی ان نون نمبر تھا۔ ان محترمہ کو بھی نیند نہیں آرہی ہوگی۔ بلال حمید نے گہرا سانس لیتے ہوئے نمبر ڈس کنکٹ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر نیل بجی۔

”ارے بھی کیا ہے۔ تم رات کو سوتی کیوں نہیں ہو؟ یا چمکا ڈڑوں کی طرح رات بھر جاگنے کی عادت ہے۔“ وہ بغیر فل اسٹاپ کو مہ بولتا چلا گیا، دوسری طرف سے پھر آج ٹھنکتی ہنسی کی جل ترنگ چہار سو بکھری۔

”اپنی ہنسی سنانے کے لیے اس وقت تم نے مجھے فون کیا ہے۔“

”آپ کا نان اسٹاپ لیکچر سننے کے لیے۔“

”لگتا ہے تم نے رات بھر کا پیکیج کرایا ہوا ہے اور کتنوں کی نیند خراب کرتی ہو؟“

”صرف آپ کے لیے پیکیج کرایا ہے اور صرف آپ کی نیندیں ہی حرام کرنے کی کوشش ہے۔ آزمائش شرط

ہے۔ تمام رات بلا توقف آپ سے گفت و شنید جاری رکھ سکتی ہوں۔“ خوبصورت آواز نے بلال حمید کے سر سے فائلوں کا بوجھ قدرے کم کر دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا مار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے ہاتھ پیچھے کرتے ایک لمبی انگڑائی لی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں اس نے کارپٹ پر پھیلا دی تھیں۔ اس وقت بلال حمید کے اعضا کافی تھک چکے تھے۔ اس لڑکی کی آواز تازہ جھونکے کی طرح اسے غنیمت لگی۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“

”آپ بھول رہے ہیں بلال صاحب! میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہے۔“

”بتایا ہوگا لیکن مجھے یاد نہیں ہے۔ دوبارہ زحمت کریں گی۔“

”بالکل زحمت کروں گی۔ مجھے ثمرین کہتے ہیں۔“

”اچھا فرمائیے ثمرین صاحبہ!“

”آپ کی یادداشت لگتا ہے بہت کمزور ہے۔ آپ اجنبیوں کی طرح بات کر رہے ہیں؟“

”تو ہم اجنبی ہی تو ہیں۔“ بلال حمید نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں۔

”ایک مرتبہ پہلے بھی میری آپ سے بات ہوئی تھی۔“

”اچھا ہوئی ہوگی۔“ لہجے میں لا پرواہی چٹخ رہی تھی۔

”کہہ تو رہی ہوں آپ کا حافظہ بہت کمزور ہے۔“

”ہاں وہ تو ہے کیونکہ عمر کا تقاضا ہے ناں۔“ وہ مسکرایا۔

”کیا عمر ہے آپ کی؟“

”ساٹھ سے اوپر ہوں۔“ وہ کبھی کبھی کر کے ہنسی۔

”آواز سے تو ایسا نہیں لگتا۔“

”کیسا لگتا ہے آواز سے؟“ بلال حمید کا نام اچھا پاس ہونے لگا تھا اس لیے اُس نے بات جاری رکھی تھی۔

”یہی پچیس پچیس سال کے ہوں گے۔“

”چلو تم جو قیاس کر لو وہی ٹھیک ہے۔“

”مسٹر بلال ہم اتنے بھی ابھی بے تکلف نہیں ہوئے کہ آپ مجھے تم کہہ کر مخاطب کریں۔ اب تم کا عنوان نہ بناد دیجیے گا۔“ وہ خاصی تیز طرار لڑکی تھی۔

”یقیناً میں تم سے بڑا ہوں اس لیے تم کہہ دیا۔“

”آپ کو کیسے معلوم آپ مجھ سے بڑے ہیں؟“

”کیونکہ بی بی تمہاری آواز لڑکیوں جیسی ہے۔“

”لڑکی ہوں تو آواز لڑکیوں جیسی ہی ہوگی۔“ اُس کی پھر خوبصورت ہنسی کی آواز بلال حمید کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

وہ مردوں کو شیشے میں اتارنے کا گُر بخوبی جانتی تھی۔ مرد ہوتا ہی احمق ہے، جو اتنی جلدی شیشے میں اتر جاتا ہے۔

”یہ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟“ وہ دوسرے ہاتھ سے پیپرز فائل میں لگانے لگا تھا۔

”جانتی کیا میں نے تو آپ کو دیکھا ہو بھی ہے، اس لیے تو میں آپ پر فدا ہو گئی ہوں۔ کیا ڈشنگ پر سنانی ہے آپ کی۔“

”تم فیکٹری میں کام کرتی ہو؟“

”کون سی فیکٹری بابا۔“ وہ جان بوجھ کر حیرانگی سے بولی۔

”جہاں تم نے مجھے دیکھا ہے۔“ بلال حمید نے اب تمام پیپرز فائل میں لگا لیے تھے اور وہ دوبارہ صوفے کی بیک سے ٹک گیا تھا۔

”بھئی میں نے تو آپ کو ایک لمبی سی زیرو میٹر گاڑی میں دیکھا تھا کسی خوب رو جوان کے ساتھ۔“

”تو پھر اُس خوب رو جوان کے بارے میں کیا سوچا؟“ بلال حمید نے لفظ چبا چبا کر بات مکمل کی۔

”وہ مجھے لفٹ نہیں کرائے گا۔“ شاید وہ اپنی بات پر پھر ہنسی لگی۔

”کیوں؟ تم اتنی بد صورت ہو؟“ آج کئی دنوں بعد بلال دل سے ہنس رہا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا خود کو خوش رکھنے

کے لیے یہ بھی اچھا مشغلہ ہے۔ کیا بات ہے سو بائیل فون کی۔ اے سو بائیل بنانے والے زندہ باد۔ وہ دل میں ہنسا۔

”ہاں میرے چہرے پر چچک کے داغ ہیں۔ سارا چہرہ بھرا ہوا ہے۔“ وہ پھر ہنسی، اُس کی ہنسی سے صاف لگ رہا تھا وہ مذاق کر رہی ہے۔

”تو تم کیا سمجھتی ہو ایک چچک زدہ چہرے والی لڑکی سے میں دوستی کر لوں گا۔“

”میں نے سنا ہے آپ بہت سخی داتا ہیں، سوچا شاید۔“ اُس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”ٹھیک سنا ہے لیکن اب مزید کی گنجائش نہیں ہے۔“

”پلیز میرا دل نہ توڑیں۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”سنو.....“

”ٹھہرین..... ٹھہرین۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں ٹھہرین..... کل رات تم اپنا یہ سیکسج کسی اور پر خرچ کرنا۔ اُمید ہے تمہاری مراد بر آئے۔“

”کسی اور سے کیوں آپ ہی سے کیوں نہیں۔“

”میری دو بیویاں پہلے بھی ہیں۔ وہ تمہیں کچا چبا جائیں گی۔“

”کوئی بات نہیں، میں بھی آگے سے شیرنی ہوں۔ ایک ہی دھاڑ سے دبک جائیں گی۔“

”اور پھر تمہیں روٹی بھی پکا کر کھلائیں گی؟“

”ہاں کیوں نہیں جہاں وہ دو روٹیاں بنائیں گی تیسری بھی بنالیں گی۔ چھوڑ دے یہ سب باتیں، تم مجھے یہ بتاؤ

مجھے کب مل رہے ہو؟“

”اب تم بھی تم پر آ گئیں ناں۔“

”ظاہر ہے، ہمیں اتنا تو فریٹک ہو ہی جانا چاہیے۔ ہاں بولو کب ہم مل رہے ہیں۔“

”میں اپنی دونوں بیویوں سے پوچھ کر تمہیں بتاؤں گا۔“

”اگر وہ بھی تمہارے ساتھ آ گئیں تو؟“

”پھر اور مزہ آئے گا۔ میں یہ دیکھ کر انجوائے کروں گا کہ تین تلواریں کیسے ایک میان میں رہ سکتی ہیں۔“

”مسٹر بلال حمید اس طرح تو پراہم ہو جائے گی؟“

”تو تم میرا پورا نام جانتی ہو؟“

”آف کورس، تمہارا آدھا نام جان کر کیا کرنا تھا مجھے۔“

”تم بھی کمال ہو۔“

”بم بولیں بم ہوں میں۔“

”پھر تو تم بہت خطرناک ہو؟“

”سب سے پہلے تمہاری دونوں بیویوں پر پھوڑوں گی۔“

”اُس کی باتوں سے وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ آج بہت عرصہ بعد نسوانی آواز اُس نے اتنی دیر تک سنی تھی۔ کچھ

دیر پہلے تک جو جسم میں درد اور اکڑاؤ محسوس ہو رہا تھا وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ میٹھی عورت طمانیت بخش مرہم کی

مانند ہوتی ہے۔ عورت کی تھوڑی سی توجہ بیمار ذہن مرد کے دل کے زخم پر اپنی شیریں گفتاری سے تریاق کا کام کرتی

ہے۔ غیر ارادی طور پر اب بلال حمید کو نیند آنے لگی تھی۔ چلو آج رات تو سکون سے سوؤں گا۔ آدمی سے زیادہ

رات گزر چکی ہے کا کی جا کر سو جاؤ۔“

”اب نیند کس کو آئے گی؟“ اس کے لہجے میں بے قراری عود آئی۔

”بی بی مجھے نیند آرہی ہے۔“ بلال حمید کی پیشانی پر تیوریوں کا جال بن گیا۔ آنکھوں کا کساؤ بڑھا، لہجے میں

تلخی بڑھی۔ بلال حمید کے یوتھپ جانے پر، وہ لمحہ بھر کے لیے سٹ پٹائی تھی۔ بلال حمید کو خود سمجھ نہیں آرہی تھی وہ

کس طرح اس بات کوئی لڑکی سے جان بخشی گرائے۔ وہ گلا کھنکار کر ہنسی۔ اس کی کھٹکتی ہنسی بلال حمید کی سماعتوں سے

ٹکرائی۔ اس دلنشیں ہنسی پر واقعی اُس کی نیند غائب ہونے لگی تھی۔

”دیکھیں مسٹر! فی الحال سونے کا ہرگز ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً ہی سہی بات تو آپ کو مجھ سے کرنی ہی

ہوگی۔ جب تک مجھے نیند نہیں آتی، آپ کو مجھ سے باتیں کرنی ہوں گی۔“ وہ کھل کھلا کر مسکرائی تھی۔ بلال حمید کا

دل تو چاہا کہ دے بھاڑ میں جاؤ تم۔ میں فون بند کر رہا ہوں لیکن نہ وہ فون بند کر سکا نہ ہی کچھ ایسا کہہ سکا۔ اب وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نے تلے لفظوں میں گویا تھا۔

”ایویں ہی تم جیسی فضول لڑکی کے لیے میں اپنی نیند خراب کروں۔“

”آپ مجھے فضول کہہ رہے ہیں۔“ وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی۔

”اور کیا کہوں۔ اے لڑکی تہجد کا ٹائم ہونے والا ہے۔ اس وقت لوگ تہجد پڑھتے ہیں۔ تم کن فضولیات میں پڑی ہوئی ہو۔“

”تو آپ اب تہجد پڑھیں گے۔“ اُس نے پھر سے مذاق اڑایا۔

”تم جیسی عورت ہی نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔“

”مان جائیں پھر آدم زادی کی کارستانیاں۔“

”ہاں ماننا ہوں اللہ پاک عورت کے شر سے بچائے۔“

”واہ جی کیا کہنے آپ جیسے صالح بندوں کے۔“ اس بار بلال حمید مسکرایا۔

”اب میں فون بند کرنے لگا ہوں۔ مجھے زوروں کی نیند آ رہی ہے۔“

”دیکھا میری باتوں نے نیند کی گولی جیسا کام دیا۔“ واقعی اب بلال حمید کو سو جانا چاہیے تھا۔ صبح اُسے فجر کی نماز کے لیے جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ بلال نے فون بند کر دیا تھا۔

فجر کی نماز پڑھ کر وہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھتا۔ صبح کی سپیدی پھوٹنے لگتی تو وہ واپس آتا۔ تیار ہو کر ناشتا کرتا اور اپنی بائیک پر آفس چلا جاتا۔ ملک مصطفیٰ علی نے کئی بار بلال سے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ مجازی میں آفس جایا کرو لیکن اُس نے منع کر دیا تھا۔

”ملک صاحب مجھے آٹھ بجے آفس پہنچنا ہوتا ہے۔ خواہ خواہ کی آپ کو تکلیف دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ آج بھی بائیک چلاتے ہوئے اُس کی دیمک سے کھوکھلی پڑتی سوچیں اُم فروا کے گرد سسکیاں بھر رہی تھیں۔

”اس وقت تو وہ سو رہی ہوگی؟ رات کو اُسے صبح نیند کیسے آتی ہوگی۔ اتنا کچھ اُس کے ساتھ ہو گیا۔ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد شاید وہ سو جاتی ہو۔“ اچانک سے بلال حمید کی نگاہوں میں وہ ارفع و اعلیٰ لمحات سر کے تھے۔ جب اُم فروا نماز پڑھ کر قرآن پاک پڑھتی پھر وہ لاؤنج میں آ کر تمام پردے دونوں اطراف سمیٹ دیتی۔ اس وقت ایک نئی صبح خوشبودار کا منظر کس قدر دہیز ہوتا۔

اُم فروا تھوڑی دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی پرندوں کی بولیاں سنتی۔ اُن کی چھبھاہٹ پر زرب مسکراتی۔ تب آہستہ روی سے چلتی کچن میں آ جاتی۔ اتنی دیر میں بلال حمید بھی نماز پڑھ کر مسجد سے آ جاتا۔ وہ ہال میں آ کر بیٹھ جاتا۔ اُم فروا ٹرے میں دو کپ چائے رکھے بلال حمید کے نزدیک آ جاتی۔ تب وہ کچھ عرصہ بلال حمید کے ساتھ لیصل ٹاؤن والے فلیٹ میں رہی تھی۔ یہ وہیں کی تو یادیں تھیں جو اکثر و بیشتر اس کے خیالوں میں امرت آمیزی لیے میٹھا زہر چھڑکتی رہتی تھیں۔

چائے کے دوران دونوں ڈھیر ساری باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بلال حمید کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جاتی۔ اُس کی باتیں سنتی کچھ اپنی کہتی۔ پھر چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں چلی جاتی۔ آٹھ بجے وہ ناشتا بناتی تھی۔ بلال حمید کو اس کے ہاتھ کے پراٹھے بہت پسند تھے۔ وہ رغبت سے ناشتا کرتے کہتا۔

”فرد تم جیسے پراٹھے دُنیا کی کوئی لڑکی بھی نہیں بنا سکتی۔“ وہ ہنستی، اس کے موتیوں جیسے دانت اس کی دلکشی

میں اور اضافہ کر جاتے۔ وہ کہتی۔

”اتنا بڑا جھوٹ بھی نہ بولیں کہ مجھے شرمندگی ہونے لگے۔“

”ایک تو تم میری بات کا یقین نہیں کرتی ہو۔“ وہ بھی مسکرایا تھا۔

اچانک سے اُس کا ہائیک کا ٹائر ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ، فٹ پاتھ کے ساتھ رگڑ کھا کر ٹکرایا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیچھے سے کوئی تیز رفتار گاڑی نہیں آرہی تھی۔ وہ اُم فروا کے خیال میں اس قدر منہمک تھا کہ اُسے پتا ہی نہ چل سکا جب ہائیک رُکی تو اُسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اچانک سے اُس کی محویت ٹوٹی، سائیکل پر ٹرن لیتے ایک بزرگ نے مسکرا کر بلال حمید کو دیکھا اور مسکرایا۔

”برخوردار دھیان سے چلایا کرو، زندگی بہت قیمتی ہے۔“

”شکریہ سر!“ اس بار بلال حمید جھل ہو کر مسکرایا اور ہائیک سیدھی کرتا آگے بڑھ گیا۔

اُم فروا کے ساتھ بتایا ہر ہر پل اُسے شدتوں سے یاد آتا۔ اُسے اُداس کر دیتا۔ وہ بار بار ذہن سے اُن یادوں کے لمس کھرتا لیکن وہ کسی صورت اُس کے دماغ سے نکل نہ پاتیں۔ بے بسی اُس کے اطراف اُگ آتی۔ اُس کے دماغ کی سیس تن جاتیں اور بلڈ پریشر کی گولیاں پھانکنے سے بھی افاقہ نہ ہوتا۔ پھر آخری حربہ یہی تھا وہ ٹمرین کے فون کا منتظر رہتا۔ جو واقعی بلال حمید کو اذیت ناک گھڑیوں سے نکال لیتی۔ وہ کروٹیں بدلتے ہوئے سونے کی کوشش کرتا تو ٹمرین کا فون آ جاتا۔ ہر وقت ہنستی اُس لڑکی کی چٹکے نما اوٹ پٹانگ باتوں سے بلال حمید بہل جاتا اور اُس کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔

جب بلال حمید خدا حافظ کہہ کر فون بند کرتا تو وہ خود ہی مسکرا پڑتا۔ وہ سوچتا اللہ نے ہی اسے وسیلہ بنا کر بھجوا دیا ہے۔ میں ڈسٹرب ہوں، فروا کی جدائی کسی طور سکون نہیں لینے دے رہی۔ ٹمرین سے بات کر کے طبیعت بہتر ہو جاتی ہے۔ اُس کی باتیں کچھ دیر کے لیے اُم فروا کے خیالوں سے دور لے جاتی ہیں، اُن عذاب لحوں سے فرار پالیتا ہوں۔ پھر مجھے اچھی نیند آ جاتی ہے اور میں سو جاتا ہوں۔

اُس رات بارہ بجے کے بعد ٹمرین کا فون آیا تھا تو بلال حمید اُس سے کہہ رہا تھا۔

”تم ہر رات مجھے فون کرتی ہو۔ جس روز میری بیویوں کو بھٹک پڑ گئی کہ ہمارا شریف قسم کا شوہر کسی غیر عورت سے باتیں کرتا ہے تو وہ دونوں مجھے گولی مار دیں گی۔“

”ٹھیک ہے اپنا انڈرلیس ابھی سے مجھے لکھوادیں۔ ہماری اتنے دنوں کی شناسائی ہے۔ مجھے آپ کے سوئم پر تو لازماً آنا چاہیے۔ کم از کم کھانے کو چنے تو ملیں گے ناں؟“

”ہاں ملیں گے، محلے والوں کو بھی ساتھ لے آنا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں کل ہی سب کو کہہ دوں گی۔“ وہ بمشکل ہنسی روک پائی تھی۔ ”سب آپ کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک ایک سپارہ بھی پڑھ دیں گے۔“ ٹھہر ٹھہر کر طمانیت سے بول رہی تھی، جیسے واقعی یہ سب ہونے والا ہے۔

”پچھلی شکریہ۔“ وہ جل کر بولا۔

”ارے شکریہ کو چھوڑیں کچھ دن آپ کے ساتھ گپ شپ رہی ہے۔ اس کے بدلے آپ کے بلند درجات و مغفرت کے لیے اپنا حصہ بھی ڈال دوں گی۔“

”ویسے تم میری بہت ہمدرد ہو۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔“

”کیا تم میری باتیں مذاق سمجھ رہی ہو؟“

”اور کیا۔“

”لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میرے پانچ بچے ہیں، چھٹے کی آمد آمد ہے۔“

”یعنی دونوں بیویوں سے تین تین بچے۔“ اب وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔

”دونوں میں برابر عدل رکھتا ہوں۔ میں نے ابھی دو شادیاں اور کرنی ہیں۔“

”صرف دو یا دو سے زیادہ؟“ وہ کھی کھی کر کے ہنس رہی تھی۔ ہونٹوں کو بار بار ایک دوسرے میں دبا رہے ہنسی

روکنے کی کوشش بھی کرتی۔ لیکن ایک فلک شکاف قہقہہ اُس کے ہونٹوں سے برآمد ہوتا۔ وہ ہنستی بہت تھی، بات

بات پر قہقہے لگاتی، ہنستے ہنستے وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اُس کی شرتی آنکھیں پانی سے بھر جاتیں۔

بلال حمید اس کی باتیں سن کر فریٹش ہو جاتا۔ دونوں کے پاس وقت گزاری کا اچھا ذریعہ تھا۔

”صرف دو اور کروں گا۔“

”ٹھیک ہے اب آپ قنات تیسری شادی کر لیں کیونکہ چوتھی اور آخری شادی آپ کو مجھ سے کرنی ہوگی۔“

”تم سے میں شادی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں بھی؟“ وہ چیخی۔

”تم بہت لڑا کا ہو۔“

”پر اس تم سے نہیں لڑوں گی۔“ وہ تم پر اتر آئی تھی۔

”اچھا سوچوں گا۔ پہلے تیسری تو کر لینے دو۔“

”تو پھر جلدی کرو ناں۔“

”تمہیں کافی انتظار کرنا پڑے گا۔“

”کر لوں گی۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔

”ہاں سنو! تمہاری بیویوں اور بچوں کی کبھی آواز نہیں آئی۔“

”وہ دونوں الگ الگ کمروں میں ہوتی ہیں۔“

”کیوں؟“

”کسی ایک کے بیڈروم میں سوؤں گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔“

”واہ تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔“

”یار کہاں کمال کا آدمی ہوں۔ وہ دونوں ہر وقت مجھ پر شک کرتی ہیں کہ میرا کسی تیسری عورت سے چکر ہے۔“

”تو تم انہیں بتا دو، بات کلیئر کرو کہ تیسری سے نہیں چوٹھی سے چکر ہے۔ تیسری نے تو ابھی درمیان میں آنا ہے۔“

”تم مجھے اچھے مشورے دے رہی ہو۔ اُن دونوں نے پہلے ہی میرا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔ تیسری چوٹھی کا

بتا دوں تو تمہیں صرف میرے چیتھڑے ہی ملیں گے۔“ بلال حمید کے کہنے پر وہ پھر ہنسی۔

”سنو ٹمہیں تمہاری ہنسی بہت خوبصورت ہے۔ یقیناً تم خود بھی اپسرا ہوگی۔“ بلال حمید بھی وقتی دل لگی کرنے

سے باز نہیں آ رہا تھا۔

”بلال تمہاری ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ بندی اتنی بھی خوبصورت نہیں ہے۔ بس ایویں ہی ہے۔“

”اچھا اب مجھے سونے دو صبح آفس بھی جانا ہے۔“

”بائے داوے تم کرتے کیا ہو۔“

”جواب کرتا ہوں۔“

”وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ آفس جاتے ہو تو جواب کے لیے ہی جاتے ہو۔ پر کہاں جواب کرتے ہو؟“

”لاہور ہی میں۔“

”کس ادارے میں؟“ وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

”تم نے پہلے ہی انٹرویو شروع کر دیا۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔“

”بلال پلیز پلیز میری بات سنو۔“

”بولو۔“

”ابھی فون بند مت کرنا۔“

”کیوں بھئی؟“ وہ پیزاری سے بولا۔ واقعی بلال حمید کو سخت غیند آ رہی تھی۔

”کیونکہ مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

”تمرین تم اب کسی اور کانسرٹرائی کرو۔“ وہ جھنجلاہٹ پر قابو پا کر گویا ہوا۔

”تو تم دل جلانے والی باتیں بھی کر لیتے ہو۔“ وہ آواز میں شکوہ سموئے بولی وہ اچانک سنجیدہ ہو چکی تھی۔

حالانکہ وہ کبھی بھی بلال حمید کی باتوں کا برا نہیں مناتی تھی۔

”اچھا میں فون بند کرنے لگا ہوں۔“ واقعی اُسے افسوس ہوا تھا تمرین کو اس طرح کہنا۔

”کہیں میری دوسری بیوی اچانک کمرے میں نہ آ جائے۔ دراصل ایک ہفتہ سے ہماری ناراضگی چل رہی ہے۔

ہم دونوں ہفتے سے زیادہ ناراض رہ نہیں سکتے۔ وہ آج کل مجھے منانے کے چکر میں ہے، میٹھی میٹھی محبت پاش نظروں

سے مجھے آتے جاتے گھورتی رہتی ہے۔ کبھی پاس سے گزرتے ہوئے ٹھوکا بھی مار جاتی ہے۔“ تمرین مسکرائی۔

”بلال پھر تم کیا کرتے ہو؟“

”میں جھینپ کر خجل ہو جاتا ہوں۔“

”جب صلح ہو جائے گی تو وہ تمہارے روم میں آ جائے گی؟“ ”نہیں۔“

”واہ پھر تو مزے ہیں یعنی مابہ دولت یونہی رات گئے تم سے باتیں کرتے رہیں گے۔“ بلال حمید مسکرایا اور

فون بند کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اگر وہ تمرین سے گپ شپ نہ لگاتا تو تمام رات اُم فروا کے

خیالوں سے بچ نہ پاتا۔ تمرین کی کھنکٹی آواز میں مکمل زندگی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہتی تھی۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے

اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ مئی میں ملاحظہ کیجیے)

گزر بھر کفن

شروع شروع میں تو آیا ایسی لہبرانی کہ کام چھوڑ کر بھاگنے کو تیار ہو گئی تھی مگر پھر وہ رکی! اور تب اس نے سوچا۔ ساٹھ روپے مہینے میں اس کے گھر کا راشن آجائے گا۔ بچے پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔ اگر وہ اس کتے کی نوکری چھوڑ دے گی تو پھر.....

سفید کفن پر آنسوؤں کے پھول سجاتی ایک یادگار کتھا

سانو نے بڑے درد کرب کے ساتھ ایک بار پھر اپنا آچل اٹھا کر گود میں اپنی مردہ بچی کو دیکھا اور



بلبلہا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

”ہائے! سہجادی بیٹی اب اپنا کٹورا لے کے بھات کون مانگے گا۔؟“ گھنٹوں سے بانو کی گود میں اس کی ڈھائی برس کی بیٹی شہزادی مُردہ پڑی تھی اور بانو کی برص والی چتکبری ساس اس وقت بھی جلی بھنی ہوئی سی قریب ہی بیٹھی تھوڑی تھوڑی دیر پر سا دینے والی کسی عورت کے آگے اپنے دل کا پھپھولا پھوڑے چلی جا رہی تھی۔

”ارے! اب ابی اللہ کا مار پیسے نہ کی رات بھر سے میت گھر میں پڑی ہے اور! گور بھن کا کوئی ٹھکانا۔“ ہر بار بانو یہ سن کر تلملا جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ دیوار سے اپنا سر اتنی زور سے ٹکرائے کہ پھر وہ اپنی منحوس زندگی کی دوبارہ سانس نہ لے سکے۔

شہزادی جب زندہ تھی تب بھی اس کو کبھی چین سے کھانا نہ ملتا تھا اور اب جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تو اس کے لیے گز بھر کفن کے پیسے بھی نہیں مل رہے تھے۔

بانو کی تقدیر کسی رات کی تاریکی میں بنی تھی جو کبھی اس کو سکھ کی سانس نصیب نہ ہوئی۔ شادی سے پہلے ساری لڑکیوں کی طرح اس نے بھی اپنی معصوم آنکھوں میں کچھ سینے سجائے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اتنے سارے بھائی بہنوں کے ساتھ دکھیارے ماں باپ کے گھر میں آرام کہاں سے ملے گا۔ پھر بھی وہ بڑے پیار و محبت اور سکون سے اپنی بھوکوں اور سارے دکھوں کو بانٹ لیا کرتے تھے۔

جس دن کھانا گھر میں نہیں پکتا، ماں کی چڑچڑاہٹیں بڑھ جاتی تھیں مگر اس کے غمزدہ چہرے پر پیار و محبت کی دنیا بسی نظر آتی تھی۔ چولہا بجھا رہتا مگر وہ بڑے لاڈ و پیار سے اپنے بچوں کو نہلاتی، مٹی رگڑ رگڑ کر ان کے بالوں کو دھوئی، کٹکھی کرتی، پھر تازہ پیوند کپڑے اس شوق سے پہناتی جیسے آج گھر میں

کوئی تقریب ہو رہی ہو۔ بڑی ہو کر اس نے سمجھا تھا کہ ماں اس طرح سے اپنے دکھوں کو بھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر کبھی مکئی اور کبھی چنے کے بھنے ہوئے تھوڑے تھوڑے دانے پا کر وہ اپنے سارے بھائی بہنوں کے ساتھ کیسی نہال نہال ہو جاتی تھی؟

لال رنگ کی نئی کوردار ساڑی پہن کر جب وہ اپنے نئے گھر کی طرف نئی زندگی سنوارنے چلی تو پرانی زندگی کے دہلیز سے باہر قدم دھرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اُس کے پاؤں تھر تھرا اُٹھے تھے۔ کیا پتا کہ اس ٹوٹے ہوئے چوکھٹ سے نکل کر جب وہ دوسرے گھر میں جائے گی تو وہ زندگی کیسی ہوگی؟ راستے میں پیچی نگاہوں کے ہوتے ہوئے بھی جب اس نے اپنے جیون ساھی کو دیکھا تو اس کا جی دھک سے رہ گیا۔ یہ اُس کا شوہر تھا؟ جو نخریلی عورتوں کی طرح لچک لچک کر اور ہاتھوں کو چپکا چپکا کر باتیں کر رہا تھا؟ اُس کے سارے انداز عورتوں جیسے تھے کہیں سے بھی مدانے پن کی کوئی جھلک اس میں نہ تھی ایک بڑی غمزدہ سی لمبی سانس لے کر بانو نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ماں! ایسے نچنیاں جیسے مرد سے بیاہنے سے کہیں بہتر تھا کہ تم مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دیتیں۔ ہائے! اس کے خوابوں کی کیسی گھناؤنی تعبیر اس کے سامنے تھی۔“

بانو جس گھر میں بیاہ کر آئی وہ ایک حج صاحب کے سرونٹ کوارٹر کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کے سامنے بہت ہی چھوٹا سا ایک برآمدہ تھا اسی برآمدے میں ایک طرف چولہا تھا اور جب سے بانو بیاہ کر آئی تو چتکبری ساس اپنی چٹائی بھی اسی جگہ بچھا کر سونے لگی تھی۔ بڑھیا کو ٹھک ٹھک چال چلنے والے بیٹے کے بیاہنے کا بڑا ارمان تو تھا مگر برآمدے میں چٹائی پر پڑی پڑی بڑھیا کو ٹھری کے بند دروازے کو دیکھتے ہی ہزاروں صلواتیں سناتی رہتی۔ اس کی

زبان گز بھر بسی تھی۔ احاطے میں سروٹ کوارٹر کے سارے ملازم چڑیل جیسی ڈھیا کی گندی زبان سے عاجز آچکے تھے۔ احاطے کی عورتوں نے بانو کی صورت کو بہت سراہا تھا۔ کھلتا ہوا صاف سنہرا رنگ، تیکھا نقشہ، کٹوراسی آنکھیں اور بڑا اچھا نکلتا ہوا قد، پھر اس پر سے چھریا بدن۔ پہلی بار جب عورتوں نے بہو کا منہ دیکھا تو سب ہی نے بڑھیا سے کہا تھا۔ بواجی! بہو تو کھوب لائی ہو جیسے اتنی بڑی کوٹھری میں رانی کا روپ آگیا ہو۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ بانو کے شرمیلے لبوں پر بھی آئی تھی اس کو یاد آگیا کہ ماں کو جب بھی اس پر پیار آتا تھا تو وہ اسے رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

مگر اب تو یہ چتکبری بڑھیا اس کے جنم اور کرم پر تھوک رہی تھی اور وہ گھبرائی گھبرائی سی اپنے میلے آنچل میں سمٹی جاتی تھی۔ شادی کے بعد بس تھوڑے ہی دنوں تک چولہا جلاتا تھا۔ گھڑی گھڑی بانو کا میاں بیچ صاحب کے گھر کے کسی نہ کسی ملازم سے جھگڑا کر کے اپنی کوٹھری والے گھر میں بیٹھ رہتا۔ ماں اس کو کھانے کو دوڑتی کبھی جھاڑو اور کبھی بیلن پھینک کر مارتی مگر وہ ہاتھ نہ چانچا کر ہر کسی سے جھگڑنے لگتا تھا ماں کا غصہ وہ ہمیشہ دوسروں پر اتارنے کا عادی بن چکا تھا۔ غصیلی ساس کے ڈر سے بانو نے کبھی آنکھ اٹھانے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ بڑھیا کی آنکھوں میں بہو کی صورت بڑی طرح کھٹکنے لگی۔ کوٹھری کی قید سے گھبرا کر اگر اس نے ذرا کھل کر سانس لینی چاہی تو ساس کے کلیجے پر آ رہے چل جاتے تھے۔ پھر جیسے ہی اس کا جھگڑالو بیٹا کسی نہ کسی سے پٹ کر آتا بڑھیا کھڑی ہو کر بہو کو پٹوانے لگتی۔ خالی پیٹ رنے کی تو وہ بچپن سے عادی تھی مگر یہ لکڑی چیل جوتے کی مار اس کے لیے ایک نئی مصیبت بن گئی تھی۔ اس کا میاں جتنا کمر لپکا کر نزاکت بھری چال سے چلا کرتا تھا اتنا ہی بیوی

کو مارتے وقت وہ ایک بھر پور ظالم مرد بن جاتا تھا۔ ماں کے سامنے اس کی زبان بند رہتی۔ بیس روپے مہینے میں بڑی طاقت تھی جو ہر تین مہینوں کے بعد اس کی چتکبری ماں کو سرکاری خزانے سے سیاہی کی بیوہ کی پنشن کہہ کر ملا کرتی تھی اور یہی بڑھیا کی جادو کی چھتری تھی جس سے اس کا نکھو بیٹا ہر گھڑی ڈرتا رہتا تھا۔ ہر تین مہینے پر گھر میں راشن آتا بڑے آب و تاب سے گےہوں دھو کر سکھائے جاتے چولہے پر رونق آ جاتی اور بڑھیا چند دنوں تک ذرا اکڑی اکڑی سی پھرتی۔ پھر دھیرے دھیرے جیسے پھولے اور لہراتے ہوئے بیلوں سے ہوا نکلتی لگتی ہے۔ اسی طرح چولہے کا دھواں بھی مدھم پڑتا چلا جاتا تھا۔

دن رات کے ایسے ہی اُلٹے سیدھے چکر چلتے رہتے۔ بانو اپنے پچھڑے ہوئے گھر والوں کو یاد کر کے چپکے چپکے رو لیتی مگر اس کی ہمت کبھی نہ ہوتی کہ چند دنوں کے لیے بھی اپنے ماں باپ کو دیکھ آئے۔

بڑھیا کی ٹانگیں دابے دابے بانو کی انگلیں اور ہاتھوں میں ہر گھڑی درد رہنے لگا تھا۔ اس پر سے چتکبری ساس کبھی بہو کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ جب نہ تب وہی گالیاں اور وہی صلواتیں اس کے نصیب میں تھیں۔ ڈری سہمی ہوئی بانو جتنی خدمت گزاری میں جٹی ہوئی رہتی بڑھیا اتنا ہی شیرنی کی طرح ڈکرتی چلی جاتی تھی۔

ماں کی گود میں مردہ بچی اکڑی ہوئی پڑی تھی۔ بانو کے پھٹے آنچل سے بچی کے الجھے ہوئے سنہرے بال نظر آ رہے تھے۔ نکھیاں ہر طرف سے بھنبھناتی چلی آتی تھیں مگر ایک پر سادینے والی عورت دیر سے مردہ بچی پر پنکھا جھلتی چلی جا رہی تھی۔ بانو کی آنکھیں روتے روتے سو ج گئی تھیں اس کو یاد آ رہا تھا کہ بچی جب پیٹ میں تھی تو کیسی کیسی مار اس پر پڑتی رہتی تھی۔ بھوک سے نڈھال اور مار کے زخموں سے چور اس وقت بھی اس کی ماما اپنے ہونے والے بچے کو

چوٹ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی تھی اور جب سنہرے بالوں والی بچی پیدا ہوئی تو بہت کمزور تھی۔ بڑھیا ساس نے تو اسی وقت منہ بنا کر کہا تھا۔ ”ہائے ای جنم جلی گلوڑی کا ہے کو آئی ہے۔“ مگر بانو کے میاں نے جب اپنی خوب صورت سی کمزور بیٹی کو دیکھا تو بہت دیر تک اس کو اپنی گود میں لیے پیار کرتا رہا تھا۔ اب اس گھر میں ایک بچی کا تھوڑا سا خرچ اور بڑھ گیا تھا۔ حالات کی بے ترتیبی اپنی جگہ پر تھی۔ بھوکی ماں بچی کا پیٹ کیا بھر سکتی تھی۔ اسی حال میں بانو کی سوکھی ماری بچی بڑھتی گئی۔ بانو کے میاں نے بڑے لاڈ سے بچی کا نام شہزادی رکھا تھا۔ بڑھیا کی گالیوں کا خرچہ چلتا رہتا اور اس کے بیٹے کی مار دھاڑ اپنی جگہ پر رہتی بانو کی سسکیوں، ہچکیوں اور کراہوں کے درمیان شہزادی لڑکھڑاتی ہوئی چال سے چلتی ہوئی ماں کے پاس آ کر کہتی۔

”ماں بھات دے“ ہر گھڑی اس کے ہاتھ میں ایک المونیم کا پیالہ رہتا تھا۔ جو اس کا کھلونا بھی تھا۔ پانی پینے کا گلاس بھی وہی تھا اور اُسی پیالے کو ماں کے آگے پھیلا کر وہ بڑی معصومیت سے کہتی۔ ”ماں بھات دے“ اب تک بس یہی اتنی سی بات اس نے سیکھی تھی۔ کبھی کبھی بانو کی آنکھیں اس وقت بھیگ جاتیں جب اس کا چولہا تھنڈا پڑا رہتا تب وہ سلیمان دھوبی کی بیوی سے دونوں بھات مانگ کر لے آتی۔ بانو کی آنکھوں سے سادون کی جھڑی لگ گئی۔ پھر اس کی نگاہوں میں لیڈی ڈاکٹر مائر کی کوٹھی جھلک پڑی۔ لیڈی ڈاکٹر کی دوست پائر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی چڑچڑی سی سوکھی ماری بڑھیا کسی کو کوٹھی میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ دیتی تھی مگر لیڈی ڈاکٹر خانساں ماں رشید ایک فرشتہ انسان تھا جو بچا کھچا ہوا کھانا چھپ چھپا کے چتکبری بڑھیا کو دے آتا تھا۔

ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے سڑے گلے آم امردو

اور کبھی کبھار جو رشید کی طبیعت اچھی نہ رہتی تو وہ اپنا کھانا بھی انہیں دے جاتا تھا پھر وہ دیر تک اپنی کوٹھی کا حال سناتا رہتا۔ بڑھیا پائر سے اس کی کبھی نہیں بنتی تھی اور ڈاکٹر بچاری کو اتنی فرصت کہاں تھی جو ان سارے بکھیروں میں پڑتی سارا دن ہوسپتال میں پھر شام سے بارہ بجے رات تک گھر پر مریضوں کا میلا سا لگا رہتا۔

مگر سوکھی ماری بڑھیا پائر رشید پر ایک مستقل عذاب تھی جہاں بڑھیا کے اپنے اتنے نخرے تھے۔ وہاں سب سے بڑی مصیبت پائر کا چہیتا کتا تھا۔ کتے کے لیے کولڈش پکنا، آئرش اسٹوڈ بننے قسم قسم کے وٹامن بھرے ڈبے کے کھانے دیئے جاتے اور ہر ہفتہ اس کا ویت لیا جاتا تھا۔ بڑھیا کا کتا بھی اسی کی طرح نخریلا تھا۔ وہ ایک طرح کا کھانا کبھی دو وقت نہیں کھایا کرتا۔ اس کو دورائی چاہیے تھی اور کتے کی یہ ساری مزاج داری بڑھیا پائر کے لاڈ اور پیار کے وجہ سے تھی۔ رشید بچارا پانچوں وقت کا نمازی ہر گھڑی سر پر ٹوپی پہنے رہنے والا پرہیزگار آدمی وہ کتے کے نخرے کو کیا جانے۔ اس پر سے پائر نے لاکھ سرٹیکا کہ کسی طرح رشید اس کے کتے کو صبح شام ٹہلا کر لے آیا کرے مگر رشید نے ایک نہ مانی اس نے صاف طور پر انکار کر دی کہ اس بچس جانور کے قریب بھی وہ نہیں جائے گا۔ چاہے نوکری رہے یا جائے۔“ تب آخر تھک ہار کر پائر نے اپنے چہیتے کے لیے ساٹھ روپے مہینے پر ایک آیا رکھ لیا تھا۔ شروع شروع میں کتے کی زنجیر تھامتے ہوئے آیا تھر تھراتھتی تھی۔ کتے کے بچے نے غرا کے بھونکا اور وہ ٹپ کر آنگن میں بھاگی مگر رفتہ رفتہ پائر نے پیار ڈولا کر کے کتے کو آیا سے ہلا ملا دیا تھا۔ کتے کا سارا کام آیا کے سپرد تھا مگر نہلانے دھلانے کے کام پر ایک الگ سے جمعدار تھا آیا صبح اور شام کتے کی زنجیر تھامے اس کو ٹہلانے ٹھانے نکلتی تھی اور ادھر محلے کے سارے بچے

کیا خدا نے آپ کو حسن کی دولت

سے نوازا ہے؟
کیا آپ کو
لیباس

پہننے کا سلیقہ آتا ہے؟
تو پھر آپ

کاپڑے
دو سیرہ

کے سرورق کی زینت کیوں نہ بنیں؟؟
آج ہی ہمارے فوٹو گرافر سے رابطہ قائم کیجیے۔

021-35893121-22

88-C II خیابان جامی فیر 7، انٹرنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

اپنے دونوں ہاتھوں میں لکڑی کے ٹکڑے لیے ایک
دوسرے پر مارتے ہوئے ایک ساتھ چلاتے رہتے۔
”کتے کی آیا کتے کی آیا۔“

”یہ دیکھو جی! کتے کی آیا کتے کی آیا۔“

شروع شروع میں تو آیا ایسی گھبرائی کہ کام چھوڑ
کر بھاگنے کو تیار ہو گئی تھی مگر پھر وہ رکی! اور تب اس
نے سوچا۔ ساٹھ روپے مہینے میں اس کے گھر کا راشن
آجائے گا۔ بچے پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔ اگر وہ
اس کتے کی نوکری چھوڑ دے گی تو پھر ساٹھ پیسے
کمانے کی بھی امید نہ رہے گی۔ بچوں کا کیا ہے شور
کرتے کرتے خود ہی چپ ہو جائیں گے۔“

اس پوری کوٹھی اور اس کے احاطے کے کونے کونے
تک پائر کی حکومت تھی اور اس کے ساتھ اس کا کتا دنداتا
پھرتا تھا۔ ”ہونہ! سالی! کتا لیے پھرتی ہے۔ آدمی کا بچہ گھر
میں جھانکے نہیں مگر سالا ای نجس کتا چاہے جس بچھونے پر
چڑھے جس کرسی پر بیٹھے جس گدے پر کودتا پھرے سب کا
سب اس کے باپ کا ہے۔“

رشید کو پائر سے اسی دن سے نفرت ہو گئی تھی
جس روز اس نے سنا تھا کہ ڈاکٹر بے چاری اپنی پسند
کی شادی کر رہی تھی مگر اسی بڑھی گھوڑی نے رُودھو کر
اس کی شادی رکوا دی تھی۔

اور اب اس دوران گھر میں بڑھیا ایک کتے کے
بچے کی رونق لیے پھر رہی تھی۔

بانو نے کتے کے اس موٹے تازے بچے کو کئی بار
دیکھا تھا چکنا پھر تیرا کتا پائر میم صاحب کے ساتھ بھی
اور آپا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے بھی۔ پھر اس کو یاد آیا کہ
ایک دن رشید نے اس کی بیٹی شہزادی کو اپنی ڈاکٹر مار
سے دکھلا دیا تھا۔ بغیر فیس لیے ڈاکٹر نے بہت اچھی
طرح سے اس بچی کو دیکھا تھا۔ ہڈیوں کی ڈھانچہ اس
بچی میں تھا ہی کیا سوکھے سوکھے بارے چمڑے کے۔
ڈاکٹر نے بہت سی دوائیں لکھیں، انجکشن لیتے رہنے کی

تاکید کی اور بتایا کہ کھانا نہیں ملنے کی وجہ سے یہ بچی اس حال تک پہنچ گئی ہے اس کو آہستہ آہستہ بہت اچھی غذا دینی چاہیے دودھ انڈا اور پھلوں کا رس دینا بے حد ضروری ہے۔" مائر نے اپنی الماری میں سے سپل کی کچھ دوائیں بھی رشید کے ہاتھ میں تھادی تھیں اور رشید کے چہرے پر ایک طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جب نجس کتے کو لڈش اور ارش اسٹو کے ساتھ سیروں دودھ پیتے اور کلبھی کے ٹکڑے کھانے لگتے ہیں۔ تب انسان کا بچہ بھوک سے مرنے لگ جاتا ہے۔" مگر چند ہی مہینوں میں گھڑی دیکھ کر انگلش کھانا کھانے والا کتے کا بچہ اچانک بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں اور مزاج پرسی کرنے والوں کی کئی گاڑیاں مائر کے گیٹ پر لگی رہیں۔ بڑھیا پائر کتے کے بچے کی بیماری کے غم سے نڈھال اور دیوالی ہوئی جارہی تھی۔ ڈاکٹر مائر نے بھی ہسپتال سے کئی دنوں کی چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ ڈاکٹر مائر اور بڑھیا پائر پر تو جیسے غموں کی بجلیاں سی گر پڑی تھیں۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئیں۔ بس اسی دن ان کے گھر کا گیٹ ہر کسی کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مائر اور بڑھیا پائر نے جانے پہچانے ہوئے گھروں میں فون کے ذریعے یہ پیغام بھیج دیا تھا کہ اگر "آپ چاہیں تو ان کے گھر کے اس ٹکڑے کا آخری دیدار کر لیں۔" ملنے ملانے والے اور ضرورت مند لوگ اس دل خراش پیغام کو سن کر کیسے نہ آتے؟ آنے والوں کا ایک تاننا بندھا ہوا تھا۔ اسی دن اپنی ساس کے ساتھ بانو بھی حیرت سے یہ دیکھنے آئی تھی کہ کتے کا ماتم کیسا ہوتا ہے۔ نواری کی چھوٹی سی پٹنگزی پر ڈنلپ کے گدے کے اوپر ریشمی چادر سے ڈھنکی کتے کی لاش دھری تھی جس کے سر ہانے جمع دان میں موسم بتیاں جل رہی تھیں۔ گھر کی خاموشی اور افسردہ فضا میں ڈاکٹر اور بڑھیا پائر کی ہچکیوں اور سسکیوں کی لہریں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔ انہی آنسوؤں آہوں اور کراہوں کے درمیان کتے کی

پٹنگزی سے لگی مٹھی آیا زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔ غم سے اُس کا چہرہ پپلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں فکر سے گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھیں اور ایک کنارے افسردہ چہرے بنائے ایک درزی مشین پر تیز تیز پیر چلاتا ہوا سفید چمکیلے ساٹن سے کتے کا کفن سی رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا تابوت رکھا ہوا تھا۔ کفن کے اوپر ڈھانکنے والی چار ہلکے نیلے رنگ کی جاپانی نیلون کی تھی جس کے چاروں طرف اسی رنگ کا لیس درزی نے ابھی لگا دیا تھا۔ بڑھیا پائر تو غم میں حال سے بے حال ہوئی جارہی تھی مگر اتنے پر سادینے والوں کے سامنے ڈاکٹر مائر نے اپنے آپ کو کچھ سنبھال رکھا تھا۔ تابوت اور کفن سب تیار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے بڑے پیار سے مردہ پلے کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا پھر اس کو گود میں لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اُسے جھلملاتا ہوا ساٹن کا کفن پہنانے لگی۔ ڈاکٹر کی کئی دوستوں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنی چاہی مگر اپنے پیارے کتے کی یہ آخری خدمت وہ اپنے ہاتھوں سے انجام دینا چاہتی تھی۔ آخری آرام گاہ گدے دار تابوت میں جب کتے کے اس مردہ بچے کو سلا دیا گیا تو نیلون کی خوب صورت چادر سے ڈھانک دینے کے بعد بھی اس کا چہرہ جھٹک رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے کئی تصویریں جب اتار لیں تب بڑھیا پائر اور ڈاکٹر مائر نے اپنے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ مردہ کتے کے بچے کو جھک کر بڑی حسرتوں سے آخری بار پیار کیا تھا اور پھر تابوت میں کاٹیاں ٹھوکی جانے لگی تھیں۔

ڈاکٹر مائر کا ٹرانسفر ہو چکا تھا مگر اس کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹی سی قبر پر ابھی تک یہ لکھا ہوا رہ گیا ہے۔

"ہماری محبتوں کا چراغ اس اندھیرے میں بجھا ہوا ہے۔" بانو ایک بار کی چیخ ماری۔ "ہائے رے میری سہادی مٹی! تو رے ایک کج کھن بھی نہ ملا۔"

☆☆☆

دوشیزہ میگزین

رنگِ کائنات

دوشیزہ گلستاں

نئے نئے لہجے، نئی آوازیں

یہ ہوئی نابات

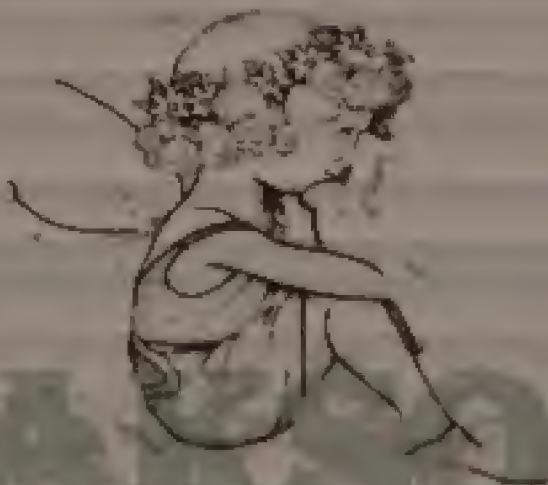
لولی وُڈ، بولی وُڈ

نفسیاتی الجھنیں اور اُن کا حل

کچن کارنر

حکیم جی!

بیوٹی گائیڈ



حکایت سعدی

تو کل سیکھنا ہے تو پرندوں سے سیکھو کہ وہ جب وہ شام کو گھر جاتے ہیں تو ان کی چونچ میں کل کے لیے کوئی دان نہیں ہوتا۔

حسن انتخاب: معصومہ رضا۔ گلستان جوہر، کراچی

فوری ضرورت ہے

☆ خون کی نہیں، صرف ایک الیکٹریشن کی، جو دوبارہ کرنٹ دوڑا سکے، ان لوگوں کے درمیان جو لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

☆ ایک (Optician) عینک ساز کی جو لوگوں کا آؤٹ لک تبدیل کر سکے۔

☆ ایک آرٹسٹ کی جو ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بنا سکے۔

☆ ایک تعمیراتی ورکر کی۔ جو پل بنا سکے، پڑوسیوں کے درمیان۔

☆ ایک مالی کی جو اچھی سوچ کاشت کر سکے۔

☆ ایک استاد کی جو دل سے پڑھا سکے۔

☆ ایک ریاضی دان کی جو ہم سب کو سکھا سکے کہ کس طرح ہم خوشیوں کو بانٹ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگیوں میں۔

مرسلہ: راشدہ اعجاز۔ کراچی

یقین کامل

ماں نے ایک پل کر اس کرتے ہوئے اپنے

فرمان الہی

اور تم لوگ جہاں سے نکلو (نماز کے لیے) اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔ اور بے شک وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ سے بے خبر نہیں۔ اور تم جہاں سے نکلو مسجد حرام کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو اور مسلمانوں تم جہاں ہوا کرو اسی (مسجد) کی طرف رخ کیا کرو (یہ تاکید) اس لیے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم لوگوں کو کسی طرح کا الزام نہ دے سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں گے) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا تاکہ میں تم کو ایسی نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

سورۃ البقرہ: 2 آیات 149 تا 150

حدیث نبویؐ

حضرت نوفل رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ کے ایک بازار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک نماز ایسی ہے اگر وہ کسی سے فوت ہو جائے تو گویا اس کے اہل خانہ اور مال و دولت تباہ ہو گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے وہ نماز عصر ہے۔

مسند: احمد بن حنبل

بچے سے کہا۔

”میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔“

بچہ بولا۔ ”نہیں ماں آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں۔“

ماں نے کہا۔ ”اس میں کیا فرق ہے۔“

اگر میں نے آپ کا ہاتھ پکڑا تو شاید میں مشکل

میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں۔

لیکن اگر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے یقین

ہے، آپ میرا ہاتھ کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑیں

گی۔“ بچے نے سادگی سے جواب دیا۔

مرسلہ: فرح عالم۔ اسلام آباد

سخت جان

گداگر نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو

خاتون خانہ باہر نکلیں۔ فقیر کو دیکھ کر وہ ذہن پر زور

دیتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے تمہیں پچھلے سال بھی

کھانا دیا تھا۔“

فقیر نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”آپ نے

بالکل ٹھیک پہچانا بیگم صاحبہ! دراصل آپ نے مجھ

اکیلے کو کھانا نہیں دیا تھا۔ ہم تین فقیر اکٹھے آئے تھے

۔ آپ نے ہم تینوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اتفاق سے ان

میں سے صرف میں ہی زندہ بچا ہوں۔“

مرسلہ: عارش۔ لاہور

میرا دل یہ کہتا ہے

جو فاصلے دلوں میں ہوں

تو رابطوں کا کیا کرنا

سلسلوں کا کیا کہنا،

میرا دل کہتا ہے

رابطوں کو جوڑو تم

فاصلے مٹا دو

سلسلوں کو توڑو.....

الفتوں کی برکھا ہو

جس میں بھیگ جائیں سب

پیار سیکھ جائیں سب

شاعرہ: شگفتہ شفیق۔ انتخاب۔ صبوحی کاظمی

سادگی پہ تیرے.....

سردار اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لینے گیا۔

لڑکی والے: ابھی تو ہماری بیٹی پڑھ رہی ہے۔

سردار: چلو کوئی بات نہیں ہم ایک گھنٹے بعد پھر

آجائیں گے۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

جیسے کوتیسا

بیوی: جب میں تم پر غصہ کرتی ہوں تم اپنا غصہ

کہاں نکالتے ہو۔

شوہر: ٹو املیٹ صاف کر کے۔

بیوی: (ہنس کر) کیسے صاف کرتے ہو۔

شوہر (اطمینان سے) تمہارے ٹوتھ برش سے۔

مرسلہ: حیات نور۔ لاہور

حقیقت

ہم جب بھی موت یا قبرستان کا ذکر کرتے ڈاکٹر

اشفاق حسین ہمیں روک کر کہتے۔ ”نہیں دوستو! بری

بات تم زندہ ہو۔ صرف زندگی کی بات کرو۔“

لیکن ہم میں سے کوئی انہیں ٹوک کر کہتا۔ ”ڈاکٹر

صاحب موت سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

”وہ کہتے پر دوستو! زندگی اس سے بھی بڑی حقیقت

ہے۔ وہ لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں جو چمکتی دوپہر

میں رات کے اندیشے سے کانپتے رہتے ہیں۔

مرسلہ: افشاں رضا۔ اسلام آباد

غزل

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں

سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں

بات نیت کی ہے صرف ورنہ

وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں

”میں مغزرت گواہوں کے ساتھ جاتی تھی۔“
لجابت میں کہا ”ابوں نے انہیں سزا دیا تھا۔ ان
کے انداز سے میں سمجھا یہ وہ آپ کی بیوی تھی۔“
”وہ میری بیوی ہی تھی۔“ انہوں نے آنکھوں سے
کہا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔“

مرسلہ: نازان۔ کوثری

پہلا اصول

ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے منیجر نے ایک
سیلز مین کو آفس میں بلا کر ان کی بات کرتے ہوئے
کہا۔ ”میں یہاں بیٹھ رہا ہوں۔ یہاں ہاتھ دھو کر آئیے۔“
ساتھ لڑ رہے تھے۔ ”میں تو کاندھوں کا پہلا اصول
ہی معلوم نہیں کہ گاہک کی یہی بات کی جانی چاہیے
کرتے۔ وہ جو بات کہتے ہیں وہ آپ میں سنی کہی
چاہیے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ انہوں نے
بعد اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”یہ وہ
گاہک کہہ کیا رہا تھا؟“

سیلز مین نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”سرا وہ کہہ
رہا تھا تمہارے منیجر سے بنا گدھا میں نے آج تک
نہیں دیکھا۔“

مرسلہ: شاہینہ۔ نذیر آدم

امید اور انتظار

امید، زندگی کا کنکر ہے۔ اس کا سہارا چھوڑ
دینے سے انسانی کشتی گہرے پانی میں ڈوب جاتی
ہے۔ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی امید میں جی رہا ہے۔
ہر آنے والے دن سے بے شمار لوگوں کی لا تعداد
امیدیں وابستہ ہوتی ہیں مگر وہ دن تمام لوگوں کی
امیدیں کب پوری کرتا ہے؟

پھر ایک نئے دن کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اور
اس طرح زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ کسی نے سچ
ہی تو کہا ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

مرسلہ: نور العین۔ چک شہزاد

بھول جاتے ہیں مت برا کہنا
لوگ پتلے خطا کے ہوتے ہیں
وہ جو بظاہر کچھ نہیں لگتے
ان سے رشتے بلا کہ ہوتے ہیں
وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیض
جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں

انتخاب۔ ندیا مسعود۔ کراچی

اے ماں

ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ
میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے موت کا فرشتہ کھڑا تھا میں
نے گھبرا کر پوچھا کہ یہاں کیسے۔

ملک الموت نے کہا۔ تیری ماں کو لینے
آیا ہوں۔ ”میں ایک دم گھبرا گیا۔ آنکھ نم ہو گئی میں
نے کہا سودا کرتے ہیں۔ مجھے لے جاؤ میری ماں کی
زندگی بخش دو۔“ وہ مسکرایا اور بولا کہ لینے تو تجھے ہی
آیا تھا پر تجھ سے پہلے تیری ماں نے سودا کر لیا۔“

زیریں زیر کوٹھاری۔ کراچی

گھر کی مرغی

سیکرٹری نے اپنے باس کے کمرے میں داخل
ہو کر کہا۔ ”سر! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے
کے لیے آئی ہیں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے۔۔۔؟“

باس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔
”جی ہاں انتہائی خوبصورت اور دلکش۔“
سیکرٹری نے جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اسے اندر بھیج دو۔“ باس نے کہا اور
جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو باس
نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔ ”تم احمق تو نہیں ہو؟“
باس نے غصے سے کہا۔ ”اس بد صورت عورت میں
حسن کہاں سے تمہیں نظر آ گیا؟“

تم کرا یہ مت دینا، میں نے دے دیا ہے۔ لڑکے
نے جواب دیا۔

مرسلہ: احسن عرفان۔ کراچی

کامیابی تک

کامیابیوں کی چوٹی کو چھونے والے ناکامی کا سبق
سیکھتے ہیں۔ ”کبھی نہ گرنا کوئی کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھلنا کمال
ہے۔ یقیناً کسی عقل مند نے ناکامی سے سبق سیکھ کر یہ
بات کہی ہوگی۔ ناکامی کا سامنا حوصلے اور ہمت سے کرنے
والے لوگ ہی زندگی کے ہر میدان میں کامیابیوں سے
ہمکنار ہوتے ہیں اور تاریخ بناتے ہیں۔ جو کبھی غلطی نہ
کرے یا ناکامی کا سامنا کرے، وہ انسان نہیں بلکہ ایک
روبوٹ ہے۔ روبوٹ کبھی غلطی نہیں کرتا اور نہ ہی ناکام
ہوتا ہے۔ جب تک اس کی میعاد ختم نہیں ہو جاتی۔ ناکامی کا
سامنا بزدلی سے کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے
اس لیے زندگی میں اگر کبھی ناکامی سے دوچار ہونا پڑے تو
ہمیں اس وقت تک ہمت اور جواں مردی سے کام لینا
چاہیے، جب تک کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چومے۔ نا
کامی، کامیابی کے دروازے کی بجلی ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر سہیل کاظمی۔ کراچی

ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا
اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے
صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی!
میں تو صرف تیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“
”کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو
؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

”جناب ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا
کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے سسرال جا
رہا تھا۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔

مرسلہ: سارہ ظفر۔ ساہیوال

☆☆.....☆☆

اداس لوگوں کے نام

جانے کس دل سے مسکراتے ہیں
وہ جو اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں
شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

تین جھوٹ

دنیا میں تین جھوٹ ایسے ہیں جو سب سے زیادہ
بولے جاتے ہیں۔

☆ میری بیوی مجھے آج تک نہیں سمجھ سکی۔
☆ ہم نے رقم کا چیک ڈاک کے ذریعے روانہ
کر دیا ہے۔

☆ حکومت چاہتی ہے کہ لوگوں کے مسائل حل کرے۔
مرسلہ: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دوسروں کے مال کی طمع نہ کرنا بھی دراصل سخاوت ہے۔
☆ نصیحت اگرچہ ناخوشگوار ہوتی ہے لیکن اس کا
انجام خوشگوار ہوتا ہے۔
☆ شر اور فساد کو چھوڑنا بھی صدقہ ہے۔

☆ جو محبتوں کی قدر نہیں کرتے، وہ نفرتوں کا نشانہ بنتے ہیں۔
☆ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو دوسروں کی
خوشی ضرور مانگیں کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ آپ کی خوشیاں
دوسروں کی دعاؤں کی بدولت آپ کے پاس ہوں۔

مرسلہ: افشین۔ حیدرآباد

ایک سے بڑھ کر ایک

لڑکے نے لڑکی سے موبائل فون پر پوچھا۔
”کہاں پر ہو؟“

لڑکی نے بتایا میں اپنے ڈیڈی کی بی ایم ڈبلیو کار
میں کلب جا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور مجھے کلب
چھوڑے گا، اس کے بعد شاپنگ کے لیے جاؤں گی
پھر تمہیں کال کروں گی، تم کہاں پر ہو؟“
”ویگن میں تمہاری سیٹ کے پیچھے بیٹھا ہوں۔“

میں نے سچے دل سے تجھے کتنی یاد کیا

غزل

آج بھی یاد ہے وہ چھوڑ کے جانا تیرا
مجھ سے منہ پھیر کہ وہ آنسو بہانا تیرا
پیڑ کی چھاؤں میں ندی کے کنارے اکثر
بانسری پر وہ حسین گیت سنانا تیرا
جب بھی برسات کی رم جھم میں محو ہو جاتی
آکے کھڑکی میں اچانک وہ ڈرانا تیرا
باغ میں جھولتی رہتی تھی میں اکثر جھولا
ایک سے ایک غزل برہ کے سنانا تیرا
آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو وہی وقت وہ آنا تیرا
جانے والا کبھی واپس نہیں آتا انزاء
اتنا آساں تو نہیں بھول ہی جانا تیرا
انزاء نقوی۔ کراچی

عورت

آج بھی عورت ظلم کی چادر اوڑھے سوتی ہے
آج بھی عورت ہر لمحہ دھتکاری جاتی ہے
آج بھی عورت ہے بے عزت و بے توقیر
لیکن پھر بھی حرص و ہوس کا شکار ہو جاتی ہے
آج بھی عورت کو بازار میں سجایا جاتا ہے
جہاں خریدی اور وہ بیچی جاتی ہے
آج بھی عورت بیٹی پیدا کرنے پر
سولی پے لٹکائی جاتی ہے
آج بھی عورت سے حق چھینا جاتا ہے
بوڑھا ہو یا گود پالا، ورنہ قرآن سے بیاہی جاتی ہے

آج بھی عورت سے وابستہ رشتے ہیں صرف نام کے
جن کے نام پر وہ روز ماری و جلانی جاتی ہے
آج بھی عورت سہہ رہی ہے مرد کا ہر ظلم
اور زہر کا ہر گھونٹ امرت سمجھ کے پی جاتی ہے
شمینہ عرفان۔ کراچی

کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو

اب کون سے دکھ کی بات کروں
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو
جی جان سے مر جانے کا دکھ؟
یا اس کے پھٹنے کا دکھ؟
گر لاتی ہوئی کونجوں سا دکھ؟
یا گرتی ہوئی بوندوں سا دکھ؟
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو
میں کون سے دکھ کی بات کروں
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو
فرح علی۔ کراچی

غزل

ایک چہرہ جو چشم خواب میں تھا
عکس اس کا ہر اک گلاب میں تھا
سکھ کے سنے تھے اس کی آنکھوں میں
دکھ تو سارا مرے حساب میں تھا
ہم نفس مجھ سے بے رخی کے بعد
بتلا خود بھی اک عذاب میں تھا
اک فسانہ جسے کہیں چاہت
نا۔ مکمل ہر اک کتاب میں تھا

نشہ جو اس کی آنکھ میں تھا جمال
وہ بھلا کب کسی شراب میں تھا
سج جمال۔ کراچی

غزل

بے چین سے یہ دن ہیں اور بے قرار راتیں
کب ختم ہوں گی یا رب! یہ انتظار راتیں
جھلسا رہی ہیں تن کو، لرزا رہی ہیں من کو
مثل شراب راتیں، یہ شعلہ بار راتیں
آنکھوں میں غم کی جل جھل، دم گھٹ رہا ہے پل پل
دارو صلیب کی ہیں آئینہ دار راتیں
کیسی ملی جدائی، اک پل نہ نیند آئی
دشمن کا جیسے مجھ پر کرنی ہیں وار راتیں
خانم سے شب گزیدہ، جیسے بدن دریدہ
میرے سر پریم رب تو اس کی نکھار راتیں
فرید خانم۔ لاہور

غزل

محبت میں دست دعا لکھنے والو
محبت کو سمجھو وفا لکھنے والو
ذرا خود بھی اس پہ عمل کر کے دیکھو
کبھی زندگی کو انا لکھنے والو
زمین پر تمہاری حکومت رہے گی
کہاں تک یہ خود کو خدا لکھنے والو
تمہیں جو تجھی لکھنا ہے مرضی تمہاری
ہمیں ہر گھڑی بے وفا لکھنے والو
قفص میں پرندے مرے جا رہے ہیں
کہاں چھپ گئے ہو ہوا لکھنے والو
تمہیں کس قدر خوبصورت لگی ہوں
فری کی قاتل ادا لکھنے والو
فریدہ فری۔ لاہور

غزل

روز دوستی کر کے روز توڑ دیتے ہیں
خواب آنکھ کھلنے پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
داغ اچھے ہوتے ہیں دل پر اس لیے احباب
جب بھی موقع ملتا ہے داغ چھوڑ دیتے ہیں
تتلیاں محبت کی ہاتھ میں نہیں نکھرتیں
رنگ ہاتھ پر لیکن چھوڑ دیتے ہیں
اک نئی لغت دیکھی دوستی کے رشتوں کی
ہاتھ جو ملاتے ہیں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
درد کی فیصلوں پر کرب جاگتا ہے جب
لفظ بھی تسلی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
خولہ عرفان۔ کراچی

غزل

پسند آتی ہے اس کی سادگی جو مجھ کو
وہ روٹھ جائے تو بھاتی ہے دل لگی مجھ کو
وہ ایک پھول سا چہرہ جو دے گیا ہے دعا
یوں اپنی ذات میں لگتی ہے تازگی مجھ کو
جو ایک دل تھا وہ خانوں میں بٹ گیا آخر
یہ کس مقام پہ لے آئی بے دلی مجھ کو
میں آگ بن کے سمندر میں کود جاؤں گی
بلا رہی سمندر کی تشنگی مجھ کو
بھلا کے درد میں سارے تجھ ہی کو سوچوں گی
تو اس آ تو سہی میری زندگی مجھ کو
ہما میں گنتی میں بٹی رہی ہوں اک اک پل
سمیٹ لے کبھی صدیوں کی آگہی مجھ کو
ہما عظمیٰ۔ کراچی

☆☆.....☆☆

یہ ہوگی ثاببات

سوال آپ کے جواب زین العابدین کے!!

(اس ماہ شازیہ رضوی۔ کراچی کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دو شیزہ گفٹ ہمیں روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

☆ دور جا کر ... ارے بھئی ہمیں تو قریب کا بھی
بڑا تجربہ ہے۔

زنگس اشرف۔ کراچی

☆ زین بھائی! اگر مجنوں کی جگہ آپ ہوتے تو؟
☆ نابابانا! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

شمسہ بابر۔ چیچہ وطنی

☆ زین جی! اس موسم بہار میں، میں کون سا پودا
لگاؤں؟

☆ اس بار نیم ٹھیک رہے گا۔

انور جہاں۔ حیدر آباد

☆ زین جی! جلدی سے بتا دیں کہ لڑکیوں کے
لیے کون سا پروفیشن ٹھیک رہتا ہے فائنکشی طور پر؟
☆ ٹیچنگ کا! کیوں کہ شادی کے بعد بھی وہ Miss
ہی کہلاتی ہیں۔

پروین صدیق۔ لاہور

☆ بھیا جی! اس مرتبہ بہار ہمیں کیا پیغام دے رہی
ہے؟

☆ وہی جو ہر سال دیتی ہے۔ بہار و پھول برسوں

نگہت سلطانیہ۔ کویت شہ

☆ زین بھائی! میاں بیوی گاڑی کے دو پیسے
ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو؟
☆ پھر وہ گاڑی کب رہی، وہ تو رکشا ہو گیا۔ میاں
آگے دو بیویاں پیچھے۔

در شہوار۔ کراچی

☆ زین جی! جلدی سے ہمیں چھتر کی مونٹ
بتائیے؟

☆ ارے ارے، ذرا آرام سے۔ یہی سوال جب
ہم نے مسٹر چھتر سے کیا تو اس نے پتا ہے کیا کہا تھا
وہ بولا ہم اپنی گھر والی کا نام کیسے بتا سکتے ہیں۔ بھائی
ہمارے ہاں بہت پردہ ہوتا ہے نا۔

امید فاطمہ۔ گھونکی

☆ بند آنکھوں سے کیسے چنے دیکھتے ہیں؟
☆ بہت اچھے ... کبھی بہت ہی اچھے۔

عامر بشیر۔ کراچی

☆ بھائی جان! لوگ دور جا کر بھلا کیوں دیتے
ہیں؟

کوئی تو آنے والا ہے۔
سکتے ہیں۔

صبور احمد۔ سیالکوٹ

عائف کنول۔ سکھر

©: زین بھائی! وہ مجھے چند جان سپہ ہیں۔ بتائیے
میں ان کو کیا کہوں؟

©: زین جی مجھو بہ کی زلفوں کی چھاؤں میں سکون ملتا
ہے یا درخت کی چھاؤں میں؟

©: شاہ رخ خان کہہ دو خوش ہو جائیں گے۔

جڑ بھٹی ہمیں تو درخت کی ہی چھاؤں کا تجربہ ہے۔
سچ کچ بہت سکون ملتا ہے۔

شبانہ زمان۔ کراچی

شبانہ احمد۔ کراچی

©: بھیا! بوجھیں تو جانوں۔ اشارے نہ ہیں۔
کاڈر، نہ گھر کا نہ باہر کا؟

©: بھیا گھر میں آنے والے مہمانوں پر زیادہ پیار



☆: سی پال تو جانور کی طرف اشارہ ہے۔

آتا ہے یا جانے والوں پر؟

حنالطیف۔ اسلام آباد

☆: یہ تو بھٹی مہمانوں پر منحصر ہے کہ وہ جمالی ہیں یا
جلالی۔

©: بھیا جی! ہر سال وہ مجھے کیلینڈر اور جسنتری
کیوں تھما دیتے ہیں؟

شازیہ رضوی۔ کراچی

☆: ارے ذرا خیال سے! بہت دور اندیش ہیں، اس
لیے ان سے ذرا دور دور ہی رہا کرو اور سنبھل کہ

©: زین بھائی! وہ سالگرہ کا کیک کیوں نہیں
کھاتے؟

بات کیا کرو۔

☆: انہیں نقصان ہو رہا ہے۔ کیسے منہ میٹھا کر

صائمہ جہاں۔ حویلیاں

☺: زین بھائی! ذرا یہ تو بتائیے کہ بیوی کے میکے جانے پر شوہر حضرات کی خوشی دیدنی کیوں ہوتی ہے؟
☆ ارے واہ! بھی جلدی سے سن لیں۔ آزادی کے پسند نہیں ہوتی۔

عروج انیس۔ امریکہ

☺: زین جی! کسی کے دل میں گھر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

☆ یہ کوئی مسئلہ ہے؟؟ تم انہیں پہلے سے بتا دو جہیز میں ٹرک بھر کر مال اور ایک عدد مکان لے کر جاؤ گی۔

صدف نوید۔ کراچی

☺: زین بھائی! زین بھائی امیدوں کے پھول کس رنگ کے ہوتے ہیں؟
☆ سرخ سرخ۔

فرزانہ خان۔ ملتان

☺: زین بھیا! گرمیوں میں کسی کے گھر جائیں تو کیا لے کر جانا چاہیے؟
☆ ملتان سے کڑھائی والے کھسے اور سوٹ۔

مونس۔ نانگا پربت

☺: بھیا! اگر میاں جی روز روز تعریفیں کرنے لگیں تو کیا سمجھا جائے؟
☆ سمجھ لیں آپ نے انہیں فتح کر ہی لیا۔

رابی شاہ۔ جہلم

☺: زین جی! اکثر بیوٹی گرلز کے ہر مینڈ کنجے کیوں ہوتے ہیں؟

☆ ارے یہ تو پیسے والوں کا ٹریڈ مارک ہے بھی۔

سدرہ انور علی۔ جھنگ

☺: زین جی! بچوں کی کون سی قسم شریف ہوتی ہے؟
☆ جو ابھی دنیا میں آئی ہی نہیں۔

حور فاطمہ۔ پشاور

☺: زین جی! لوگ زیادہ بیٹھا کیوں اور کس لیے کھاتے ہیں مختصر جواب دیں؟

☆ لگ رہا ہے پیپر کا سوال ہے خیر جواب یہ ہے بی بی! بیٹھا کھانے والے کڑوی باتیں بھی بڑے مزے سے کر لیتے ہیں۔

حریم آصف۔ شیخوپورہ

☺: بھیا! دل کے قریب کون رہتا ہے؟
☆ دل تو بادشاہ ہے۔ کسی کو بھی زیادہ قریب آنے نہیں دیتا۔

افشین ظہور۔ کراچی

بھیا! اگر عامر خان مجھے اپنے ساتھ ہیروئن کی آفر کریں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟
☆ فوراً اپنی امی سے کہو کہ تمہیں چنگی بھر لیں۔

☆☆.....☆☆

پاکستان

کو پین برائے

مئی! 2015ء

نام:

پتا:

ہٹ لسٹ

کہنے لگے آپ اس خبر کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ بات یہ ہے کہ جب یہ خبر شائع ہوگی تو ہم خود اسے پڑھ کر دوسروں کو سنائیں گے تو کیا ان پر ہمارا رعب و دبدبہ طاری نہیں ہو جائے گا۔ ہٹ لسٹ پر عام آدمی کا نام تو نہیں آتا ہے، جاں بازوں کے نام ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں قتل

آج کے حالات کے پس منظر میں، ظرافت کا رنگ لیے ایک خوبصورت تحریر

دریافت کیا۔

”ناول آپ اردو میں لکھیں گے یا انگریزی میں؟“ کہنے لگے۔

”نہیں یار، ذہن میں ایک اسکیم آئی ہے، سوچا آپ سے پہلے اس مسئلے پر گفتگو ہو جائے۔“ ہمیں اپنی صلاحیتوں پر شک ہونا لازمی تھا۔ پوچھنے لگے، بھابی جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔“ عرض کیا، ”وہ فجر کی نماز پڑھ کے دوبارہ سو جاتی ہیں، پھر آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتیں۔“ بولے میں اندر آ جاؤں تفصیل سے بات ہوگی۔

ہمارے محلے میں ایک بڑا پارک ہے، جس میں صبح کے وقت خاصی رونق رہتی ہے کچھ حضرات قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، کچھ چہل قدمی فرماتے ہیں اور کچھ دبے مرد اور موٹی خواتین پارک کے باہر اس کے ارد گرد تیز تیز قدموں سے چلتی یا دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ہم بھی کچھ عرصے پہلے ایسے ہی دبے مردوں میں شامل تھے، لیکن جب موٹی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو خواتین کی چست خرامی بجائے پسندیدگی کے ہمیں ناپسندیدگی میں تبدیل ہوئی اور ہم نے پارک جانا ترک کر دیا۔

صبح ہی صبح ہم نہ صرف اپنا ناشتا تیار کرنے لگے، بلکہ کچھ پڑھنے لکھنے کا بھی اہتمام ہونے لگا۔ ایک دن کیا ہوا ہمارے محلے اور پارک کے دلدادہ بھائی نفیس عالم نے ٹھیک سات بجے ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھول کر جب ان کا دیدار ہوا۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صبح دم تشریف آوری کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے۔

”ایک ناول آئیڈیا میں آیا ہے۔“ ہم نے

کمرے میں آرام سے بیٹھ کر بھائی نفیس عالم نے کہا، ”کمرے کا دروازہ بند کر دیں مسئلہ اتنا نازک ہے کہ فی الحال اس کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے، ورنہ بعد میں تو پورے شہر کو ہی معلوم ہو جائے گا۔“

ہم محو حیرت تھے کہ نفیس عالم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنا ایک کان بھائی نفیس عالم کے منہ کے سامنے کر دیا کہ کہیں بات سنی ان سنی نہ ہو جائے۔ ہماری مستعدی پر تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ آپ نے ایک

دن تذکرہ کیا تھا کہ آپ کے ایک دوست روزنامہ "بھنگ" میں چیف رپورٹر ہیں۔" ہم نے ان کی یادداشت پر صاف کیا اور کہا۔

"ان کا نام شہریار خان ہے ان سے آپ کو کیا کام آن پڑا ہے۔"

جیب سے ایک پرچہ نکالتے ہوئے کہا یہ خبر پہلے صفحے پر چھپوائی ہے وہ پرچہ جب ہمارے ہاتھ میں آیا تو ہم پرستہ طاری ہو گیا۔

نقیس عالم صاحب، تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر گویا ہوئے، "زبیری صاحب! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے، لگتا ہے آپ تو کوچ کرنے والے ہیں۔" ہم نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول کر سر کو دو تین جھٹکے دیے اور کہا۔

"حضور یہ کیا لکھ لائے ہیں آپ؟" کہنے لگے بہت اہم بات ہے، آپ کی سمجھ میں مشکل آئے گی۔ قارئین، نقیس عالم کے پرچے میں تحریر تھا کہ۔

"مشہور سماجی کارکن نقیس عالم کا نام اپنی لسٹ لسٹ پر ایک سیاسی جماعت نے اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ اس نے مشہور سماجی کارکن نقیس عالم کا نام اپنی ہٹ لسٹ پر لگا دیا ہے۔ وہ یا تو سماجی کاموں سے فوری طور پر دست بردار ہو جائیں، یا اپنی قبر کا انتظام کر لیں۔"

ہم نے یہ تحریر با آواز بلند پڑھ کر نقیس عالم صاحب سے کہا کہ پہلے ہمارے چند سوالات کے جوابات عنایت فرمائیے:

کہنے لگے "ضرور ضرور۔"

پہلا سوال! آپ مشہور سماجی کارکن کب سے بن گئے ہیں؟

جواب: "ہم تقریباً ہر روز سڑک پر پڑی ہوئی ایک دوائی نہیں ضرور ہٹاتے ہیں۔ ترکاری بیچنے والے کو روز ڈانٹتے ہیں کہ اتنی زور

سے چیخ کر سبزی مت فروخت کرو، محلے کا سکون برباد کر دیتے ہو اور تیسرے یہ کہ ہم ایک تنظیم بنانے والے ہیں، جس کا نام ہوگا "کارکنان سماجی تحریک - وطن عزیز۔"

دوسرا سوال: اس سیاسی تحریک کا نام بتائیے، جو آپ کو قبرستان کا راستہ دکھانا چاہتی ہے۔"

"جواب: ایسی کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے، لیکن محلے میں اپنی دہشت بٹھانے کے لیے سیاسی جماعت لکھنا ضروری ہے۔"

"ہم نے عرض کیا اول تو آپ کوئی مشہور سماجی کارکن نہیں ہیں، دوسرے کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے، جو آپ کو راہ عدم دکھانا پسند کرتی ہو، آپ کیوں اپنی بیوی کو اس قدر جلد بیوہ بنانے پر مصر ہو گئے ہیں۔"

کہنے لگے آپ اس خبر کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ جب یہ خبر شائع ہوگی تو ہم خود اسے پڑھ کر دوسروں کو سنائیں گے تو کیا ان پر ہمارا رعب و دبدبہ طاری نہیں ہو جائے گا۔ ہٹ لسٹ پر عام آدمی کا نام تو نہیں آتا ہے، جاں بازوں کے نام ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں قتل کرنے والا تو کوئی نہیں، خواہ مخواہ کون کسے قتل کرتا ہے۔"

عرض کیا: "اس شہر میں شوقین قاتل بھی بستے ہیں، ان کا کام قتل کر دینا ہے کسی کو معلوم ہو گیا کہ آپ لسٹ پر آ گئے ہیں تو دو آدمی اسکوٹر پر آپ کا پتا پوچھتے آئیں گے۔ آپ گھر سے باہر نکلیں گے کئی گولیاں آپ کے سینے میں پیوست کر کے وہ رفو چکر ہو جائیں گے۔ ان کا شوق پورا ہو جائے گا اہل محلہ سناٹے میں آ جائیں گے۔"

کہنے لگے، "آپ کمال کرتے ہیں، ہم کوئی مرنے کے لیے تھوڑی یہ خبر چھپوانا چاہتے ہیں، بس ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ جو محلے کا جمعدار ہے، یہ ہمیں



دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے سلام تک نہیں کرتا اور جو ترکاری والا ہے، یہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ زیادہ ہی شور مچاتا ہے، اور یہ جو لائن مین ہے جمال اس نے دس دن سے ہمارا فون ٹھیک نہیں کیا ہے۔ ہٹ لسٹ پر ہمارا نام سن کر سب اپنے ہوشوں میں آجائیں گے۔ کیا سمجھے آپ.....؟“

ہم نے کہا، ہم بالکل سمجھ گئے، سارا قصہ جمال کا ہے۔“

کہنے لگے، کل میں نے اسے پکڑ لیا تو کہنے لگا آپ کا کمپلیٹ نمبر تو ایک سو ستائیسواں ہے، ایک ہفتہ اور گئے گا۔ میں نے کہا بکواس بند کرو، ستائیسواں نمبر ہے، سمجھ گئے۔ میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔

ہم نے کہا، وہ رشوت کب مانگتا ہے وہ تو قرض مانگتا ہے۔ تنخواہ ملتے ہی قرض ادا کر دوں گا۔“

فرمایا مجھے معلوم ہے آج تک اس نے کسی کا قرض ادا نہیں کیا، جو میرا ادا کرے گا۔“

ہم نے پوچھا، قرض میں کتنی رقم مانگ رہا ہے؟“ بولے پورے ایک ہزار روپوں کا مطالبہ ہے کہ بچوں کی اسکول کی کتابیں خریدنی ہیں۔ یہ خبر پڑھتے ہی وہ ہمارا فون ٹھیک کر دے گا۔“ ہم نے کہا یہ خبر اتنی آسانی سے شائع نہیں ہو سکتی، بلکہ ہمارے خیال میں ناممکن ہے۔“

کہنے لگے، پھر آپ کی دوستی کا فائدہ! اچھا اب ہمیں اجازت دیں۔“ یہ جملہ اس قدر درد انگیز انداز میں کہا گیا کہ ہم نے کہا۔

”نفیس صاحب ہم کو کم از کم دو دن تو دس کہ ہم ”بھنگ“ اخبار کے چیف رپورٹر سے بات کر لیں، جمال لائن مین کو سمجھا بھالیں۔“ کہنے لگے آج بدھ کا دن ہے میں ہفتہ کی صبح حاضر ہوں گا۔“

☆.....☆.....☆

ہفتہ کو ٹھیک سات بجے نفیس عالم صاحب نے ہمیں ابلیسی آواز دی ہم نے فوراً دروازہ کھول کر انہیں کمرے کے اندر آرام سے بٹھا دیا۔ وہ ہمیں امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

عرض کیا ہے کہ چیف رپورٹر صاحب نے پہلے آپ کا پرچہ پڑھ کر کچھ مغلظات سنائی تھیں، جو ہم دہرائیں سکتے۔ ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے فرمایا کہ اسے ایک خصوصی اشتہار کی صورت میں شائع کر سکتے ہیں، جس کا ہدیہ دس ہزار روپے سے کم نہ ہوگا۔“

”دس ہزار روپے، اس دوسطری اشتہار کے؟“ نا بابا نا ہم اس محبت سے باز آئے۔ یہ کیسے دوست ہیں آپ کہ گلا کاٹنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔“ تھوڑے وقفے کے بعد جمال سے متعلق دریافت کیا تو ہم نے کہا ہم نے اس کو پانچ سو روپے پر تیار کر لیا ہے اور اس نے پکا وعدہ کیا ہے کہ وہ چھ ماہ کے اندر آپ کا قرضہ اتار دے گا۔

نفیس صاحب کہنے لگے۔ ”میں جمال کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔“ ہم نے کہا، ”آپ نہ دیں ہم دیتے ہیں۔ بعد میں آپ ہم کو ادا کر دیجیے گا۔“ وہ کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ ہم نے ان کی خاموشی کو رضا مندی سمجھا اور جمال کو قرضے کی رقم دے دی۔ اگلے دن ان کا فون درست ہو گیا۔ تو انہوں نے ہمیں فون کر کے خوش خبری سنائی کہ ان کا فون خود بخود درست ہو گیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے ان کی طرف سے پانچ سو روپے جمال کو کل دے دیے تھے تو وہ ناراض ہو کر بولے۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ میں ایک پیسہ دینے والا نہیں ہوں۔

اس طرح ہم خود بھائی نفیس کی مالیاتی ہٹ لسٹ پر نمودار ہو گئے۔ بیوی نے سارا قصہ سن کر صرف اتنا کہا۔ ”نیکی کرو اور لیاری ندی میں ڈالو۔“

☆.....☆.....☆

لولی وڈ ابولی وڈ

وڈ کی خان

والے حمزہ نے کہا ہے کہ بول اور خدا کے لیے
میں کوئی آئٹم نمبر نہیں تھا لیکن فلمیں ہلاک بسٹر



ثابت ہوئیں۔ فلم کی کامیابی کے لیے مسالو کی نہیں
مضبوط اسکرپٹ، ڈائریکشن اور اداکاری کی
ضرورت ہوتی ہے۔

نازیہ حسن کی پچاسویں سالگرہ

موسیقی کی دنیا میں نیا انداز متعارف کرانے

والی پاپ گلوکارہ نازیہ حسن آج اگر زندہ ہوتیں تو

اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہوتیں۔ نازیہ حسن اور

فواد خان کی کپور اینڈ سنز

بہترین نئی دریافت کا فلم فیئر ایوارڈ پانے

والے لولی وڈ کے بہرون اشار فواد خان نے حال ہی



میں کرن جوہر کی فلم کپور اینڈ سنز سائن کر لی ہے۔
یاد رہے کرن جوہر کا نام ہی بولی وڈ میں کامیابی
کی ضمانت مانا جاتا ہے۔ ڈش یو بیسٹ آف لک

مسٹر بہرو۔

حمزہ علی عباسی، آئٹم نمبر کے خلاف

حمزہ علی عباسی ان دنوں خبروں میں ہیں۔

پیارے افسانے شہرت کی بلند یوں کو چھوئے

ان کے بھائی ذویب حسن کو پاکستان میں پاپ

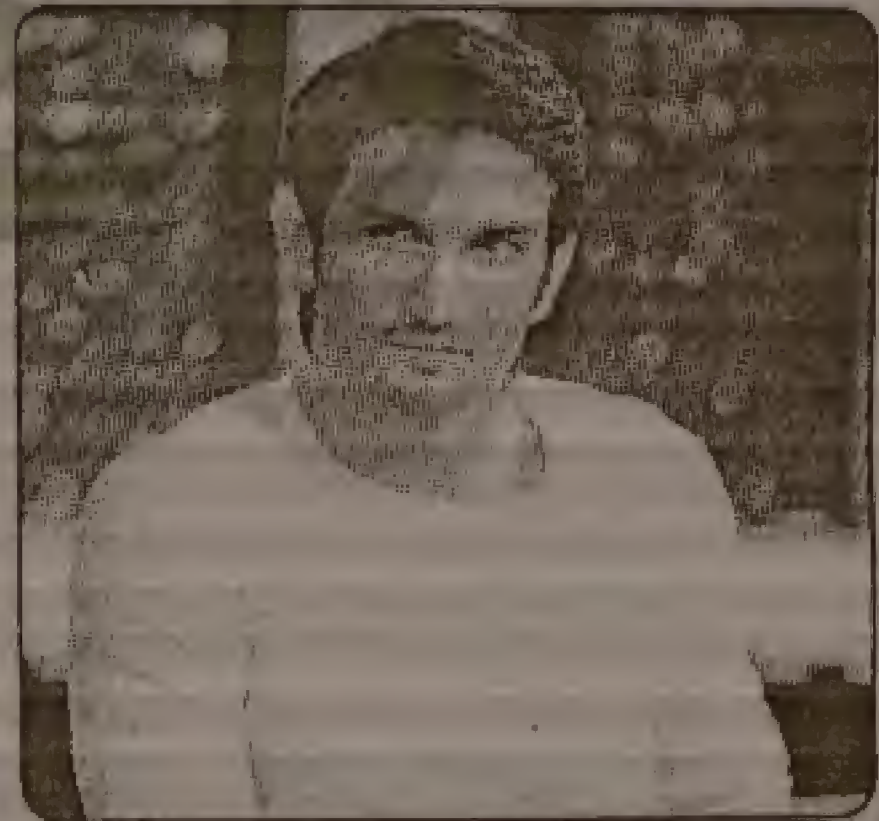


موسیقی کا بانی کہا جاتا ہے۔ نازیہ اور ذہیب نے اسی کی دہائی میں بھارتی فلم میں آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے گا کر گلوکاری کی دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔

شہانت سنگھ راجپوت

کی ڈسٹیکو بیوم کیش بخشی

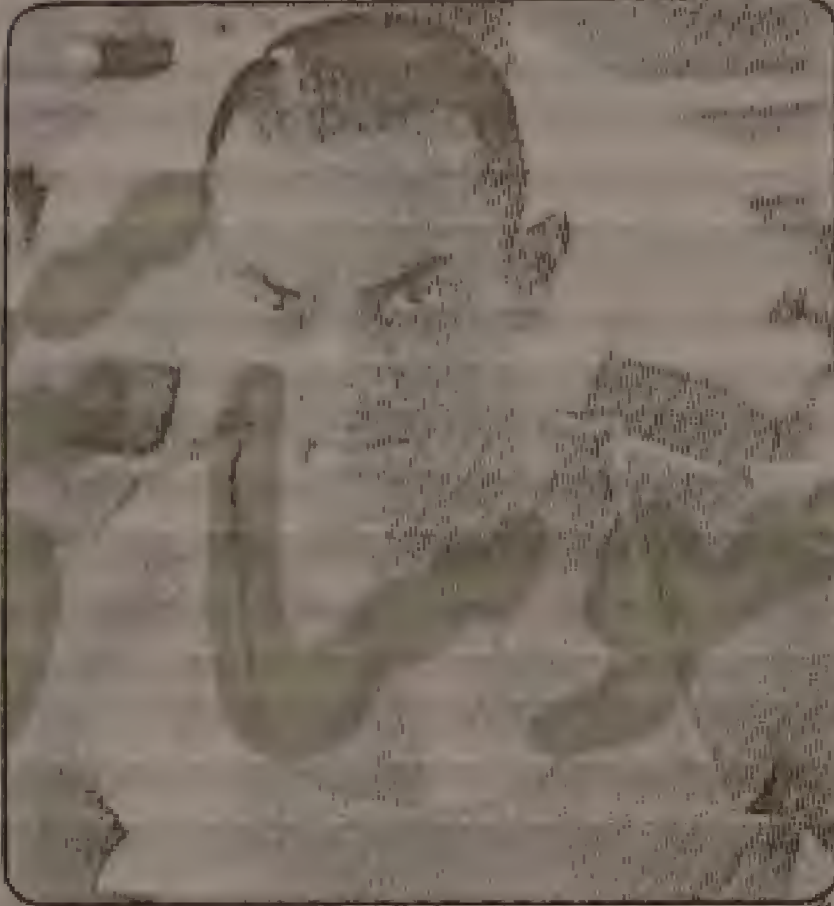
بلاک بسٹر فلم پی کے سے شہرت پانے والے سرفراز یعنی شہانت سنگھ راجپوت ڈسٹیکو بیوم کیش



بخشی ماہ اپریل میں ریلیز ہونے والی بولی وڈ کی پہلی فلم ہے۔ ہدایت کار دیپا کریشنر جی کی فلم کی کہانی

معروف مصنف شراوند کے افسانوں پر مبنی اس کردار بیوم کیش بخشی سے ماخوذ ہے۔ ایکشن اور تھرلر سے بھرپور اس فلم کے دیگر ستاروں میں آئندہ تیواری، دیویا مینن اور سوامتی کاکتری جی شامل ہیں۔

عامر خان نے دنگل کے لیے صحت داؤ پر لگا دی مسٹر پرفیکٹ عامر خان نے اپنی آنے والی فلم



دنگل کے لیے خوب وزن بڑھالیا ہے۔ اس وقت عامر خان کی صحت مندی کے چرچے زوروں پر ہیں۔ تیش تیواری کی فلم دنگل میں عامر خان نے لگ بھگ 25 کلو وزن بڑھالیا ہے۔ امید ہے عامر خان کی آنے والی فلم دنگل کامیابی کے نئے ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوگی۔

دھرم سنکٹ سنسر کی زد میں

بولی وڈ سنسر بورڈ سی بی ایف سی نے آنے والی فلم دھرم سنکٹ میں یعنی مذہبی بحران کا شکار، کی اسکریننگ کے لیے مذہبی رہنماؤں کو مدعو کیا ہے۔ باریش راول اور نصیر الدین شاہ جیسے لیجنڈا اداکاروں کی فنکاری سے مزین اس فلم کی کہانی حساس موضوع پر مبنی ہے اطلاعات کے مطابق فلم می

مراد جو سنسٹوں پر ستر کیا گیا ہے۔ اس فلم کی کہانی



ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے اس کی عمر کا اچھا
نہ صرف گورنر کے جھپٹا چکا ہے کہ وہ ایک
مسٹر جس پر پیدا ہوا تھا اور ایک ہندو نے اسے
پیدا کیا تھا۔

مسٹر پیو

نوجوانوں نے بہتر کون جوہر کیو رائیڈ ستر



سائن کی تو دوسری طرف انہیں فوراً ہی پر یانکا چو پڑا
کے ساتھ میڈنگ رول میں مسٹر چالو میں ریما کا گتی
نے سائن کر لیا ہے۔ یاد رہے اس سے پہلے اس فلم

میں انارناوت اور سیف علی خان اوسان کیا گیا
تھالیان ان اداکاروں کی مصروفیات کے پیش نظر فواد
اور پر یانکا کے نام قرعہ کھلا۔ فلم کی شوٹنگ اسٹارٹ
ہو چکی ہے۔ امید ہے 2015 ہی میں یہ فلم نمائش
پذیر ہو جائے گی۔

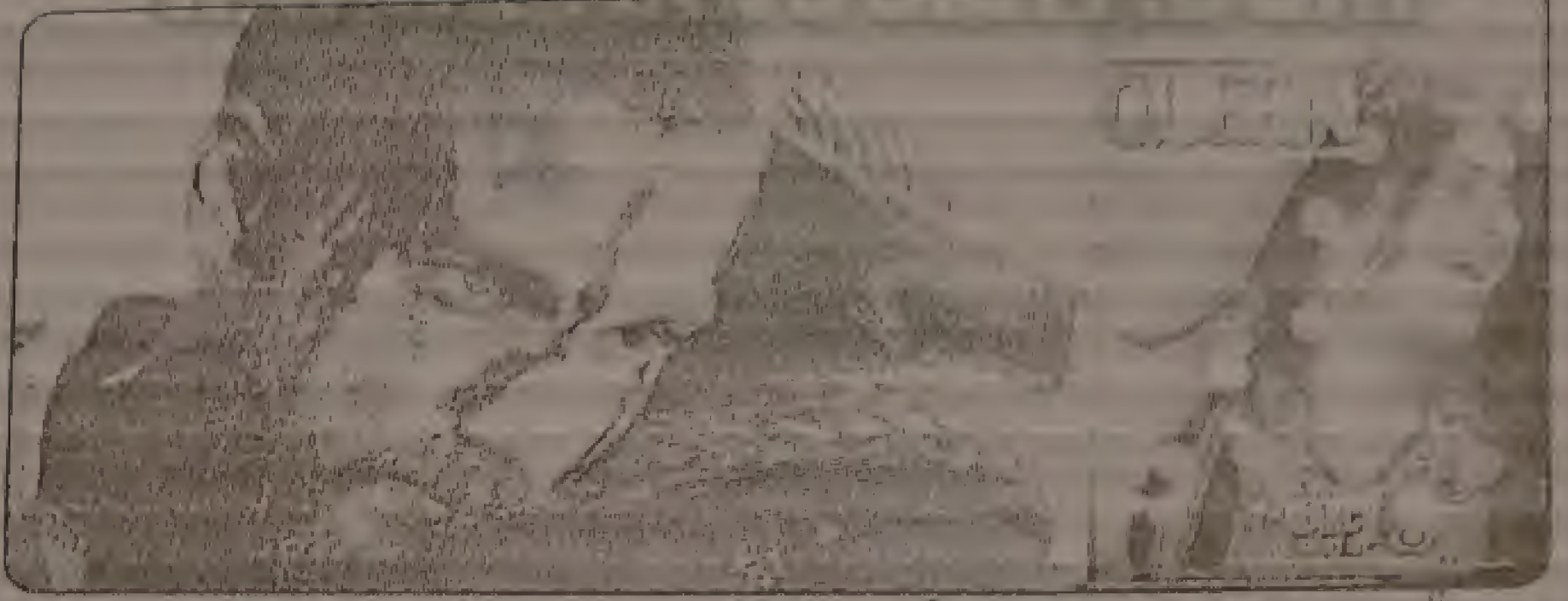
ڈرنی پولیٹکس کے بعد عشق ان سنسٹ
ڈرنی پولیٹکس کی کامیابی کے بعد ملکہ شراوت
کی نئی فلم شرمین جوشی کی 'عشق ان سنسٹ' ہے۔ اب



دیکھنا ہے ملکہ کے لٹکے جھٹکے سنسٹ سے بچ کر
شائقین فلم کو پللیں جھپٹنے پر کتنا مجبور کرتے ہیں۔

بولی وڈ کے نیشنل ایوارڈ

بولی وڈ کے نیشنل ایوارڈز کا اعلان کر دیا گیا
ہے۔ بیسٹ ایکٹر ٹھہرے کناڈا فلم 'نانو اوائل' سے
وہ، بیسٹ ایکٹریس میں ہندی فلم 'کون' سے
گنگنا رناوت ٹھہریں اور بیسٹ معاون اداکارہ کا
ایوارڈ بلجندر کوہریانوی فلم 'پگڑی' کے لیے دیا گیا۔
میری کوم کی ڈائریکشن پر بہترین ہدایت کا رقرار
پائے سری جیت مکھرجی۔ بیسٹ ڈائلاگز اور
بہترین میوزک کے ایوارڈ ویشال بھردواج کے حصے



ماہرہ خان کی ریکس ریڈی

لولی وڈ کی نامور ہیروئن ماہرہ خان اپنی اداکاری کے ذریعے بڑا نام بنا چکی ہیں اور یہ ان کی کامیابی ہے کہ بولی وڈ کے فلم میکرز نے ماہرہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کنگ خان کے ساتھ فلم ریکس میں بطور ہیروئن کاسٹ کر

میں۔ فلم حیدر سے آئے۔ حیدر ہی سے سکھویندر سنگھ بھل گا کر بہترین میل سنگر کا ایوارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تو ڈولی آہلو والیا بھی حیدر سے بہترین کاسٹیڈ منر ڈیزائنر کا ایوارڈ حاصل کر گئیں۔ میری کوم پر نجے لیلہ بھنساالی بیسٹ پروڈیوسر قرار پائے تو کوئن کے لیے بہترین ہندی فلم ڈائریکٹر کے طور پر وقاص بھل قرار پائے۔

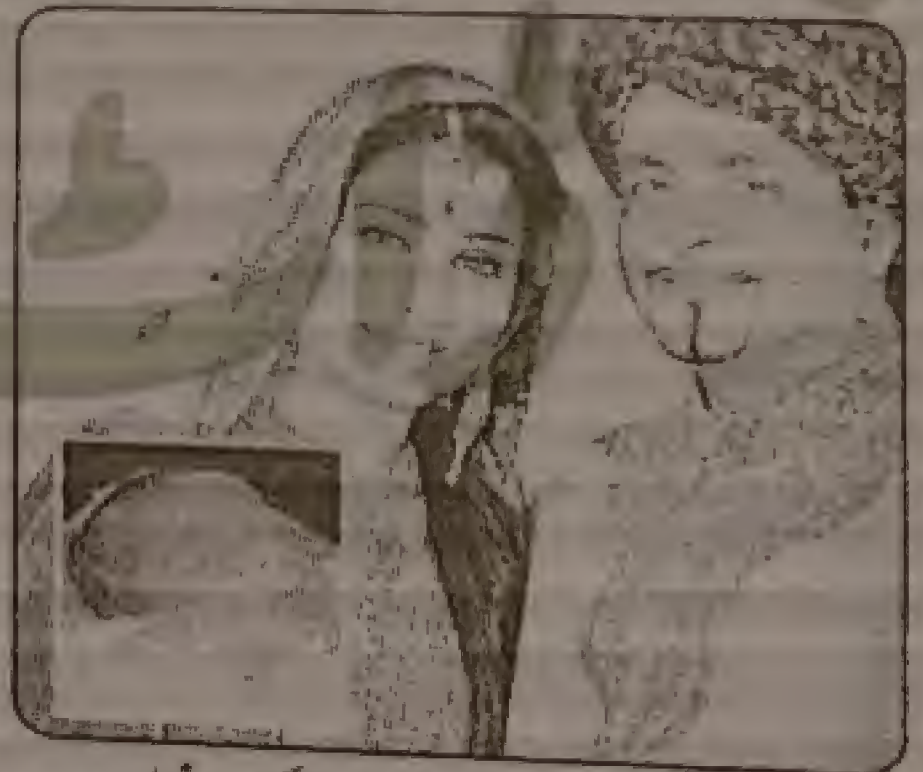
ریمہ خان ماں بن گئیں

لولی وڈ کی صف اول کی اداکارہ اور



لیا۔ شاہ رخ خان کی فیورٹ ہیروئنوں میں ماہرہ خان بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ماہرہ خان کی فلم ریکس تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتے ہوئے مکمل ہو گئی ہے۔ ماہرہ خان اس وقت نواد خان کے بعد لولی وڈ ہاٹ کیک بن چکی ہیں۔ اس وقت ماہرہ خان کی ڈیمانڈ میں زبردست اضافہ ہو چکا ہے لیکن فی الحال ماہرہ نے اس کامیابی کو انجوائے کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور فی الحال انہوں نے کوئی پروجیکٹ سائن نہیں کیا۔ گڈ لک ماہرہ خان۔

☆☆.....☆☆



پروڈیوسر ریمہ خان ماہ مارچ میں ایک خوبصورت بیٹی کی ماں بن گئیں۔ ریمہ کی خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ بورن بے بی کی صحت اور زندگی کی دعائیں ہم سب کی طرف سے ہیں۔ پپی پپی ریمہ کے لیے۔



نفسیاتی الجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

ثناء۔ فیصل آباد

جائے اور وہ آئندہ اپنے حربے استعمال کرنے سے گریز کرے۔

صفیہ بانو۔ لاہور

☆: میرے مزاج، سوچ و طرز زندگی میں اس وقت بہت اچھی تبدیلیاں آئی تھیں، جب بیٹی کی پیدائش متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بیٹی ہوگی تو بھی میرے مزاج پر کوئی برا اثر نہ پڑا اور اب جب کہ بیٹی تین ماہ کی ہے، میں پہلے کی طرح بد مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ شوہر کے ساتھ رویہ خراب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے میری والدہ سے بھی شکایت کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ شروع سے ہی غصے کی تیز ہے۔ خط اس لیے لکھ رہی ہوں اگر میرا مزاج خراب ہے تو حمل کے دوران خوشگوار کیوں رہا، پانچ سال قبل ڈپریشن بھی ہو چکا ہے۔

☆: دوران حمل خون میں ہارمونز کا مناسب توازن رہنے کے سبب طمانیت کا احساس رہا، جو قدرت کی طرف سے تھا اسی وجہ سے ذہنی کیفیت پر سکون رہی، بعد میں پھر پہلے والی کیفیت ہو گئی۔ پانچ سال قبل ہونے والا ڈپریشن کس طرح ٹھیک ہوا تھا، یہ آپ نے نہیں لکھا۔ بعض اوقات وقت کے ساتھ ذہنی کیفیت میں کچھ بہتری آ جاتی ہے اور پھر دوبارہ وہی کیفیت ہو سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ غصہ اور

☆: باجی! میرا بیٹا آٹھ سال کا ہے۔ ہر روز پہلے سے زیادہ رقم اسکول لے کر جانا چاہتا ہے۔ ایک دن اس نے سینڈوچ کے ساتھ دس روپے لیے پھر دوسرے دن بیس روپے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح تیسرے دن کہنے لگا یہ پیسے کم ہیں زیادہ دیں ورنہ اسکول نہیں جاؤں گا اور اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی میں نے فوراً پیسے دے دیے۔ میرے شوہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے آئندہ صرف لچ ملے گا کوئی پیسا نہیں دیا جائے گا۔ جب وہ اسکول چھوڑنے جاتے ہیں تو وہ خاموشی سے چلا جاتا ہے مگر میرے ساتھ ضد کرتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا بچے کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟

☆: بچہ اُسی کے ساتھ ضد کرتا ہے جو ضد پوری کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اگر آپ بھی بچے کے اسکول نہ جانے والی دھمکی پر پریشان نہ ہوتیں اور اس کے مطالبے کی رقم میں اضافہ نہ کرتیں تو وہ سمجھ جاتا کہ بات نہیں مانی جائے گی۔ اگر وہ ایک بار بھی چھٹی کر لیتا تو والد کی ناراضگی اسے دوبارہ چھٹی پر آمادہ نہ کرتی پہلی بار ہی ضد پر بات پوری نہ کریں بلکہ اُس وقت سمجھا دیں کہ بات غلط ہے اور مطالبہ بھی غلط وقت پر ہے تاکہ اس کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو

بد مزاجی کے ساتھ گھبراتے کم اور بگڑتے زیادہ ہیں۔
مزاج کی خرابی پیدائشی نقص نہیں، اس میں بہتری
ممکن ہے۔

فاخرہ بتول۔ راولپنڈی

☆: باجی! میرا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ میرے
شوہر نے شادی کے بعد مجھ سے بہت باتیں کی تو
قسمیں کھائی کہ تمہارے علاوہ کوئی اور عورت نہیں آ
سکتی میری زندگی میں۔ لیکن جیسے ہی میں بیٹے کی
ولادت کے بعد مکے میں رہنے کے لیے گئی۔ وہ گھر
میں ایک لڑکی کو لے آئے اور وہ اب اس سے نکاح
کر چکے ہیں۔ وہ لڑکی میرے بستر پر سوتی ہے۔
میری چیزیں استعمال کرتی ہے شوہر مجھ سے ملنے
آتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں لیکن ساتھ لے کر نہیں
جاتے۔ بچے سے بھی خاص دلچسپی نہیں۔ ان حالات
میں شدید ڈپریشن کا شکار ہوں۔ میرا تو ماں کے سوا
مکے میں بھی کوئی سہارا نہیں جو بچوں کے ساتھ یہاں
زندگی گزاروں۔

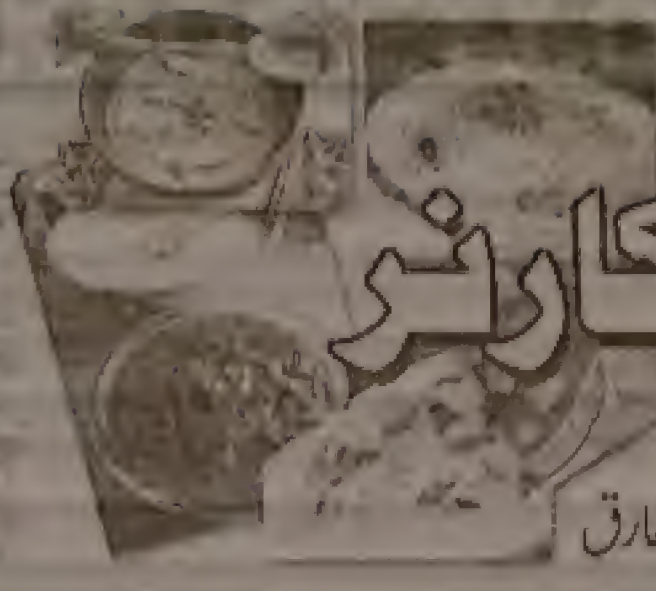
☆: یہ سب کچھ برداشت کرنا معمولی بات
نہیں جب کہ صحت کے حوالے سے بھی حساس دور
سے گزر رہی ہیں۔ ننھے بچے کی دیکھ بھال کی ذمہ
داری بھی ہے۔ اب دور استے ہیں یا تو ہمت اور
حوصلے کے ساتھ اپنے حقوق حاصل کیے جائیں
اور پھر سے بچوں کی خاطر بہتر زندگی گزاری
جائے۔ یا پھر ٹکلیں ہو کر خود کو نفسیاتی مریضہ بنا لیا
جائے مجھے آپ سے پہلے والے راستے کو اپنانے
کی امید ہے اور یقیناً آپ ایسا کر لیں گی۔ سنبھال
لیں خود کو! صبر کے ساتھ اٹھیں اور شوہر سے سنجیدگی
سے بات کریں کہ وہ دوسری بیوی کو دوسرے گھر
میں رکھیں، آپ کو آپ کا گھر خالی کروادیں۔ اس
معاملے میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے بھی
مدد لی جاسکتی ہے۔

امیرہ فاطمہ۔ کراچی

☆: باجی! وقت کے ساتھ میری پریشانی بڑھتی
جارہی ہے، کسی پل بھی سکون نہیں جبکہ ہمارے مالی
حالات بھی خراب نہیں ہیں، اچھی جاب ہے
میرے پاس مگر امی ہر بات پر ذہنی اذیت دیتی
رہتی ہیں۔ بڑی بہن کی عمر 29 سال ہے میری
27 سال ہے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی
۔ خاندان سے دور شتے آئے وہ بھی امی ابو نے
نہیں ہونے دیے۔ اب نیٹ پر ایک آدمی سے
بات ہوئی۔ کہتا ہے شادی شدہ ہے بیوی کو چھوڑا
ہوا ہے۔ اس نے مجھے شادی کی آفر کی میں نے
رشتہ لانے کو کہا تو اس نے ملنے کی شرط لگا دی، مگر
مجھے اس بات پر شک ہے کہ وہ مجھے دھوکہ نہ
دے دے کیوں کہ عزت پیاری ہے۔ یہ بھی
سوچتی ہوں وہ مجھے باتوں سے غلط نہیں لگتا
اعتبار بھی نہیں کر سکتی۔

☆: آپ کے جملے سے والدین کے حوالے
سے بدگمانی ظاہر ہو رہی ہے۔ خاندان سے آنے
والے رشتوں میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوگی جو انکار
ہوایا پھر وہ قسمت میں ہی نہیں ہوں گے۔ والدہ کس
قسم کی باتیں کہتی ہیں جن سے اذیت ہوتی ہے۔ یہ
 واضح نہ ہو سکا شادی میں دیر ہونے کا یہ مطلب نہیں
ہوتا کہ انجانے لوگوں سے تعلق رکھا جائے، خواہ وہ
صرف گفتگو تک ہی ہو، غلط ہے۔ آپ یقیناً ایک
اچھی لڑکی ہیں جو ملنے نہیں گئیں لیکن لوگ اپنی باتوں
سے خود کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو وہ حقیقت میں نہیں
ہوتے کسی کی بیوی بلا وجہ علیحدہ نہیں ہوتی۔ اس شخص
سے کبھی بھی کہیں ملنے نہ جائیں اور بات کرنی بھی
چھوڑ دیں۔ آپ کی نیکی کے صلے میں اچھی زندگی
ضرور ملے گی۔

☆☆.....☆☆



کچن کارنر

نادیر طارق

پیارے قارئین! موسم آہستہ آہستہ تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ گرمیوں کی آمد آند ہے۔ موسم براہ راست ہمارے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہم اس تبدیلی کو اپنے کھانوں کی انفرادیت اور درائی سے ایک حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں۔ موسم کی مناسبت سے اس ماہ بھی آپ کے لیے پکانے میں آسان اور کھانے میں ذائقے دار ڈشز کی تراکیب حاضر ہیں۔

مشن ہر مسالا

چڑھا دیں۔ پہلے تیز آنچ پر ابالیں، پھر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب دیکھیں کہ گوشت گل گیا ہے۔ پانی خشک ہو رہا ہے تو اچھی طرح بھون لیں اور جب تیل یا گھی اوپر آجائے تو چوہا بند کر کے گرم مسالا چھڑک دیں۔ راستہ اور نان سے تناول فرمائیں۔

عربی رائس

اجزاء:
چاول
چکن
لہسن اور ک پیسٹ
پیاز
لیموں کا رس
پسی کالی مرچ
یادام
سرخ شمش
نمک
تیل
ترکیب:
چکن کی بڑی بوٹیاں بنا کر دھولیں اور چھلنی میں رکھ کر ان کا اضافی پانی خشک کر لیں۔ پھر لیموں

ایک کلو مشن بیف یا چکن
15 سے 20 عدد
ایک گڈی
2 ٹیمبل اسپون
1 ٹی اسپون
1 ٹی اسپون
آدھا کلو
آدھا کلو
2 ٹیمبل اسپون
حسب ذائقہ
آدھا پاؤ

اجزاء:
گوشت
ہری مرچ
ہر ادھنیا
ادرک لہسن پیسٹ
لال مرچ پاؤڈر
ہلدی پاؤڈر
پیاز
ٹماٹر
گرم مسالا
نمک
گھی یا تیل

ترکیب:
گوشت اچھی طرح دھو کر دیگی میں ڈالیں۔
ادھر پیاز کاٹ کر ڈالیں اور ک لہسن پیسٹ شامل کر لیں۔ تیل یا گھی ڈالیں۔ ساتھ میں لال مرچ پاؤڈر اور ہلدی پاؤڈر ڈالیں اور نمک بھی ڈال دیں ہری مرچ بھی شامل کر لیں۔ ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر

نشان آجائیں۔ فرینگ پین میں تیل گرم کر کے احتیاط سے تلمیں سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔ سلاو چھٹی یارائے کے ساتھ پیش کریں۔

کریم سلاو

اجزاء

آدابے ہوئے اور چوکور کئے ہوئے 2 کپ

کریم 1 کپ

نمک چٹکی بھر

سفید مرچ چٹکی بھر

ہری پیاز آدھا کپ

ترکیب:

ان تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کریں اور فریق میں رکھ کر ٹھنڈی کر کے کھائیں۔

دال ماش اور قیمہ

اجزاء

دال ماش ایک پاؤ

قیمہ آدھا کلو

پیاز آدھا کلو

لہسن ایک پوتھی

ادرک ایک بڑا ٹکڑا

نمک حسب ذائقہ

سرخ مرچ ایک کھانے کا چمچ

ہلدی ایک چٹکی

ہری مرچ چار، پانچ عدد

گرم مسالا چائے کا ایک چمچ

ہر ادھیا حسب ضرورت

تیل آدھا کپ

ترکیب:

پیاز نیچے دار کاٹ لیں اور دال میں بھون کر

کے رس میں نمک، پس کالی مرچ اور لہسن ادرک کا پیسٹ ملا کر چکن پر لگائیں اور ایک گھنٹے کے لیے فریق میں رکھ دیں۔ فرینگ پین میں دو چمچے تیل گرم کر کے چکن کو سنہرا کر لیں۔ الگ تیلیں میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں پھر اس میں چکن بادام اور کشمش سمیت چاول ڈال کر بھونیں پھر چار پیالی پانی شامل کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہونے پر ہلکے ہاتھ سے چمچے کی مدد سے چاولوں کو اوپر نیچے کریں اور دم لگا دیں۔

مٹھیا کباب

اجزاء

قیمہ

پیاز

لہسن ادرک پیسٹ

ہری مرچ

ہر ادھیا

سرخ مرچ

پسا گرم مسالا

لیموں کارس

انڈا

نمک

تیل

ترکیب:

ایک بڑے برتن میں قیمے میں لیموں کے رس اور انڈے سمیت تمام مسالے ڈال دیں۔ ہری مرچ اور ہر ادھیا بھی باریک کاٹ کر ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے فریق میں رکھ دیں۔ (قیمہ چکن کا بھی بنوا سکتی ہیں)۔ اب قیمے کو ہاتھ سے سیخ کباب کی طرح کباب کا شپ دیں۔ مٹھی میں دبائیں تاکہ انگلیوں کے

سوس بنانے کی ترکیب: تیل گرم کریں۔ لہسن فرائی کریں۔ شملہ مرچ اور تمام اجزاء بھی چکن سمیت شامل کریں اور سادے چائیز رائس کے ساتھ سرو کریں اور داد حاصل کریں۔

مرغ چھولے

اجزاء
مرغی (چھوٹے پیس) چھوٹے پیس
چھولے ابلے ہوئے 2 پیالی
پیاز 2 بڑی
ٹماٹر 2 بڑے
لہسن اور رک کا پیسٹ 1-1 چمچ
نمک مرچ 1 چمچ
پسا گرم مسالا 1 چائے کا چمچ
مرچ 1 چمچ
پسا دھنیا 1 چمچ
تیل ڈیڑھ پیالی
ہلدی آدھی چمچی

ترکیب:

پیاز تیل میں تل لیں۔ جب پیاز سنہری ہو جائے تو تیل سے نکال لیں۔ گرینڈر میں پیاز اور ٹماٹر پیس لیں۔

اب تیل میں لہسن، ادراک ڈال کر 2 منٹ بھونیں پھر دھنیا، پیاز اور ٹماٹر وغیرہ ڈال کر کچھ دیر بھونیں۔ نمک مرچ ڈال کر چکن گلنے دیں۔ جب چکن گل جائے تو ابلے ہوئے چھولے شامل کر دیں۔ مزید دس منٹ تک پکائیں اور تھوڑا سا شور بارہنے دیں۔ اب سرونگ ڈش میں ڈال کر گرم مسالا، ہرا دھنیا اور ہری مرچ سے سجا کر پیش کریں۔

☆☆.....☆☆

بادامی کر لیں۔ اس پر لہسن پیس کر ڈال دیں اور ساتھ ہی قیمہ دھو کر ڈال دیں۔ قیمے کو خوب بھونیں جب قیمے کا رنگ سرخ ہو جائے تو اس میں ہلدی، سرخ مرچ اور نمک ڈال دیں اور تھوڑا بھونیں اور پھر اتنا پانی ڈالیں کہ دال گل جائے اور خشک ہو جائے۔

جب پانی خشک ہو جائے تو دیکھیں کہ دال نے گھی چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہر امسال ڈال کر پانچ منٹ دم لگا دیں۔ اب اتار کر گرم مسالا چھڑک دیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

چکن چلی

اجزاء
چکن بغیر ہڈی 1/2 کلو
نمک ایک لی اسپون
کالی مرچ 1 لی اسپون
انڈا 1 عدد
کارن فلور 3 ٹیبل اسپون

(سوس کے لیے)

ٹماٹو کچپ 1 کپ
چلی ساس 2 ٹیبل اسپون
کٹا ہوا لہسن 1 لی اسپون
نمک حسب ذائقہ
کالی مرچ 1/2 چمچی
نویاسوس 3 ٹیبل اسپون
تیل 1/4 کپ

شملہ مرچ (لسبائی میں کٹی ہوئی) 2 عدد

ترکیب:

تمام اجزاء کو ملا کر چکن کو میری نیٹ کریں اور ڈیپ فرائی کر لیں۔



محمد رضوان حکیم

حکیم جی!

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل یا بانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقہ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روز اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ یعنی ان حکیم جی شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

حافظہ بڑھانے کے لیے

اور لاچار ہو جاتا ہے۔ اس کمزوری کی وجہ سے نہ صرف مریض متاثر ہوتا ہے بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے افراد یعنی والدین، اولاد، بیوی بچے اور دیگر رشتے دار بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے بعض اوقات پاگل پن کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

کمزور دماغ کے لوگ ترقی نہیں کر سکتے کیوں کہ انسان کی ترقی کا دار و مدار اعلیٰ دماغ پر ہے۔ جب انسان کی یادداشت کمزور ہو جائے تو وہ انسان بے بس



وزن	اجزاء
10 گرام	مغز بادام
10 گرام	مغز پستہ
10 گرام	مغز اخروٹ
10 گرام	مغز تربوز
10 گرام	مغز کدو
10 گرام	مغز بندقہ دانہ
10 گرام	خشخاش سیاہ
10 گرام	بالنگو
10 گرام	نیز بالہ
10 گرام	زر شک
10 گرام	اگرود
10 گرام	دکنی مرچ

نسخہ نمبر 2

وزن	اجزاء
10 گرام	چندن سفید
10 گرام	برگ گاؤزبان
10 گرام	الاجنگی بہن خورد
10 گرام	آنولہ
10 گرام	ختم خرفہ سیاہ
10 گرام	بادرنجبویہ
10 گرام	بہن سفید
10 گرام	دورنج عقری
10 گرام	گل عشنہ
10 گرام	گل سرخ
10 گرام	مغز کشنیز
10 گرام	تودری سرخ
	ترکیب:

ان تمام اجزاء کو سفوف بنا کر شہد میں ملائیں کر صبح شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں ایک ٹی اسپون۔

☆☆.....☆☆

مدارس، اسکول، یونیورسٹی کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں جو تعلیمی بوجھ سے دب کر اپنی صحت خراب کر لیتے ہیں۔ جن کی بھوک اور نیند ختم ہو جاتی ہے حافظہ کمزور، بھول کا مادہ، ذہن مرکوز نہ کر سکتا، پڑھنے والے بچوں میں ذہنی قوت کی کمی، ذہنی خرابی، ذہنی کمزوری، امتحان کا خوف وغیرہ پیدا ہو جاتا ہو تو ان حالات میں روشن دماغ بہترین نعمت لمبی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں کامیابی کے لیے توانا جسم سے کہیں زیادہ دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید دور میں دماغ کی کمزوری کی شکایت عام ہو گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم جسم کو غذا تو دیتے ہیں لیکن دماغ کا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے رطوبات زندگی کے ضائع ہو جانے سے یا اخلاقی جذبات کے دب جانے سے دماغی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور وقت سے پہلے بڑھاپا، دن بھر محنت اور چلنے پھرنے کے بعد سخت تھکاوٹ محسوس کرنا جاتے ہوئے یا نیند کی حالت میں قوت ارادی کی کمی، مطالعہ کرنے سے درد سر، پیٹھ اور کاتھوپ میں کمزوری، دماغی اعصابی، پریشان خیالی، رنج و غم کے احساس کی زیادتی، نفسیاتی ذہنی امراض دماغ میں خون کی زیادتی، بے آراہی طبیعت، اکھڑی اکھڑی سستی کا احساس، ادا اسی، بے چینی، غمگینی، خاموشی، رعبہ، غصہ کے تاثرات، کام سے عدم رغبتی اپنے آپ میں گم رہنا، بات کرنے کو دل نہ چاہنا۔ ان تمام علامات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے شعبہ ریسرچ نے ایسا قیمتی دلیلی جزی بوٹیوں کا فارمولہ تیار کیا ہے کہ جس سے انسان کا حافظہ کبھی خراب نہیں ہوتا اور انسان ہمیشہ کے لیے ایسی علامات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ آپ کوئی بھی کام کرتے ہیں قوت حافظہ اور نظر دونوں صلاحیتیں دونوں آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اسی طرح بینائی بھی کامیاب زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔



بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پچانے اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر شرم مشیر
ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلق مسائل کے حل کے ساتھ

ویکسنگ یا تھریڈنگ کرتی ہوں، لیکن ہفتہ یا چند روزہ دن بعد بال دوبارہ نکل آتے ہیں۔ بار بار اس تکلیف دہ عمل سے گزرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے سنا ہے لیزر سے بالوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ کیا ممکن ہے؟ اور یہ سہولت کہاں مل سکتی ہے؟

□: لیزر کی سہولت بڑے بیوٹی پارلرز میں دستیاب ہے ہے لیکن یہ غلط ہے کہ لیزر سے ہمیشہ کے لیے بالوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ علاج کے چھ ماہ بعد دوبارہ بال نمودار ہو جاتے ہیں۔ آپ کو لیزر کی ضرورت نہیں، آپ پلچ کر کے تھریڈنگ کریں، اس سے تکلیف کم محسوس ہوگی۔

چہرے پر بال موروٹی بھی ہوتے ہیں یا ہارمونل خرابی کی وجہ سے نکلتے ہیں۔ ایام کی کمی کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں تو اس خرابی کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔

انور جہاں۔ ملتان

☆: میرا مسئلہ موٹاپا ہے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کرتی ہوں۔ ایک روٹی دوپہر اور ایک رات میں کھاتی ہوں عمر میری بیس سال ہے۔ قد 5 فٹ 5 انچ ہے اور وزن 70 کلو ہے۔ ٹانگوں کے اوپر والا حصہ اور منہ موٹا ہوتا ہے۔ مجھے پانی بھی موٹا

پیارے قارئین اس ماہ آپ کی جانب سے بھیجے گئے ان سوالوں کے جواب دوں گا جو مسئلے کی صورت کسی ناکسی طور پر آپ کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔

آمنہ شاہ۔ اسلام آباد

☆: خرم بھائی میں جاب کرتی ہوں۔ روزانہ لپ اسٹک لگاتی ہوں لیکن کچھ عرصے سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ہونٹ سیاہ پڑتے جا رہے ہیں؟ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے ہونٹ گلابی ہو جائیں۔

□: لپ اسٹک کے مسلسل استعمال سے ہونٹ کالے ہو جاتے ہیں۔ خراب قسم کی لپ اسٹک ہو تو تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے آپ تھوڑے دن کے لیے لپ اسٹک کا استعمال بالکل چھوڑ دیں اور ہر رات کو سونے سے پہلے ہونٹوں پر زیتون کا تیل لگائیں، ہونٹ اپنی قدرتی گلابی رنگت پر آ جائیں گے۔ اگر آپ یہ معمول بنالیں کہ زیتون کے تیل کے ساتھ دو قطرہ لیموں کا عرق ملا کر ہر روز لگائیں تو ہونٹ کبھی سیاہ نہ ہوں گے۔

روبینہ۔ شیخوپورہ

☆: ڈاکٹر صاحب! میرے چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں۔ میں ان بالوں سے نجات کے لیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کرتا ہے۔ دل کرتا ہے ایک کمرے میں بند ہو جاؤں۔ بواسیر کا بھی مسئلہ ہے اور مجھے اپنے پیریڈ بھی درست نہیں لگتے ہیں۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے اور جسم موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے ایک دو طرح کی ورزش کی ہے لیکن ایک دو دن بعد میرا سارا جسم درد کرنے شروع ہو جاتا ہے کہ چلا ہی نہیں جاتا ہے اور آپ سے پوچھنا تھا کہ کیا دلیسی آملے کا مربہ اور ڈبے کا دودھ موٹا کرتا ہے؟

□: موٹاپے کا سبب تو آپ نے خود ہی بتا دیا ہے پیریڈ صحیح نہ ہونا، قبض اور موٹاپے کا اہم سبب ہیں قبض دور کرنے کے لیے ہرگز استعمال بہت مفید ہے۔ اسے باریک ٹکڑوں میں توڑ کر رکھ لیں اور کھانا کھانے کے فوراً بعد ایک دو ٹکڑے منہ میں رکھ کر چوستی رہیں یا چھوٹی ہرگز خشک کر کے باریک پیس لیں اور کسی شیشی میں بند کر کے رکھ دیں۔ اس کے ایک دو چمچ شام کو کھانے کے دو تین گھنٹے بعد پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ پانی زیادہ پیئیں کچی سبزیاں اور پھل کھائیں۔ قبض دور ہو جائے گا۔

ایک بہت آسان اور پراثر ڈائننگ لکھ رہا ہوں اس سے کافی لوگوں کا فائدہ ہوا ہے، پہلے ہفتے میں صرف دال، موی پھل اور سبزیاں کھائیں۔ دال میں کھی نہ ڈالیں، ممکن ہو تو سبزیوں کو بھی کچا یا صرف ابال کر کھائیں۔ سلاد کی صورت میں گاجر، مولی پالک، ککڑی، بند گوبھی اور ٹماٹر وغیرہ جی بھر کر کھائیں۔ صبح شام چھ اچھ کا ایک گلاس لیں۔

دوسرے ہفتے میں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ۔ اور جو آٹے کی روٹی صبح و شام کھائیں۔ آٹا تیار کرنے کے لیے پانچ کلو ثابت پننے اور ایک کلو جو کو ملا کر پسوا لیں۔ اور پورا ہفتہ استعمال کریں۔ ایک مہینے تک یہی خوراک لیں۔ ایک مہینے بعد گندم کے آٹے کی روٹی کھا سکتی ہیں لیکن ہفتے میں دو

دن پننے اور جو کے آٹے کی روٹی کھائیں وزن کم ہو جائے گا۔

ورزش کریں تو جسم میں شروع شروع درد ہوتا ہے۔ بعد میں جب جسم عادی ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ ورزش اس طرح کریں کہ پہلے دن بہت ہلکی کریں پھر آہستہ آہستہ وقفہ بڑھاتی جائیں۔ ڈبے کا دودھ اگر چکنائی کے بغیر ہو تو موٹا نہیں کرتا، آملے کا مربہ بھی وزن نہیں بڑھاتا لیکن آپ چکنائی کے بغیر چھ اچھ استعمال کریں۔

روحی۔ حیدر آباد

☆: میرے بال لمبے اور گھنے ہیں لیکن خشک، بے رونق اور کھر درے ہیں۔ آج کل بہت تیزی سے گر رہے ہیں۔ میں ہفتے میں دو دن شیمپو کرتی ہوں لیکن گرمی کی وجہ سے ہفتے میں تین دن شیمپو کرنا شروع کیا تو بالوں کا رنگ بھی خراب ہو گیا اور وہ مزید بے رونق ہو گئے۔ کوئی آسان سی ترکیب بتائیں جس پر عمل کر کے بال چمک دار اور سلکی ہو جائیں۔

□: گرمی کے موسم میں جب ہم شیمپو زیادہ کرتے ہیں تو یہ بالوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو تیل کا استعمال باقاعدگی سے کرنا چاہیے۔ رات کو سونے سے پہلے یا بال شیمپو کرنے کے دو گھنٹے پہلے بالوں میں تیل لگائیں۔ اس کے علاوہ ہر شیمپو سے پہلے بالوں میں کنڈیشننگ کریں۔ اور انڈالے کر اس میں ایک چائے کا چمچ سفید سرکہ اور گلیسرین ملا کر اچھی طرح پھینٹ کر مکس کر لیں۔ پھر اس کے بعد مکسچر کو اپنے سر پر چھٹی طرح لگائیں۔ اس کے بعد بالوں کو دھونے سے پہلے بیس منٹ کے لیے گرم پانی میں تولیہ بھگو کر سر پر لپیٹ لیں، اس سے بالوں میں چمک اور نرمی آجائے گی اور شیمپو کے مضر اثرات بھی رفع ہو جائیں گے۔

☆☆.....☆☆